

ISSN 2581-5482

سہ ماہی

ادبی نشیمن

ستمبر تا نومبر ۲۰۲۱ء

پروفیسر مولا بخش
ابوالکلام قاسمی
سید فضل امام رضوی
شمیم حنفی
مناظر عاشق
عنبر بہرائچی
خراجِ عقیدت نمبر
راحت اندوری
مولا نا رئیس الشاکری
افتخار امام
مشرف عالم ذوقی
شمیم فاطمہ
شوکت حیات
ترنم ریاض
شاہد علی
شمشاد جلیل
انجم عثمانی

قیمت: ۲۵/روپئے

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلیم احمد



دبستانِ اہلِ قلم کے زیر اہتمام طرحی مشاعرے میں مدیر ڈیلی آگ اکبر علی بلگرامی کو حسین امین اور ڈاکٹر ہارون رشید کو حفیظ نعمانی ایوارڈ سے سرفراز کئے جانے کا ایک منظر



پروفیسر فضل امام رضوی کی یاد میں فضل ادب اکیڈمی کی تشکیل کے دوران منعقد پروگرام کی تصویر

ستمبر تا نومبر ۲۰۲۱ء
ISSN 2581-5482
جلد : ۴
شمارہ : ۴

سہ ماہی ادبی نشیمن

ایڈیٹر
ڈاکٹر سلیم احمد

Mob: 8707260591, 9415693119
saleemahmad110@gmail.com

ادبی مشیر
رفعت عزمی

Mob: 9451818310
rafatsafavi@gmail.com

مجلس ادارت

ڈاکٹر غلام حسین (اجین)　　ڈاکٹر رضی الرحمٰن (گورکھپور)
ڈاکٹر شکیل احمد (مئو)　　ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی
وصی اللہ حسینی (لکھنؤ)

تزئین کار : عبدالسمیع قاسمی

ادبی نشیمن میں شائع ہونے والے تمام مشمولات میں جن خیالات کا ظہار کیا جاتا ہے اس کی ساری ذمہ داری مصنف کی ہوگی۔
ادارے کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔

ADBEE NASHEMAN

Email
adbee Nasheman@gmail.com

قیمت

فی شمارہ	:	۲۵ روپے
دوسالہ ممبرشپ مع رجسٹرڈ ڈاک	:	۳۰۰ روپے
بیرونی ممالک (ہوائی جہاز ڈاک)	:	$15 (امریکی ڈالر)
لائف ٹائم ممبرشپ	:	پانچ ہزار روپے
لائبریری/ادارہ کے لئے	:	۶۵ روپے فی شمارہ

ترسیل زر (منی آرڈر) کا پتہ
سہ ماہی ادبی نشیمن
168/C-544 الماس باغ، ہردوئی روڈ، لکھنؤ

Bank Detail

Name : Adbee Nasheman
Bank : Indian Bank, Lucknow
Branch : Balaganj
A/c No : 50489096237
IFSC : IDIB000L558

Address

Editor Urdu Quarterly
ADBEE NASHEMAN
544-C/168,Almasbagh
Hardoi Road, Lucknow-03

پرنٹر، پبلشر اور پروپرائٹر احمد رشیق نے نعمانی پرنٹنگ پریس، بارودخانہ، گولہ گنج لکھنؤ سے چھپوا کر 168/544-e، الماس باغ ہردوئی روڈ، لکھنؤ سے شائع کیا۔
ایڈیٹر: ڈاکٹر سلیم احمد

فہرست عنوانات

۱	حمد باری ونعت	اکبرالہ آبادی انورضیاء	۳
۲	**اداریہ**	ایڈیٹر	۴
۳	سید فضل امام رضوی۔مشرق ومغرب کا سنگم	پروفیسر علی حمد فاطمی	۵
۴	شمیم حنفی:نقشِ تہذیبِ معانی	کوثر مظہری	۱۰
۵	میں اور کتنے ستاروں کو ڈوبتا دیکھوں (افتخار امام صدیقی)	حقانی القاسمی	۲۰
۶	افتخارِ صحافت نہ رہا	نیاز سلطان پوری	۲۵
۷	پروفیسر مولا بخش	ڈاکٹر مشتاق صدف	۲۸
۸	مکتبہ جامعہ شاہد علی خاں لمیٹڈ	پروفیسر خالد محمود	۳۵
۹	ابوالکلام قاسمی۔ماضی تا امروز	ڈاکٹر رؤف خیر	۴۱
۱۰	مناظر عاشق ہرگانوی	ڈاکٹر امام اعظم	۴۴
۱۱	عنبر بہرائچی کا تخلیقی شعور غزل کے آئینے میں	خلیل احسن	۵۲
۱۲	اپنے حصے کا کام کر گئے عنبر بہرائچی	رضوان فاروقی	۵۷
۱۳	آہ مولانا رئیس الشاکری	رفعت عزمی	۵۹
۱۴	راحت اندوری	ڈاکٹر عبدالحی	۶۱
۱۵	تبسم فاطمہ اور شمشاد جلیل الوداع	ڈاکٹر نگار عظیم	۶۵
۱۶	لے سانس بھی آہستہ۔ایک تجزیہ	ڈاکٹر انوار الحق	۶۷
۱۷	ترنم کی ریاضت اور معرفت	ڈاکٹر عشرت ناہید	۷۴
۱۸	شوکت حیات۔اردو کا درۂ نایاب فکشن نگار	ڈاکٹر صالحہ صدیقی	۸۰
۱۹	مشرف عالم ذوقی کی ناول مردہ خانہ میں عورت	ممتاز عالم رضوی	۸۴
۲۰	انسانی عظمتوں کو چھوتا ہوا فنکار۔انجم عثمانی	سیفی سرونجی	۹۷
۲۱	(نظم) لاک ڈاؤن رباعیات	نہال جالبؔ ڈاکٹر عبدالحق امام	۱۰۰
۲۲	تسلی (نظم)	مصداق اعظمی	۱۰۱
۲۳	سوزِ یادِ رفتگاں (نظم)	سعیدؔ گورکھپوری	۱۰۲
۲۴	جہانِ نو کی نوید ! (افسانہ)	رینو بہل	۱۰۳
۲۵	تبصرہ ــــ دبستانِ خیرآباد	ڈاکٹر سلیم احمد	۱۱۱
۲۶	سائنٹفک سوسائٹی پبلک لائبریری	اشتہار ــــ گذارش	۱۱۲

حمدِ باری

اکبرالہ آبادی

خداکا نام روشن ہے خدا کا نام پیارا ہے
دلوں کو اس سے قوت ہے زبانوں کو سہارا ہے

خدا ہی ہے زمین وآسمان کا خالق ومالک
اسی کی قدرت وصنعت نے عالم کو سنوارا ہے

تماشا اس کی قدرت کا ہے برّ و بحر میں ہر دم
اِدھر موجیں ہوا کی ہیں اُدھر پانی کا دھارا ہے

اُسی کے حکم سے ہے رات دن کی یہ کمی بیشی
اُسی کے حکم کے تابع فلک پر ہر ستارا ہے

اُسی کے حکم سے پھل اور غلے کی ہے پیدائش
زمیں پر بدلیوں سے اس نے پانی کو اتارا ہے

اُسی کے انتظام وحکم سے موسم بدلتے ہیں
وہی ہے وقت پر جس نے ہواؤں کو اُبھارا ہے

زمیں پر سبزۂ گل کی نمودیں کیسی پیاری ہیں
فلک پر چاندو سورج کا بھی دل کش نظارہ ہے

کوئی ذرہ نہیں عالم میں اس کے علم سے باہر
جو مرضی اس کی ہے دخل اسمیں دے یہ کس کو یارا ہے

دوروزہ زندگی ہے جاہ وحشمت پر نہ ہو غافل
یہاں اب فریدوں ہے ، سکندر ہے ، نہ دارا ہے

کرو طاعت خدا کی بس وہی معبودِ برحق ہے
اُسی کی شانِ یکتائی جہاں میں آشکار اہے

اگر اعمال اچھے ہیں تو پاؤگے بڑے درجے
سمجھے لو امتحاں اس دارِ فانی میں تمھار اہے

جون تا اگست ۲۰۲۱ء بزرگوں کا ادب ،اللہ کا ڈر، شرم آنکھوں میں
انہیں اوصاف کی نسبت مذاہب میں اشارہ ہے

نعت

انور ضیاء عسکر گنج گورکھپور

آمد صبح بہاراں سے ہوا خوش عالم
اور کی ختم اجالوں نے جہاں سے وحشت

کنگرے ٹوٹ کے کسریٰ کے گرے اس دم
جب ہوئی آپ کے آنے کی جہاں میں شہرت

غلغلہ حق کا ہوا سارے صنم ٹوٹ گئے
صحن کعبہ چلا آیا جو قرآں سیرت

سلسلہ قہر کا اس واسطے اب ختم ہوا
آپ دنیا کے لئے آگئے بن کے رحمت

دونوں عالم کا وہ سردار ہوا در یتیم
جس کا یٰسین ،طٰہٰ سے مزین خلعت

بدر و طائف کی صعوبت بھی سہی ہنس ہنس کر
گلشن دیں کو دیا آپ نے رنگ و نکہت

نور حق فخر رسل قلزم معنی کہئے
ان کے ہر قول وعمل میں ہے سرا سر حکمت

بات یہ بیعت رضواں سے ہوئی ہے ظاہر
ان کے قدموں میں رہا کرتی تھی ہر دم نصرت

قاب و قوسین کی منزل سے گزرنے والے
مرتبہ آپ کا جانے وہی رب العزت

فتح مکہ پہ تھی دشمن کی پناہوں کو پناہ
ابر رحمت کی نوازش تھی بجاہ و حشمت

غیر ممکن کہ رہوں ان کی عطا سے محروم
جن کی ہے شان میں اتممت علیکم نعمت

بحر حق کے وہ شناور تھے جدا کیا ہوتے
پائی صدیق نے فاروق نے سب پر سبقت

تھے جو دل بند نبی حضرت عثمان و علی
ان کی نظروں میں تھی قرآن کی ایک ایک آیت

کب تیری نعمت کا ہم سے ہو تقاضہ پورا
جب تیرے ذکر کو دیتا ہے خدا خود رفعت

عشق احمد سے ملی جس کو ملی راہ صفا
ہے محمد کی اطاعت بھی خدا کی طاعت

اداریـــــــــــہ



کرونا کی دوسری لہر بے حد خوفناک طریقہ سے ملک میں داخل ہوئی اور اپنا قہر بے حد تیزی کے ساتھ بکھیرنے لگی اور پھر شروع ہوگیا مریضوں اور اموات کی طویل ہوتی فہرست کا سلسلہ۔ جیسے جیسے مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے طبی مسائل بھی کھڑے ہوتے گئے۔ اپریل کے آخر تک تو آکسیجن کی قلت سے پورے ملک میں افراتفری مچ گئی۔ عوام آکسیجن کے بغیر تڑپ تڑپ کر مرتے رہے اور لوگ اپنے عزیز و اقارب، ماں باپ، بھائی بہن کو اپنی آنکھوں کے سامنے آکسیجن نہ مل پانے کی وجہ سے مرتے ہوئے دیکھتے رہے مگر وہ بے بس اور مجبور تھے۔ ملک کا تیسرا اور چوتھا ستون بے حسی میں مبتلا رہا۔ ایسے میں ملک کے پہلے ستون کو یہ کہنا پڑا کہ ''حکومت چاہے بھیک مانگے لیکن ریاستوں کی آکسیجن کی طلب کو پورا کرے۔'' تب تک انسانی جانوں کے سوداگروں کا کھیل بھی شروع ہو گیا تھا۔ آکسیجن اور انجیکشن کی بڑے پیمانے پر کالا بازاری اور نرسنگ ہومس کی قزاقی نے متوسط طبقہ کے عوام کی کمر توڑ دی۔ بہر حال اس دوسری لہر سے اردو کو جو جانی اور ادبی نقصان ہوا وہ اردو ادب کی تاریخ میں اب تک کا سب سے بدترین دور تھا۔ ایک کے بعد ایک اردو ادب کی عظیم شخصیتوں کا اتنی بڑی تعداد میں دنیا سے رخصت ہونا یقیناً تاریخ ادب اردو کا بہت بڑا خسارہ ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی، مولا بخش، مشرف عالم ذوقی، تبسم فاطمہ، رتن سنگھ، شوکت حیات، ترنم ریاض، انجم عثمانی، افتخار امام صدیقی، عنبر بہرائچی، رئیس الشاکری، احسن اعظمی صوفی بستوی اور اخیر میں ابوالکلام قاسمی جیسی عظیم شخصیتوں کے علاوہ ایسے چھوٹے بڑے سیکڑوں نام شعراء و ادباء کے ہیں جو کرونا کے دوران اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔ ظاہری بات ہے اتنی بڑی تعداد میں ادبی شخصیتوں نے اس دنیا کو الوداع کہا کہ ان سبھی کا احاطہ کرنا اس خصوصی نمبر میں ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اس کے بعد بھی جیسے جیسے مضامین ملتے جائیں گے ان شاء اللہ شائع کیا جائے گا۔ اس سے قبل کرونا کی پہلی لہر میں پہلے ہی اردو ادب کی بہت سے عظیم شخصیتیں ہم سے جدا ہوگئیں جس میں شمس الرحمٰن فاروقی، ظفر احمد صدیقی، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر صفا حسن علی اجمل سلطانپوری، فضل امام رضوی، گلزار زتشی، راحت اندوری، پروفیسر ضیاء الرحمٰن اعظمی کی رحلت ایک مدت تک اپنی کمی کا احساس دلاتی رہیں گی۔ اس سے قبل شمس الرحمٰن فاروقی، فضل امام رضوی، ظفر احمد صدیقی پر اور راحت اندوری و گلزار زتشی پر الگ الگ گوشہ شایع کیا جا چکا ہے۔

ادبی نشیمن کا یہ شمارہ خصوصی طور پر کرونا وبا کی دوسری لہر میں دنیا کو الوداع کہنے والے شعراء، ادبا، ناول نگاروں، افسانہ نگاروں اور صحافیوں کے نام بطور خراج عقیدت معنون ہے۔

ادارے کی کوشش تھی اس شمارے میں زیادہ سے زیادہ مضامین شامل کرنے کی مگر بار بار درخواست کے بعد عین وقت پر مضامین کی عدم فراہمی، معذرت اور مضمون نگاروں کی بے توجہی کی وجہ سے کچھ ادبا و شعراء اس خراج عقیدت نمبر کے مشمولات سے محروم رہ گئے۔ باوجود اس کے مجھے امید ہے کہ آپ کو ادبی نشیمن کے دیگر خصوصی شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی پسند آئے گا۔ رسالے کی خوبیوں کو نہ سہی خامیوں سے ضرور مطلع کریں تاکہ اصلاح کی جا سکے۔

□□

ڈاکٹر سلیم احمد

پروفیسر علی احمد فاطمی

سابق صدر شعبہ اُردو الٰہ آباد یونیورسٹی۔ الٰہ آباد

سید فضل امام رضوی۔ مشرق و مغرب کا سنگم

پروفیسر سید فضل امام رضوی ہر اعتبار سے مجھ سے بڑے تھے لیکن تعلقات باہمی میں جس نوعیت کی قربت و محبت تھی اس سے ہم رفیق اور دوست زیادہ ہو گئے تھے۔ میں انھیں پروفیسر محمود الٰہی کے شاگرد اور ایک محقق ناقد کی حیثیت سے کافی عرصہ قبل سے جانتا تھا لیکن ۱۹۸۶ء میں جب وہ باقاعدہ جے پور سے شعبۂ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی میں آ گئے اور ترقی کرتے ہوئے پروفیسر و صدر شعبہ ہوئے نیز انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہوئے تو میں نے ان کو اور قریب سے جانا سمجھا۔ اندازہ ہوا کہ ان کی شخصیت کئی حصوں میں تقسیم ہے۔ وہ مدرس و محقق اور مقرر تو تھے ہی، وہ ذاکر بھی تھے اور تھوڑے بہت سیاست داں بھی۔ جس کے سلسلے الٰہ آباد یونیورسٹی اساتذہ کی انجمن کے صدر سے لے کر سکینڈری ایجوکیشن کمیشن کی چیرمین شپ تک پھیلے ہوئے تھے۔ غرضکہ مذہب، ادب، سیاست تینوں میں کم و بیش عمل دخل رکھتے تھے۔ یہ ان کی ہمہ جہت اور پہلو دار شخصیت کی خوبیاں ہو سکتی ہیں لیکن میں ذاتی طور پر اسے کمزوری اس لئے مانتا ہوں کہ مہارتوں کے اس دور میں ایک انسان اگر کئی خانوں میں تقسیم ہے تو کسی ایک شعبہ کی مہارت اور پختگی کے کمزور ہو جانے کے خطرے بڑھ جاتے ہیں۔ تاہم میری ترجیحات و مشاہدات کے مطابق وہ ادب و زبان کے آدمی پہلے تھے باقی بعد میں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مذہب ان کے یہاں دوسرے نمبر پر تھا، ان کی ذاتی زندگی میں مذہب کو جو حیثیت حاصل تھی وہ تو ادب کو بھی حاصل نہ تھی لیکن خارجی و سماجی زندگی میں وہ پہلے مدرس تھے، محقق تھے، ناقد تھے، باقی سب بعد میں۔ خیر!

فضل امام رضوی نے پروفیسر محمود الٰہی کی نگرانی میں امیر اللہ تسلیم کی حیات و شاعری پر پی ایچ ڈی ضرور کیا ہے لیکن جو کتابیں بعد کے دَور میں آئیں ان میں انیسؔ، اقبالؔ، جوشؔ وہ اہم شعراء جن پر ان کی ایک نہیں کئی کتابیں آئیں لیکن انیسؔ و اقبالؔ کے محاسبے میں کہیں نہ کہیں ان کی عقیدت و جذباتیت شاملِ تنقید ہو جاتی جس سے معروضیت و حقیقت بہر حال متأثر ہو جاتی۔ اقبالؔ پر ماہنامہ شاعر دسمبر ۲۰۱۸ء میں بھی راقم الحروف کی تخلیقات کو مناسب جگہ ملی۔

توسیع اشاعت کے ساتھ ہی ساتھ مکتبہ قصر الادب کے وقتاً فوقتاً کئی گراں قدر نمبر بھی شائع کئے جن میں اقبالؔ نمبر، اُردو ادب کا عالمی منظر نامہ، ایک شمارہ اُردو ادب عالیہ کے نام، عالمی اُردو، قلمکار خواتین کا ادب حصہ ۱ و ۲ ضمیمہ نمبر ۱، ایک شمارہ ادب اسلامی ہند (مہاراشٹر) کے نام بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

اقبالؔ پر ہی لکھی ہوئی ایک کتاب (علامہ اقبالؔ کی اساسِ فکر) کے بارے میں ممتاز ترقی پسند ناقد سید محمد عقیل نے ایک مضمون میں لکھا:

''ایسی عبارت سے عقیدے اور آستھا کی باتیں تو ہوسکتی ہیں مگر ادبی تنقید میں یہ کارآمد نہیں ہوسکیں گی۔ ترقی پسند تنقید ادبی توجیہات اور تعقّلی Clearning صورتوں کے ساتھ ہی چل سکے گی۔''

(ترقی پسند تنقید کی تاریخ)

تاہم عقیل صاحب نے فضل امام کا شمار ترقی پسند نقادوں میں کیا ہے اور اپنی کتاب ''ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ'' میں ان کا ذکر بھی کیا ہے۔

فضل امام جب تک جے پور میں رہے ان کا مزاج تحقیقی اور مشرقی زیادہ رہا، یہ فطری تھا اس لئے کہ فضل امام املاً مدرسہ، عربی، فارسی کے راستوں سے ہوکر آئے تھے۔ مشرقی انتقادیات زیادہ پیشِ نظر تھی اس سلسلے میں ان کی کتاب ''مشرقی تنقید'' اپنی اہمیت تو رکھتی ہے اور غالباً نظریات کے اسی سیاق وسباق میں انھوں نے تسلیم۔ انیس وغیرہ کا جائزہ بھی لیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس جائزہ میں تحقیقی مشرقیت زیادہ ہے اور تنقیدی مغربیت کم۔ لیکن جب وہ الٰہ آباد آئے تو پورے الٰہ آباد سے بالعموم اور ترقی پسند نقاد سید محمد عقیل سے بالخصوص ہمہ وقت کا رابطہ ہوا اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے رشتہ۔ ہندی دوستوں سے بھی رابطے بڑھے تو یقیناً ان کے فکر ونظر میں تبدیلی آئی۔ ان کے ذہن نے روایتی مشرقیت سے نکل کر ترقی پسند معروضیت کا سفر طے کیا۔ احتشام حسین، محمد حسین، سید محمد عقیل وغیرہ کے ادب کو پڑھا ورنہ وہ ابھی تک محمود الٰہی، احمر لاری، سلام سندیلوی وغیرہ سے آگے نہ نکل سکے تھے اور یہ سب کے سب محقق زیادہ تھے ناقد کم۔ اور ترقی پسند حضرات ناقد زیادہ تھے محقق کم۔ شاید اسی جذبہ کے تحت جب وہ صدر شعبۂ اُردو الٰہ آباد یونیورسٹی ہوئے تو سال ڈیڑھ سال کی مدت میں ہی انھوں نے احتشام حسین پر بڑا سیمینار کیا جس کے اہتمام میں ہم

> فضل امام جب تک جے پور میں رہے ان کا مزاج تحقیقی اور مشرقی زیادہ رہا، یہ فطری تھا اس لئے کہ فضل امام املاً مدرسہ، عربی، فارسی کے راستوں سے ہوکر آئے تھے۔ مشرقی انتقادیات زیادہ پیشِ نظر تھی اس سلسلے میں ان کی کتاب ''مشرقی تنقید'' اپنی اہمیت تو رکھتی ہے اور غالباً نظریات کے اسی سیاق وسباق میں انھوں نے تسلیم۔ انیس وغیرہ کا جائزہ بھی لیا ہے۔

سب پیش پیش تھے۔ انھوں نے کئی مضامین بھی احتشام حسین پر لکھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستگی بھی کہیں نہ کہیں اثر انداز ہوئی۔ ہم اکثر علمی وادبی موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے اور اختلاف بھی کرتے۔ اگرچہ ان میں اپنے سے مختلف باتیں سننے کا مادہ دیگر ترقی پسند ادیبوں کے مقابلے کم تھا، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ شیعی مجلسوں کے ذاکر بھی تھے اور ذاکر کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ وہ ذکر کرنا پسند کرتا ہے، دوسروں کی سننے میں یقین نہیں رکھتا ہے، اختلافی باتیں تو بالکل ہی نہیں۔ لیکن ہم نے انھیں اس کا بھی عادی بنایا اور بار بار احساس دلایا کہ آپ جے پور یا اعظم گڈھ میں نہیں ہیں، الٰہ آباد میں ہیں اور الٰہ آباد کچ کلاہوں کا شہر ہے اور ساتھ میں یہ بھی کہ مجلس اور مذاکرے میں فرق ہوا کرتا ہے، مذاکرے میں آپ غیر منطقی باتیں کہہ کر آسانی سے نکل نہیں سکتے۔ یہی ہوا کہ اس شہر میں کئی علمی مذاکرات میں ان کے گھراؤ کے کئی واقعات ہوئے جس کا ذکر یہاں نامناسب ہی ہوگا۔

عقیل صاحب کی صحبتوں نے فکری طور پر انجمن کی سرگرمیوں اور احتشام حسین کی تحریروں نے ان کے اندر کافی بدلاؤ پیدا کئے۔ اب وہ شعر وادب کی تفہیم کے لئے مشرقی اقدار سے زیادہ مغربی افکار نیز سماجی اقدار پر یقین نہ صرف کرنے لگے بلکہ ان کی تحریریں بھی اسی کے آس پاس دکھائی دینے لگیں۔

اس مختصر سے مقالہ میں، میں اس وقت فضل امام رضوی کی ایک اہم کتاب ''اَمعانِ نظر'' پر گفتگو کروں گا۔ نام رکھنے میں بھی انھوں نے عربی کا گاڑھا لفظ استعمال کیا ہے اور امعان کو زبر سے لکھا ہے جب کہ کئی لغات میں یہ لفظ زیر سے لکھا ہے یعنی اِمعانِ نظر یعنی گہری نظر۔ خیر ہمارے لئے نظر ہی کام کی چیز ہے اس لئے کہ نظر سے ہی نظریہ بنتا ہے اور نظریہ ہی بعد میں نظریۂ ادب اور نظریۂ

حیات کی شکل اختیار کرتا ہے۔اقبالؔ نے کہا تھا ؎

خرد کے پاس خبر سے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

الٰہ آباد اور انجمن کا اثر دیکھئے کہ اس کتاب کا پہلا ہی مضمون اکبر الٰہ آبادی پر ہے۔ایک مضمون پریم چند پر ہے اور ایک مضمون جوش پر ۔لیکن مجروح ،اختر وغیرہ پر ایک ایک مضمون ہے اور احتشام حسین وسجاد ظہیر پر دو،دو مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔ایک ایک مضمون کبیر، میر اور دبیر پر بھی ہے۔ ملاحظہ کیجئے ان مضامین کے عنوانات کو زیادہ تر ترقی پسند موضوعات ہیں یا کلاسک ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ''حرفے چند'' کے عنوان سے غیر ضروری طور پر لاتشکیل، مابعد جدیدیت ،نئی تاریخیت وغیرہ پر لعن طعن کرتے ہیں، پھر ایک جگہ یہ بھی لکھتے ہیں:

''میں مغربی نظریات اور انتقادی کاوشوں کا منکر نہیں لیکن جوں کا توں بغیر تفہیم وتعبیر کے ترجمہ اور وہ بھی لفظ بہ لفظ پیش کر دینے کو نظریہ سازی بھی نہیں سمجھتا بلکہ ایک طرح سے اردو داں طبقہ کو گمراہ کرنا قرار دیتا ہوں۔''

چلئے تھوڑی دیر کے لئے فضل امام کی باتوں پر یقین بھی کر لیا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ خود فضل امام کی نظریہ سازی کیا ہے اور ان کے نزدیک ادب وتنقید کا راست وصالح نظریہ کیا ہوسکتا ہے یا ہونا چاہئے۔میرا خیال ہے کہ اس کتاب میں اور شاید کسی کتاب میں اصولِ نقد یا نظریۂ ادب وتنقید سے متعلق ان کا کوئی گراں قدر مضمون پڑھنے کو نہیں ملتا۔ یہ اتفاق ہوسکتا ہے یا پھر میری اطلاع بھی غلط ہوسکتی ہے۔کم از کم اس کتاب میں ایسا کوئی مضمون نہیں ہے جو اُن کے اصولوں کو واضح کر سکے۔ البتہ حرفے چند کے آخر میں ایک جملہ پڑھنے کو ضرور ملتا ہے جس سے غلط فہمی ہوسکتی ہے، اور وہ یہ ہے:

مصنف کا خیال ہے کہ اکبر نے اُس دور میں بھی مشرقی اقدار کی حمایت وپاسداری کی جب مغربی انقلاب کی آندھی چل رہی تھی اور سب اسی میں بہے جارہے تھے حتیٰ کہ سرسید اور حالی بھی مگر اکبر بقولِ مصنف ''مگر اکبر بہرحال مشرقی تہذیب وتمدن اور روایات کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔''جس کی وجہ سے اکبر کو رجعت پسند کہا گیا، قدامت پرست کہا گیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے،اکبر مستقبل شناس تھے، دوراندیش تھے،انگریزی زبان وادب کے بھی مخالف نہیں تھے لیکن ان سب کے حصول میں ہم اپنا سب گنوا بیٹھیں اس کے وہ خلاف تھے۔

''یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے جن میں شعری اور ادبی تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔امید ہے کہ نئے ذہنوں کو مشرقی تنقید کے ابعاد سے روشناس کرانے میں مفید ہوں گے۔''

یعنی ترقی پسند شاعروں کو مشرقی تنقید کے ابعادی تناظر میں جانچا پرکھا گیا ہے۔اب یہ فیصلہ ان کے مضامین ہی کریں گے کہ ان میں مشرق کتنا ہے اور نقد کتنا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ پہلا مضمون اکبر الٰہ آبادی پر ہے جن کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ اکبر نے اُس دور میں بھی مشرقی اقدار کی حمایت وپاسداری کی جب مغربی انقلاب کی آندھی چل رہی تھی اور سب اسی میں بہے جارہے تھے حتیٰ کہ سرسید اور حالی بھی مگر اکبر بقولِ مصنف ''مگر اکبر بہرحال مشرقی تہذیب وتمدن اور روایات کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔''جس کی وجہ سے اکبر کو رجعت پسند کہا گیا، قدامت پرست کہا گیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے،اکبر مستقبل شناس تھے، دوراندیش تھے،انگریزی زبان وادب کے بھی مخالف نہیں تھے لیکن ان سب کے حصول میں ہم اپنا سب گنوا بیٹھیں اس کے وہ خلاف تھے مصنف نے کہا ؎

''اکبر کسی تحریک کے نمائندے نہیں تھے بلکہ عام ہندوستانی زندگی کے تحفظ میں یقین رکھتے ہیں اور ایشیا کے خرقۂ دیرینہ کو پاش پاش کرتے ہوئے دیکھ کر کفِ افسوس ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔''

وہ مثالیں بھی پیش کرتے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں ؎

'' اکبر کسی طرح مغربی تعلیم اور نئی تہذیب کے مثبت پہلوؤں کے مخالف نہیں تھے ،وہ بے عملی ، تنگ نظری اور جہالت کے مخالف تھے، وہ سرسید اور علی گڈھ تحریک کے بھی مخالف نہیں تھے لیکن اس کے زیر اثر مغربیت سے

مرعوبیت کے وہ شدید مخالف تھے۔''

پھر اس نکتہ کو مزید واضح کرنے میں مضمون ختم ہوجاتا ہے۔ مصنف نے ایک نکتہ یہ بھی نکالا کہ اکبر مشرق کی خامیوں پر بھی طنز کرتے ہیں اور مضمون ان جملوں پر ختم ہوتا ہے۔

''اکبر مشرق کے دلدادہ تھے لیکن مشرق کی خامیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے تھے بلکہ ایک غیر جانبدار مبصر کی طرح سے بھرپور تبصرہ کرتے تھے۔ یہی بے لوث انداز ان کی شاعری کی روح بھی ہے اور کامیابی کی دلیل بھی۔''

''مطالعۂ میر کی قدر و قیمت'' کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے۔ ''اس کی شاعری سہلِ ممتنع ہونے کے باوجود بہت پیچیدہ ہے۔'' کوئی چاہے تو لفظ پیچیدہ پر اعتراض کرسکتا ہے کہ شاعری میں پیچیدگی کبھی اچھی چیز نہیں سمجھی گئی، گہرائی اچھی چیز ہوا کرتی ہے۔ ''ایک خیال یہ بھی ہے کہ تفہیم میرؔ آج بھی تشنہ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بات سچ ہو لیکن یہ تشنگی کیا ہے اور بقولِ شاعر ''مدعا کچھ اور ہے'' کیا ہے اس پر روشنی نہیں پڑتی اور مضمون تشنہ رہ جاتا ہے، تاہم کچھ معنیٰ خیز اشارے ضرور ملتے ہیں، وہ بھی اشعار کے حوالے سے، اس سے تدریسی رُخ تو بنتا ہے لیکن تنقیدی کم، اور یہی وہ مشرقی اقدارِ نقد ہیں جن کی طرف ابتداءً اشارے کئے گئے ہیں لیکن یہ حدیں ٹوٹتی ہیں جب وہ کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری اور اختر شیرانی پر قلم اُٹھاتے ہیں۔ یہ تینوں ترقی پسند شاعر ہیں اور ترقی پسند شاعر کے یہاں مزاحمت و احتجاج زیادہ نظر آتے ہیں۔ افضل امام نے کیفی پر مضمون لکھتے ہوئے احتجاج کی جو تعریف کی ہے وہ قابلِ غور ہے۔ لکھتے ہیں:

''احتجاج کوئی تحریک نہیں بلکہ ایک جذبہ ہے جو بیک وقت انسانی زندگی کی مختلف کیفیات کی آئینہ داری کرتا ہے۔ لفظ احتجاج کے لغوی اور اصطلاحی معنوں میں قدرے اختلاف ہے لیکن احتجاج کا تصور جذباتی اور عملی سطح پر ہمیں ہر لمحۂ حیات میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ دنیا کے سبھی ادب میں احتجاج کا انداز و معیار موجود ہے۔ احتجاج فکر سے زیادہ جذبہ سے متعلق ہے شعر و ادب کو جذبہ سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔''

''احتجاج کوئی تحریک نہیں بلکہ ایک جذبہ ہے جو بیک وقت انسانی زندگی کی مختلف کیفیات کی آئینہ داری کرتا ہے۔ لفظ احتجاج کے لغوی اور اصطلاحی معنوں میں قدرے اختلاف ہے لیکن احتجاج کا تصور جذباتی اور عملی سطح پر ہمیں ہر لمحۂ حیات میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ دنیا کے سبھی ادب میں احتجاج کا انداز و معیار موجود ہے۔ احتجاج فکر سے زیادہ جذبہ سے متعلق ہے شعر و ادب کو جذبہ سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔''

ان مضامین میں فضل امام کا تنقیدی اسلوب بدلا بدلا سا ملے گا۔ یہ فطری عمل ہے۔ مطالعۂ میرؔ اور مطالعۂ کیفیؔ و مجروحؔ میں یہی فرق ہے۔ جب بھی شاعری ذات سے نکل کر سماج سے وابستہ ہوگی، غزل سے نکل کر نظم میں داخل ہوگی کساؤ کے بجائے پھیلاؤ میں تبدیل ہوگی اور لہجہ، نظام سبھی کچھ بدلے گا اور پھر فضل امام کا یہ نظریہ ''عہد سماج، ماحول سے کٹ کر شعر و ادب کی تخلیق ممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔''

اور یہ بھی:

''جب سماج اور سماج کے افراد کے لئے شعر و ادب کی تخلیق ہوگی یہ خطابیہ انداز لازمی طور پر ہوگا۔''

فضل امام کا یہ رویّہ اس وقت نظریہ بن جاتا ہے جب وہ احتشام حسین اور سجاد ظہیر پر مضامین لکھتے ہیں۔ دو مثالیں دیکھئے:

''فنکار یا ادیب اور نقاد کے اظہارِ حقیقت کے انداز میں اختلاف نہیں ہے، صرف طرزِ ادا میں فرق نمایاں ہوجاتا ہے لیکن جب دونوں حقیقت کا اظہار کرتے ہیں تو بنیادی طور پر نظریہ اور تخلیقی عمل کی تفریق از خود ختم ہوجاتی ہے۔''

(احتشام حسین کے نظریات)

''اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا ہے کہ ادب برائے زندگی دراصل ایک ایسا نظریہ ہے جس کو سماجی حقیقت نگاری سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی کی حرکت ادب سے قطع کرکے کسی ادب کی تخلیق ممکن

نہیں۔''

(سجاد ظہیر اور ذکر حافظ شیرازی)

ان ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں کا انتخاب ہی ظاہر کرتا ہے کہ فضل امام کا نظریۂ ادب کیا ہے اور تنقید کے راستے اور رویّے کیا ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ موضوع اپنا اسلوب خود لے کر آتا ہے کبھی کبھی اسلوبِ فکر بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ میر اور اکبر پر لکھتے ہیں تو ان کا انداز مختلف ہوتا ہے، بڑی حد تک مشرقی اقدار کے قریب لیکن کیفی، مجروح اور احتشام حسین و سجاد ظہیر پر لکھتے ہوئے وہ از خود فکری سطح پر تبدیل ہو جاتے ہیں۔

کبیر اور پریم چند پر لکھے گئے مضامین ایک اور فضل امام کا تعارف کراتے ہیں۔ کبیر کا مضمون تحقیق اور تدریسی نوعیت کا زیادہ ہے لیکن پریم چند کی حقیقت پسندی میں کچھ اچھے اشارے ملتے ہیں، اچھی بحث سے مضمون کا آغاز ہوتا ہے اس لئے کہ پریم چند ایک سچے اور پکے حقیقت نگار تھے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں:

''پریم چند کے افسانوی ادب کا تجزیاتی مطالعہ اُسی وقت کامیاب طور پر کیا جاسکتا ہے جب یہاں کے سماجی، معاشی، تہذیبی، تاریخی، جغرافیائی، مذہبی صورتِ حال کا علم ہو۔ اس کے بغیر پریم چند کو سمجھنا اور سمجھانا گمراہ کن ہوگا۔''

مضمون ان جملوں پر ختم ہو جاتا ہے:

''پریم چند کا پورا افسانوی ادب صداقتوں کا علمبردار ہے، حقیقتوں کی ادبی دستاویز ہے، اس لئے اس کا مطالعہ بہ غائر نظر کیا جانا ادب کی تفہیم کیلئے ازبس کہ لازمی ہے۔''

چکبست اور جوش پر لکھے گئے مضامین بھی متوجہ کرتے ہیں۔ دو چھوٹی چھوٹی مثالیں ان کی بھی ملاحظہ کیجئے:

''جوش کی زندگی کے سبھی پہلوؤں کو کھلے ذہن اور دماغ سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کریں

''پریم چند کے افسانوی ادب کا تجزیاتی مطالعہ اُسی وقت کامیاب طور پر کیا جاسکتا ہے جب یہاں کے سماجی، معاشی، تہذیبی، تاریخی، جغرافیائی، مذہبی صورتِ حال کا علم ہو۔ اسکے بغیر پریم چند کو سمجھنا اور سمجھانا گمراہ کن ہوگا۔''

''پریم چند کا پورا افسانوی ادب صداقتوں کا علمبردار ہے، حقیقتوں کی ادبی دستاویز ہے، اس لئے اس کا مطالعہ بہ غائر نظر کیا جانا ادب کی تفہیم کیلئے ازبس کہ لازمی ہے۔''

کیونکہ زندگی کے مطالعہ اور شخصیت کی پرکھ کے لئے کوئی میکانیکی محل مفید نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے فطرت اور جذباتی تقاضوں کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے اور جوش کی شخصیت فطری وجذباتی تقاضوں کی حسین جولان گاہ ہے۔''

(جوش کا عقیدۂ مذہب)

''چکبست نے شعوری طور پر منظر کشی نہیں کی ہے بلکہ ایک فطری پن ہے، فطرت ہمشہ ہمدردی کا خزانہ لٹاتی رہتی ہے وہ اپنے حسین مناظر بکھیرتی رہتی ہے جس کا تعلق ذہن، جذبہ اور روح سے ہوتا ہے اور چکبست نے ذہن، جذبہ اور روح کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔''

(چکبست کی منظر نگاری)

مضامین اور بھی ہیں۔ ان سبھی میں ملا جُلا تنقیدی اثر ملے گا۔ یہ سارے کے سارے مضامین اپنے اپنے موضوع کے ساتھ انصاف تو کرتے ہیں اور اچھا تعارف و تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ ترقی پسند افکار و اقدار کو بھی ظاہر کرتے ہیں لیکن کہیں نہ کہیں مشرقی اقدار سے الگ بھی نہیں ہوتے۔ یہ کوئی عیب نہیں کہ نقاد کا بھی اپنا ایک انفرادی تنقیدی و تفکیری عمل ہو رہا ہے۔ دوم یہ کہ ان مضامین میں اکثر و بیشتر مفکر کم مدرس زیادہ بولتا نظر آتا ہے۔ اس میں بھی کوئی برائی نہیں ہے لیکن یہ بھی سمجھتے چلنا چاہئے کہ توضیحات اور توجیہات میں کچھ فرق تو ہوتا ہی ہے۔ تخیل اور تفکر میں بھی فرق ہوتا ہے۔ جہاں یہ سب کے سب آپس میں مل جاتے ہیں۔ ذکر حافظ جیسا عمدہ مضمون ہو جاتا ہے۔ جوش، جو ہر پر لکھے گئے مضامین عمدہ ہیں۔ اگر کسی ایک کتاب میں چند مضامین اچھے ہیں اور چند کم اچھے ہیں تو تصنیف اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ فضل امام کی یہ کتاب بہر حال دعوتِ فکر دیتی ہے اور امعانِ نظر کی پہچان بھی کراتی ہے۔

کوثر مظہری
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Cell.: 9818718524

شمیم حنفی: نقشِ تہذیبِ معانی

1984 میں علم نباتات (Botany) میں B.Sc کرنے کے بعد، بلکہ بہت دنوں بعد میں اردو کی طرف آیا۔ کچھ دنوں طرح طرح کے مسابقاتی امتحانات دیتا رہا۔ پھر کسی جھونک میں اردو آنرز کر کے پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کرلیا۔ ایم اے کے دوران ہی یو جی سی فیلوشپ کا اکزام پاس کیا۔ ریزلٹ آنے کے بعد Ph.D کا ارادہ ہوا تو میں نے سیدھا من بنالیا کہ اب دہلی کا رخ کیا جائے۔ پٹنہ میں کچھ احباب سے مشورے ہوئے۔ بیشتر نے کہا کہ اگر ممکن ہو تو پروفیسر شمیم حنفی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کیجیے۔ خود میرے لیے بھی شمیم صاحب کا نام سرفہرست تھا لیکن سوال یہ ہے کہ دہلی میں کون میری مدد کرتا۔ میں ماہرِ اقبالیات اور بہار میں اردو تحریک کے سرگرم رکن پروفیسر عبدالمغنی کے پاس گیا۔ ان دنوں وہ یونیورسٹی کیمپس میں ہی تھے۔ ڈرتے ڈرتے بالکل تنہا ان کے پاس گیا تاکہ ایک سفارشی خط شمیم صاحب کے نام لکھوا سکوں۔ پہلے تو انھوں نے قدرے توقف کیا پھر قلم اور لیٹر پیڈ سنبھال لیا۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی، خط لے کر دہلی آ گیا۔ یہاں پروفیسر انور پاشا جے این یو میں پڑھانے لگے تھے۔ وہی مجھے شمیم حنفی صاحب کے گھر ذاکر باغ لے کر گئے اور میں نے انھیں خط دیا۔ پی ایچ ڈی کا موضوع بھی زیر بحث رہا۔ دو دنوں کے بعد میٹنگ ہونے والی تھی۔ صبح صبح میں پھر ان کے گھر چلا گیا۔ وہ شعبہ اردو آنے کی تیاری میں تھے۔ وہاں سے میں ان کے ساتھ ہی شعبے تک آیا۔ انھوں نے راستے میں سوال کیا کہ اگر مان لو تمھارا رجسٹریشن میرے ساتھ نہیں ہوتا ہے تو دوسرا آپشن کیا ہے؟ میرے منہ سے برجستہ نکل گیا— ''سر یہاں کے لیے میں کوئی آپشن لے کر آیا ہی نہیں ہوں، پھر تو میں بہار لوٹ جاؤں گا۔'' شعبے میں انٹرویو ہوا۔ اس وقت قرۃ العین حیدر بھی وزیٹنگ پروفیسر تھیں۔ لہٰذا، وہ بھی اس داخلے کے انٹرویو میں شریک تھیں اور انھوں نے بھی سوال کیا تھا۔ شمیم صاحب کی شفافیت کا یہ عالم کہ انھوں نے اس بورڈ کے سامنے عبدالمغنی صاحب کا مذکورہ بالا سفارشی خط رکھ دیا اور کہا کہ یہ میرے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ بغیر کسی حوالے کے بھی یہ بات کہتے تو کوئی بھی منع نہیں کرتا، لیکن انھوں نے سب کے سامنے خط رکھ کر معاملے کو بالکل واضح کر دیا۔ میرا داخلہ ہو گیا، میں بہت خوش۔ آس پاس (1993) میری شادی بھی ہو گئی تھی۔ لکھنے پڑھنے کے دوسرے کام ہوتے رہے۔ مضامین چھپتے رہے، شاعری چھپتی رہی، لیکن پی ایچ ڈی کا کام نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایک سال کے بعد میں ایک مرتبہ شمیم صاحب سے ملنے ان کے گھر گیا، تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے کہا— ''پی ایچ ڈی کرنا آپ کے بس کا نہیں۔'' میں نے کہا— 'میں کرلوں گا' پھر انھوں نے کہا— ''سوال ہی نہیں، مجھ سے غلطی ہوئی۔ عبدالمغنی صاحب کی سفارش تھی، اس لیے میں نے آپ کو اپنے ساتھ رکھ لیا۔ دیکھیے آئندہ یہاں تشریف لانے کی زحمت نہ کیجیے۔'' مجھ پر تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ سر جھکائے تھوڑی دیر بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر سلام کرتا ہوا واپس آ گیا۔ لائبریری میں بیٹھ کر ایک ہفتے میں ایک باب لکھا اور جا کر انھیں دے دیا۔ دوسرے ہفتے دوسرا باب لکھا اور لے جا کر ان کے حوالے کر دیا۔

اب میں وہاں بیٹھتا نہیں تھا۔ دروازے پر ہی بس Chapter دے کر آجاتا تھا۔ اس بار انھوں نے روک لیا۔ دونوں ابواب 40,40 صفحات کے تھے۔ آگے کے ابواب اور بھی طویل ہونے والے تھے۔ انھوں نے کہا— دونوں Chapters اپنے پاس ہی رکھو، بعد میں دیکھ لوں گا۔ پھر چار پانچ برسوں تک کچھ نہ پوچھا۔ بلکہ رسالہ جامعہ کے جب وہ مدیر ہوئے تو مجھ سے مضمون لکھواتے اور اس میں شامل کرتے۔ اسی زمانے میں 1994 کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ مظہر امام کو ملا تھا۔ انھوں نے ایک دن کہا کہ تین چار دنوں میں رسالہ پریس جانے والا ہے، اگر ایک چھوٹی سی تحریر مظہر امام پر دے سکو تو دے دو، اسی شمارے میں چلا جائے۔ اسی رات چھ سات صفحے کا مضمون لکھا اور دفتر میں جا کر دے دیا، انھوں نے پسند کیا اور رسالہ جامعہ میں چھپا۔ میں نے ان کے اس نوع کے کام کو چیلنج کے طور پر قبول کیا۔ شبلی پر بھی لکھوایا۔ گاندھی جی پر خصوصی شمارہ نکالا تو میں نے گاندھی جی کی خود نوشت تلاش حق (ترجمہ: سید عابد حسین My experiments with truth) پر مضمون لکھا، مولانا آزاد پر رسالہ جامعہ کا خصوصی شمارہ (دو جلدوں پر مشتمل) شائع ہوا تو اس کے لیے بھی مجھ سے مضمون طلب کیا۔ میں نے مولانا آزاد کی تصنیف 'تذکرہ' پر ایک مضمون لکھ کر دیا۔ اندازہ ہوا کہ انھوں نے پہلے تو مجھے امتحان میں ڈالا اور پھر تربیت کی راہ پر ڈال دیا۔ غالباً انھیں بھی میرے حوالے سے کچھ اطمینان سا ہو گیا۔ اب مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ شمیم صاحب نے اپنے گھر پر مجھے کیوں ڈانٹا تھا۔ استاد کی ڈانٹ یا والدین کی ڈانٹ کبھی بھی طلبہ اور بچوں کے لیے منفی نہیں، مثبت ہوتی ہے۔ جس نے اس ڈانٹ کو ہنس کر مثبت انداز میں قبول کر لیا، اس کی کشتیِ حیات کبھی نہ کبھی ساحل سے ضرور لگ گئی ہے۔ شمیم صاحب بہت سخت گیر تھے بھی نہیں، نہایت ہی ضبط اور تحمل کے آدمی تھے لیکن جہاں ناگزیر ہوتا اپنی خفگی کا اظہار نہایت ہی شائستہ لہجے میں کرتے بھی تھے۔ یوں بھی، انسان میں اس صفت کا ہونا لازمی ہے۔ صرف محبت اور خاموشی، ضبط اور تحمل کو دینا بزدلی اور کمزوری تصور کرنے لگتی ہے۔ مجھے تو شمیم صاحب کے طرز زندگی میں غالب کے اس مصرعے کا رنگ نظر آتا تھا:

اسدؔ بزمِ تماشا میں تغافل پردہ داری ہے

(2)

فنا ہوئے تو کچھ ایسے کہ جیسے تھے ہی نہیں ہمارے بعد ہمارے نشاں ملے ہی نہیں

پروفیسر شمیم حنفی، استاذی و مربی کا مذکورہ بالا شعر ان کے شعری مجموعے 'آخری لہر کی دستک' کی آخری غزل (تین اشعار پر مشتمل) کا مطلع ہے۔ لگا تو یہی تھا کہ اچانک ایک چھتنار درخت جڑ سے کھڑ گیا ہے اور دھوپ کی تمازت یکبارگی فزوں ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی فنکار یا تخلیق کار اپنے وجود کو Reject کرتا ہے۔ یہ دنیا فانی ہے اور اس فنا پذیری کو مختلف فنون لطیفہ سے وابستہ فنکاروں نے اپنی اپنی طرح بیان کیا ہے لیکن شمیم حنفی نے جس فنا پذیر وقوعے کو دام تخلیق میں قید کیا ہے، اسے دیکھ اور سن کر سکتہ سا طاری ہو جاتا ہے۔ دنیا میں جب تک انسان ہوتا ہے، اس کے آس پاس نفوس کا ایک ہالہ سا بنا رہتا ہے لیکن فنا ہونے کے بعد امتداد زمانہ کے بعد یہ نفوس پرچھائیوں میں بدل جاتے ہیں اور پھر حیطۂ غیاب میں چلے جاتے ہیں لیکن، نہیں اس حقیقت کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ادیب اور تخلیق کار کی موت نہیں ہوتی۔ اس کی سیاہ تحریروں کے اجالے انسانی معاشرے کی تاریکیوں کو روشن کرتے رہتے ہیں۔ شمیم صاحب نے بہت سے آثار و نشانات چھوڑے ہیں۔ ان کی تحریروں میں جن متنوع تہذیبوں کا انجذاب ہوا ہے، وہ لائق توجہ ہیں۔ شمیم صاحب نے ہندوستانی تہذیبوں سے عطر کشید کیا ہے۔ اسی عطر کی خوشبو اور اسی تہذیب کی روشنی ان کی تحریروں میں جا بہ جا جگنوؤں کی طرح چمکتی ہے۔ تاریکی، شام، اندھیرا، تیرگی، روشنی، دُھند، مشعل، چادر شب، دھوپ، شفق، چاند، سورج یہ سب عوامل شمیم حنفی کی تخلیقی تہذیب کے حوالے ہیں۔ شمیم حنفی کا سراغ انہی سے لگتا ہے:

اے خدا اس مشعل گم گشتہ کو محفوظ رکھ
روشنی اس کی مرے نام و نشاں تک جائے گی

بس ایک بجھتی ہوئی روشنی کی دستک پر
دلوں سے قافلۂ تیرگی روانہ ہوا
اندھیرے دوڑ کے آئے پناہ کی خاطر ہمارے گھر کا دریچہ اگر کھلا دیکھا

شمیم حنفی نے کائنات کی دبیز پرتوں کو Penetrate بھی کیا ہے۔ اپنی تیز تخلیقی آنچ سے منجمد استعاروں اور تلمیحوں کو پگھلایا بھی ہے۔ کہیں کہیں غزلوں میں دینی جمالیات (Religious Aesthetics) کا پرتو بھی دکھائی دیتا ہے۔ پھر یہ کہ جمود اور تعطل کو ہر لحہ تحرک میں بدلتے ہوئے آگے بڑھ جانا، یہ صفت ہے شمیم صاحب کی۔ یہ اشعار دیکھیے:

اے مطلعِ ملال ہمارے لیے بھی کچھ
تاروں بھری یہ رات خزانہ اسی کا ہے

روشن ہے ابھی روح میں اک اسم محمدؐ
کیا کیا نہ کیے ہوش نے انکار عزیزو

زمیں سے آسماں تک اپنے ہونے کا تماشا ہے
یہ سارے سلسلے اک لمحۂ فانی میں رہتے ہیں

شمیم حنفی صاحب نے اپنے مجموعۂ کلام 'آخری پہر کی دستک' کے 'اختتامیہ' میں لکھا تھا:

''شاعری کی قدریں ہمیں کبھی کبھی موت کے تجربے کی ناگزیریت کے خیال میں رہائی اور نجات کا راستہ دکھا دیتی ہیں، بس! اس سے زیادہ کچھ اور نہیں۔''

... لیکن موت کے تجربے کی ناگزیریت سے یا اس کے خیال سے اگر شاعری نجات اور رہائی کا راستہ دکھا سکتی ہے، تو اسے ایک بڑا اور عظیم کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ ایسے میں تخلیق اور تخلیق کار دونوں کا سر اونچا ہو جاتا ہے۔

شمیم حنفی کی شاعری میں ایک طرح کی حزنیہ لے ملتی ہے۔ زندگی کے احوال و اشکال کو پیش کرتے ہوئے جشن و طرب کے بجائے حزن و ملال کی کارفرمائی ملتی ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے اور شمیم حنفی کی حزنیہ لے کے مختلف پہلوؤں پر غور کیجیے:

ایک دن مسمار ہو جائیں گی آوازیں تمام
ایک دن ہر بات احساس زیاں تک جائیگی

سمیٹ لے گیا ساتھ اپنے رونقیں ساری
دکھائی دیتا ہے خالی بہت خزانۂ شب

لبھاتی تھی مرے دل کو بہت افسردگی تیری
تری افسردگی بھی میرے پیکر میں چلی آئی

گھر میں بیٹھوں تو در و دیوار بیگانے لگیں
اور باہر جاؤں تو لگتی ہے دنیا اجنبی

ایک آواز سی آتی ہے عجب کانوں میں
شہر اب دیر تک آباد نہیں رہ سکتے

شاعری کے حوالے سے شمیم حنفی زیادہ سنجیدہ نہیں تھے۔ یعنی، انھوں نے اپنے لیے ادبی پناہ گاہ ادبی تنقید کو بنالیا تھا۔ حالاں کہ ان کی شاعری میں سنجیدگی اور متانت کی بے پناہ وسعتیں ہیں۔ تخلیقی نگارشات میں انھوں نے ڈراما نگاری کو بھی فروغ دیا۔ ڈراموں کے چار مجموعے منظر عام پر آئے۔ مٹی کا بلاوا، مجھے گھر یاد آتا ہے، زندگی کی طرف، بازار میں نیند، آخری مجموعے 'بازار میں نیند' کے علاوہ اوپر کے تینوں مجموعوں کے نام ہی سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے تخلیقی مزاج میں اپنی جڑوں کی طرف مراجعت کا راستہ ہے۔ اپنی تہذیب، اپنی ثقافت، اپنے گھر اور دیسی کلچر یا پھر رشتوں کی بُنت یا ٹوٹ پھوٹ کی عکاسی ان کے ڈراموں کی شناخت ہے۔

شہری زندگی اور گاؤں کی زندگی میں تصادم یا پھر نئی نسل اور پرانی نسل کی سوچ کا تصادم ان کے ڈرامے 'مٹی کا بلاوا' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک طرف ترقی ہوتی ہے اور دوسری طرف اپنی جڑوں سے کٹ کر لوگ شہروں کی طرف ہجرت کرنے لگتے ہیں جب کہ ایک نسل اپنی جڑوں سے وابستہ رہنا چاہتی ہے۔ شمیم صاحب کا ماننا ہے کہ جب تک کوئی لمحہ، واقعہ، واردات یا لفظ، میرا تجربہ نہ بنے مجھ پر اس کے معنی نہیں کھلتے۔ مکالمہ سنیے:

جاوید: آپ ہی سوچیے اس ویرانے میں آپ کیا کریں گے؟ پھر یہاں جما جمایا گھر اجڑ جائے گا۔

میر صاحب: (اداسی سے) اور وہ جو جما جمایا تھا اس کے اجڑنے کا تمھیں کوئی غم نہیں؟ تمھیں پتہ نہیں بیٹے کہ جب کوئی پرندہ ڈار سے بچھڑ جاتا ہے تو اس پر کیا گزرتی ہے۔ شام کے دھندلکے میں کسی پرندے کو ہراساں اور سرگرداں نہیں دیکھا تم نے!

جاوید: ابّی!

صاحب: (اسی رو میں) اور
اب میری زندگی کی بھی شام
ہے۔ نئی جگہ کیسی ہی آرام دہ
دل کیوں نہ ہو نیند مشکل سے
آتی ہے۔ نور پور ویرانہ سہی
لیکن وہاں رفاقت اور اپنائیت
کی وہ مہک ہواؤں میں رچی
ہوئی ہے جو سانس کے ساتھ
دلوں کو فرحت پہنچاتی ہے۔
تمھیں کیا پتہ بیٹے کہ اس
ویرانے میں آج بھی یادو
ں کے کتنے شہر آباد ہیں!

اوپر کے مکالموں میں اپنی تہذیبی جڑوں کو شمیم حنفی نے پیش کیا ہے۔ ڈراما 'مٹی کا بلاوا' پڑھتے ہوئے کہیں کہیں قاری یا اسے سنتے ہوئے سامع آبدیدہ ہوجاتا ہے۔ ان لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا جو دنیا کی صناعی اور وقتی چمک دمک کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ شمیم حنفی نے اپنے ڈراموں کے دوسرے مجموعے 'مجھے گھر یاد آتا ہے' کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''وہ چہرے جو کھو گئے، موسم جو گزر گئے، مکان جو ملبوں میں چھپ گئے اور بستیاں جو اجڑ گئیں ان کا تماشا ہر پل ساتھ ہے۔ ان کے ساتھ بہت سے رشتوں، قدروں، مفروضوں اور ایقانات کے بچھڑنے کا تجربہ بھی ہوا اور وہ کچھ، جو ان کی جگہ آج سامنے ہے، محرومیوں کے احساس کو دور نہ کرسکا۔''

یہ اقتباس پڑھ کر کوئی بھی شخص شمیم صاحب کے ادبی مزاج اور وظیفے کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ جو ادیب مکان کے ملبوں اور بستیوں کے اجڑنے کو اور رشتوں اور قدروں کے بچھڑنے کو اپنے لیے حرز جاں بنالے، اس کے ادبی تقدس پر کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ جو شخص انفرادی شعور اور اجتماعی زندگی کی کشمکش کو قرطاس ابیض پر مصور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، جو انسانی اور سماجی تاریخ و تہذیب کو اپنا تخلیقی تجربہ بنانے پر قدرت رکھتا ہو، جو 'رات، شہر اور زندگی' کی تثلیث قائم کرنے کی جسارت رکھتا ہو، جو شخص 'زندگی کی طرف' مراجعت کے لیے 'خیال کی مسافت' طے کرتا ہو، جو ادیب و نقاد جدیدیت کی فلسفیانہ اساس اور نئی شعری روایت کی تفہیم و تعبیر کے لیے ہم نفسوں کی بزم میں یا ہم سفروں کے درمیان قاری سے مکالمہ کرتا ہو یا پھر ادب کی مختلف النوع اصناف اور عظیم فنکاروں میں غالب، اقبال، منٹو اور کہانی کے پانچ رنگ کے اَن مٹ نقوش بناتا ہو، اس کی ادبی شناخت اور عظمت کا کیا کہنا!

شمیم حنفی نے اردو تنقید کو بہت کچھ دیا۔ اپنی فلسفیانہ اساس والی کتاب اور نئی شعری روایت سے نئی اردو شاعری کی تعبیر و تفہیم کے لیے نئی راہیں پیدا کیں۔ مغربی اصطلاحوں کو اردو میں پہلی بار شمیم حنفی نے ہی متعارف کرایا، یہ الگ بات ہے کہ انھوں نے کبھی اس بات کا سہرا اپنے سر نہیں باندھا نہ بندھوایا۔ ہمیشہ ان کے اندر ایک طرح کا علمی انکسار دیکھنے کو ملتا تھا۔ 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' پر اردو فکشن کے مشہور، بے محابا اور نہایت ہی باکمال نقاد جناب وارث علوی نے جس طرح سے شد و مد کے ساتھ تبصرہ کیا تھا، ایسا لگا تھا کہ اب اردو کا کوئی بھی سنجیدہ قاری 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' کا ذکر تک نہیں کرے گا۔ لیکن یہ کتاب شائع ہوتی رہی۔ پاکستان سے بھی شائع ہوئی۔ بعد کے بہت سے نقادوں نے کتابِ ہٰذا سے اکتساب فیض بھی کیا۔ روشنی بھی حاصل کی اور کبھی کبھی بغیر حوالے کے کچھ اصطلاحات اور نئی شاعری کی تفہیم کے نسخے شمیم صاحب سے مستعار بھی لیے۔ چلیے اس میں کچھ عیب بھی نہیں کہ ادب کا ارتقا بھی اسی طرح چراغ سے چراغ جلنے سے ہی ہوتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ آج اگر کسی کے مضمون یا کتاب پر ذرا بھی منفی بلکہ غیر جانبدارانہ تبصرہ کردیا جائے تو صاحب مضمون یا صاحب کتاب مدت مدید تک ناراض رہ سکتا ہے۔ میں نے بھی جب فلسفیانہ اساس پر وارث علوی کا مضمون پڑھا تو مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے سوچا کہ شمیم صاحب تو اس مضمون سے اور بھی ناراض ہوئے ہوں گے۔ ان دونوں میں بات چیت بند ہوگئی ہوگی۔ میں نے شمیم صاحب سے کبھی ذکر بھی نہیں کیا۔ ایک روز میں شمیم صاحب کے گھر پر (ذاکر باغ) بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں گھنٹی بجی۔ شمیم صاحب نے خود ہی دروازہ کھولا۔ دیکھا کہ وارث علوی صاحب کھڑے ہیں۔ اندر آئے اور صوفے پر اپنی پوری تکان لیے بیٹھ گئے۔ دم پھول رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ سیڑھیاں چڑھ کر

چوتھی منزل تک آنا اور وہ بھی ستر سال (اُس وقت) کی عمر میں، کوئی آسان نہیں تھا۔ شمیم صاحب نے کہا: آپ نے اتنی زحمت کیوں کی، میں آجاتا ملنے۔'' وارث صاحب نے کہا ''نہیں ایسا بھی کیا اور زحمت کیسی۔ تمھارا خیال آیا سوچا چل کے مل لیتا ہوں، سو آ گیا۔'' خیر چائے ناشتہ کر کے چلنے سے پہلے وارث صاحب نے سامنے ایک طشتری میں رکھے ہوئے بادام اٹھائے اور کہا— شمیم اگر تم اجازت دو تو یہ اپنی جیب میں رکھ لوں؟ راستے میں کھاتا رہوں گا۔'' شمیم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا— آپ بالکل رکھ لیجیے، آپ کا گھر ہے، اس میں تکلف کی کیا بات ہے؟— میں ہکّا بکّا دیکھ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اسی شخص نے شمیم صاحب کی کتاب پر ایسا جارحانہ مضمون لکھا ہے اور پھر آج یہ بے تکلف دوستی کا منظر؟ سچ ہے کہ بڑے لوگ بڑے ہی ہوتے ہیں۔

خیر، اس نوع کی اور بھی باتیں ہوں گی جو دوسروں کے تجربے میں آئی ہوں گی۔ جہاں تک شمیم حنفی کی تنقید کا سوال ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ انھوں نے ادب کی تعبیرات کے لیے مغربی نظریات کا سہارا کم لیا ہے۔ حالاں کہ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس کو دیکھ کر یہ بات کہی جاتی ہے کہ انھوں نے مغرب کے نظریات پر کام کیا ہے، لیکن اس پوسٹ ڈاکٹریٹ کے مقالے سے قطع نظر ان کے Applied Criticism کی بات کریں تو ایک طرح کا بُعد بھی نظر آتا ہے۔ انھوں نے ادب کی ہم عصریت (Contemporariness) کو اہمیت دی ہے۔ ان کے بقول: لیکن جدیدیت ہر اس تجربے کو اور ہر اس مظہر کو نئے انسان سے منسلک سمجھتی ہے جو اس کی شخصیت اور مسائل کے کسی پہلو ربط رکھتا ہے، خواہ تاریخی، سماجی اور عقلی اعتبار سے وہ کتنا ہی مجہول اور فرسودہ کیوں نہ سمجھا جائے۔'' (نئی شعری روایت، 2005، ص 16,17)

ادبی تجربہ کا رشتہ نئے انسان کی شخصیت یا اس کے مسئلے سے ہونا لازمی ہے۔ یہاں اس بات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ تاریخی، سماجی اور عقلی اعتبار سے اس کی مجہولیت اور فرسودگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ شمیم صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ جدیدیت کا منظر نامہ اتنا وسیع و بسیط ہے کہ متضاد عقائد و افکار اور ذہنی و جذباتی رویوں کے لیے بھی اس میں یکساں گنجائش نکل سکتی ہے اور فنی سطح پر نئی شعری جمالیات کی جہتیں اتنی کثیر ہیں کہ اظہار و بیان کی مختلف النوع ہیئتوں کو بیک وقت اس سے مربوط کیا جاسکتا ہے۔ شمیم صاحب نے نئی شعری جمالیات کی جہتوں کا ذکر کیا ہے جو لائق تحسین ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اظہار و بیان کی مختلف النوع ہیئتوں نے جدیدیت کے بہت سے ذہنوں کو گمراہ بھی کیا۔ کچھ شعرا غیر ضروری لسانی توڑ پھوڑ اور جدید لسانی تشکیلات کے چکر میں فیشن پرستی کے شکار بھی ہوئے، میں یہاں لفظیات یا شاعری میں غیر ضروری صنعت گری یا مضمون کی سطح پر فیشن پرستی کے حوالے سے مثالیں پیش نہیں کروں گا کیوں کہ مضمون جدیدیت پر نہیں بلکہ شمیم حنفی صاحب پر ہے۔ انھوں نے جدیدیت کے مالہٗ و ماعلیہ (Pros & Cons) کو جس انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، وہ زیر بحث ہے۔ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ 19ویں صدی والی جدید شاعری (آزاد اور حالی والی) اور 20ویں صدی والی ترقی پسندی کے واضح مقاصد اور نصب العین تھے لیکن جدیدیت کے پاس کوئی واضح دستور العمل نہیں ہے کہ جس سے وابستہ ہو کر نئی شاعری کا مکمل جواز پیدا ہو سکے۔ بات بھی سچ ہے کہ جدیدیت میں بہت کچھ طے نہیں تھا، لیکن کچھ نہ کچھ نیا ضرور تھا جس کی آہٹ سب نے محسوس کی۔ شمیم صاحب نے لکھا ہے کہ:

> ''آواں گارد جو مغرب میں جدیدیت کی بنیاد ہے، اس کے اثر سے جو تحریکیں فروغ پذیر ہوئیں ان میں چار اہم ترین تحریکیں یعنی (1) مکعبیت (کیوبزم) (2) ماورائے حقیقت نگاری (سرریلزم) (3) مستقبلیت (فیوچرزم) اور دادازم، ان سب کا آغاز وارتقا دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہوا اور ان چاروں تحریکوں کی الگ الگ انفرادیتو ں کے باوجود رومانیت اور اشاریت پسندی کو ان کا پیش رو سمجھا جاتا ہے۔'' (ایضاً، ص 18)

آواں گارد کے بنیادی اوصاف کا ذکر بھی کیا گیا ہے، لیکن شمیم صاحب نے یہ بات بہت ہی بنیادی اور مستحکم کہی ہے کہ:

''احساس واظہار کی ہر نوعیت اور فکر وفن کا ہر اصول و معیار اپنی پیش رو روایت سے کلیۃً لاتعلق نہیں ہوتا، نہ اس کی نمود خلا میں ہوتی ہے۔ ہر جدت کسی نہ کسی روایت سے مربوط ہوتی ہے، کبھی اس کی توسیع بن کر اور کبھی اس کی تخریب کے بعد اس کے ملبے سے تعمیر کی ایک نئی صورت کے طور پر۔'' (ایضاً، ص19)

ادب خلا میں پیدا نہیں ہوتا۔ ہر جدت کسی نہ کسی روایت سے مربوط ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ جو لوگ اپنے عہد کے ادب پارے کو ماقبل کے عہد سے کاٹ کر دیکھتے ہیں، دراصل وہ اپنے ساتھ بھی اور ادب پارے کے ساتھ بھی ناانصافی کرتے ہیں۔ بڑا فن پارہ تو وہ ہے جو اپنے کاندھے پر ماضی کے جگنوؤں کو بٹھا کر مستقبل کی تاریکی میں بھی اپنی راہ تلاش کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ سوچیے کہ کیا آج میر و غالب کے تخلیقی وجدان سے ہم اپنا رشتہ منقطع کر سکتے ہیں۔ جدیدیت سے وابستہ کوئی بھی بڑے سے بڑا افتکار کیا خود کو غالب کے فکری اجتہاد سے آگے لے جا سکا ہے؟ یا یہ کہ کیا آج کا کوئی شخص غالب کی شاعری کے اسلوب کو رد کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ صرف نئی ہیئتوں اور فیشن زدگی سے ہی فن پارہ بڑا نہیں ہو جاتا۔ اصل چیز ہے زندگی کی سچی عکاسی۔ یہی وہ بنیادی باتیں ہیں جن کی تلاش شمیم حنفی صاحب نے جدیدیت میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بودلیئر اور ملارمے سے لے کر میراجی اور راشد کا ذکر انہی آواں گارد کی بنیادی تحریکوں اور ان کے اوصاف کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ کمار پاشی، افتخار جالب، عادل منصوری، محمود ایاز، ناصر کاظمی، منیر نیازی، وحید اختر، محمد علوی، بانی، قاضی سلیم، بلراج کومل، عمیق حنفی، شکیب جلالی، سلیم الرحمٰن، زاہد ڈار، ساقی فاروقی اور بھی بہت سے دوسرے شعرا کے حوالے سے 'نئی شعری روایت' کی تقویم کی ہے۔ ان شعرا کی تخلیقیت کا جائزہ لینے کے لیے شمیم صاحب نے ایک وسیع تنقیدی تناظر خلق کیا ہے جس میں اردو میں لکھے گئے متعدد مضامین اور کتب کے ساتھ ساتھ انگریزی میں تحریر کردہ مضامین اور کتب کے حوالے دیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شمیم صاحب نے نئے شعری ادب کی تفہیم کے لیے فلسفیانہ اور تنقیدی نگارشات کو کھنگالا ہے۔ اس لیے ان کی تنقید میں زولیدہ بیانی کے بجائے ایک طرح کی اُپج اور ایک نوع کا قدرتی بہاؤ نظر آتا ہے۔

فلسفہ اگر فن پارے کی جمالیاتی قدروں کو کھولنے اور واضح کرنے میں معاون ہو تو اسے خوش آمدید کہا جانا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے، تو کتاب کی علمی وقعت اور قدر و منزلت تو ہوتی ہے لیکن ادب فہمی سے معذور ہوتی ہے۔ وارث علوی نے کچھ اسی نوع کے استدلالی نکات کی بنیاد پر شمیم حنفی کی کتاب 'جدیدیت کی فلسفیانہ اساس' پر سخت تنقید کی ہے۔ انھوں نے تو یہاں تک ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دیوندر اِسّر اور کرامت علی کرامت کی کتابوں اور مضامین میں ادبی حوالے شمیم حنفی سے کہیں زیادہ ہیں۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ شمیم حنفی جمالیات کی جنگ سماجیات کے دائرے میں لڑنے گئے ہیں اور بری طرح پٹے ہیں (بحوالہ: خندہ ہائے بیجا، 114)۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وارث علوی کی تنقیدی روش بے لاگ اور بے لوث ہے۔ شمیم صاحب کے حوالے سے لکھے گئے اس مضمون کا آخری جملہ، تمام تر منفی ردعمل اور آراء کے باوجود تحسین آمیز ہے کہ — ابھی بھی یہ سمجھتا ہوں کہ بطور نقاد کے شمیم حنفی کا قد ان کے مقالے سے بڑا ہے (خندہ ہائے بیجا، ص 148) انداز لگائیے کہ وارث علوی کا دل کیسا صاف اور شفاف ہے اور یہ بھی دیکھیے کہ شمیم حنفی نے اپنے گھر پر وارث علوی کا کس محبت سے والہانہ استقبال کیا اور تواضع کرتے رہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ دراصل یہ تخلیقات، یہ تنقیدی نگارشات اور معاصرانہ چشمکیں ہنگامی طور پر اپنا اثر رکھتی ہیں، اصل چیز ہے انسانی دردمندی اور ہمدردی۔ اس لیے کہ ہم سماجی رشتوں اور اپنوں سے بندھے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ وقت زیادہ گزارتے ہیں۔ اپنوں اور بیگانوں سے نبھاتے ہیں اور نبھاتے رہنے کی سوچتے رہتے ہیں، اس لیے بڑے لوگ ادبی کارگزاریوں سے ذاتی زندگی کو متاثر نہیں ہونے دیتے۔ یہی ہونا بھی چاہیے۔

بہرحال، شمیم حنفی ہمیشہ انسانی اوصاف میں مثبت پہلو کی تلاش میں رہے۔ انھوں نے

کام بے شک جدیدیت کی فلسفیانہ اساس پر کیا لیکن ان میں انسانی دردمندی اور بے ریا زندگی کے رموز کی پاسداری تھی۔ انھیں نظیر اکبرآبادی کی تخلیقی اساس میں اصل 'آدمی' کی مختلف جہتیں نظر آتی ہیں۔ یہاں بھی ایک سادہ دل اور بے ریا آدمی ہے جو اپنی تخلیقیت کا کیمرہ گھماتا جارہا ہے۔ شمیم صاحب نے نظیر کی نظم 'آدمی نامہ' کو ان کی مکمل شاعری کا عنوان تصور کیا ہے اور آگے لکھا ہے:

''وہ عمر بھر اس آدمی کی سرگزشت بیان کرتے رہے جو راہ و مقام کی قید سے آزاد، بے ارادہ اور بے انتخاب چاروں کھونٹ مارا مارا پھرتا رہا۔

''وہ جس قلندرانہ استغنا کے ساتھ زندگی کی نعمتوں کا اور اس کے الطاف کا ذکر کرتے ہیں، اسی فقیرانہ شان کے ساتھ اس کے دکھ درد کی روداد بھی بیان کرتے ہیں، جس استغراق کے ساتھ مظاہر کے شور میں چھپے ہوئے سنّاٹے اور حقیقت کے فریب کا حجاب اٹھاتے ہیں اسی سرمستی اور لذت کے ساتھ دنیا کی دل فریبیوں پر نظر ڈالتے ہیں۔'' (نظیر نامہ، 1979، ص442)

شمیم صاحب نے اسی مضمون میں لکھا ہے کہ نظیر نے بڑی خاموشی اور آہستگی کے ساتھ خیال اور مادّے کا فرق مٹا دیا۔ پہلے اقتباس میں جو باتیں کی گئی ہیں، خیال اور مادّے والی بات اس سے یکسر الگ ہے۔ بظاہر یہ (خیال اور مادّے والی بات) ایک بیان ہے، لیکن شمیم صاحب کے گہرے مطالعے اور ان کی اپنی عمیق تخلیقی حسیت کے سبب نظیر کے تئیں یہ رائے سامنے آئی ہے۔ آخر میں نظیر کے یہاں جس افسردگی کے نشانات ہیں، ان کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ یہ افسردگی نتیجہ ہے: ''ہر تماشے کے انجام سے باخبری کا۔ سوچنا چاہیے کہ یہ دنیا جو تماشا گاہ ہے کہ ہم سب اس کے انجام سے باخبر ہیں۔''

شمیم حنفی کی تخلیقی حسیت میں ایک طرح کی افسردگی ہوتی ہے، اس لیے شعورِ ذات اور شعورِ کائنات کے مابین جب ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور اُس سے جو ہیولہ تیار ہوتا ہے اس پر بھی ایک طرح کی افسردگی اور ملال کی ردا ہوتی ہے۔ اسی لیے اس نوع کی تحریروں سے شمیم صاحب کی ذہنی ہم آہنگی ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے ڈراموں اور کالمز (Columns) میں بھی اس کیفیت کے آثار ملتے ہیں۔ خالد جاوید نے شمیم حنفی کے کالمز کو مرتب کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''اگر ان کالموں کے موضوعات کے ساتھ ساتھ ان کی زبان اور اسلوب پر بھی بغور توجہ دی جائے تو ایک خصوصیت بہت واضح طور پر کھل کر سامنے آتی ہے اور وہ ہے بیانیہ میں پوشیدہ افسردگی اور ملال کی ایک کیفیت۔ افسردگی اور ملال بغیر انسان دوستی (Humanism) کے کبھی نہیں پیدا ہوتے۔ (یہ کس کا خواب تماشا ہے، 2014، ص 15)

شمیم صاحب نے نظیر کے طرب انگیز اور حزنیہ دونوں پہلوؤں کو دوسرے نقادوں کی بہ نسبت زیادہ بامعنی انداز میں پیش کیا ہے۔ میں نے اس مضمون کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ شمیم صاحب کی بعد کی نگارشات اور کتب پر زیادہ توجہ دی گئی اور دی جائے گی لیکن یہ مضمون پردۂ خفا میں ہے۔ ممکن ہے دوسرے لوگ بھی اس کا ذکر کریں۔

شمیم حنفی کی شعر فہمی اور ادب فہمی کے لوازم میں ان کا اپنا درک اور وسیع مطالعہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ وہ مغربی نظریات کو تھوپنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ دوران گفتگو کہا کرتے تھے کہ یہ Modernism اور Post Modernism کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ حالاں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ مذکورہ دونوں رجحانات سے بالکلیہ باخبر تھے۔ جدیدیت پر تو انھوں نے ڈی لٹ کا مقالہ ہی لکھا تھا، ساتھ ہی مغربی ادب کا وسیع مطالعہ تھا لیکن وہ ادب کی تفہیم کے لیے ان مغربی نظریات کی کھتونی کرنا اور جگہ جگہ کسی نظریے کو پیش کرنا وہ غیر ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا اپنا تہذیبی سیاق اور تنقیدی انسلاک تھا جن کی روشنی میں ادب پاروں اور ادیبوں، دونوں کو دیکھتے اور پرکھتے تھے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''وہ ان لکھنے والوں میں تھے جو آئین روزگار کے شعور سے بہرہ ور ہونے کے

باوجود انسانی شعور میں تبدیلی کی منطق اور منصب سے بے نیاز نہیں ہوتے، جو اپنی تہذیبی روایت کو ایک توسیع کے طور پر دیکھتے ہیں اور صرف سچی، کھری تخلیقی بصیرت کو اپنا سامان سفر سمجھتے ہیں۔

(اداریہ، رسالہ جامعہ، خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں، 2001، ص8)

شمیم حنفی نے ادب کو ایک تہذیبی تناظر اور متین مگر متحرک فکری رویہ دیا ہے۔ انھوں نے کبھی بھی رواروی میں کسی ادب پارے پر گفتگو نہیں کی۔ وہ طویل نظم کے ارتقائی سفر پر بات کریں یا غالب، اقبال یا فراق پر، ہر جگہ ان کے تنقیدی رویے میں ایک طرح کی سنجیدگی مگر متحرک فکری ارتعاش دیکھنے کو ملتا ہے۔ فراق سے انھوں نے انٹرویو بھی کیا تھا اور ایک کتاب بھی مرتب کی تھی، پھر رسالہ 'جامعہ' کی ادارت کے زمانے میں انھوں نے ایک خصوصی نمبر بھی شائع کیا تھا جو بعد میں 'فراق دیار شب کا مسافر' (دسمبر 1996) کے نام سے مکتبہ جامعہ سے شائع ہوا۔ پیش لفظ میں شمیم صاحب نے لکھا تھا کہ فراق صاحب کی بصیرت اور طباعی، ان کے غیر معمولی شعور اور ان کی فنکارانہ صلاحیتوں نے ایک عالم کو متاثر کیا... فراق صاحب جیسی رنگارنگ، زندہ و تابندہ شخصیتیں بہت کم ہوئی ہیں۔ شمیم صاحب نے فراق صاحب سے کئی نشستوں میں مختلف امور اور نکات کے حوالے سے سوالات کیے ہیں۔ تہذیبی اور ہندوستانی رنگ، جنسی موضوعات، شعری و تخلیقی نظریات، مختلف زبانوں کے ادبیات اور اس کے نشانات، جوش ملیح آبادی کی شاعری کے امتیازات اور خود فراق کی شاعری کے اوصاف وغیرہ پر شمیم صاحب نے نہایت ہی خوبصورت انداز میں سوالات قائم کیے ہیں۔ فراق صاحب کے جواب بھی برجستہ اور پرلطف ہیں۔ اس کے علاوہ فراق گورکھپوری (ایک اور سلسلۂ روز وشب) پڑھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ فراق صاحب کے مشاہدات اور زندگی کے تجربات تخلیقیت کا حصہ کیسے بنے۔ یہ مضمون فراق کے شعری متن سے زیادہ متن کاری کے عمل اور شب و روز کے عوامل اور گزران کو نشان زد کرتا ہے۔ ایک رواں تخلیقی اسلوب میں شمیم صاحب نے فراق کو اپنی تمام تر رعنائیوں اور زندگی میں برتے جانے والے اسالیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''انھوں نے فلسفہ، تاریخ، نفسیات، ادب، جو کچھ بھی پڑھا اس طرح گویا آتے جاتے موسموں یا مناظر کا جلوس دیکھ رہے ہوں۔ جب جی چاہا اس میں شامل ہو گئے، اور جس گھڑی طبیعت ذرا اکتائی منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

(ہم نفسوں کی بزم میں، ص17)

''فراق صاحب کی پتلیاں سوچتے وقت جس رفتار سے گردش کرتی تھیں یا اگر ایک نقطے پر مرکوز ہوتیں تو ہر لمحے کے ساتھ جس طرح گہری اور شدت آثار ہوتی جاتی تھیں اور ان میں ٹھہراؤ کے باوجود ہیجان کی جو کیفیت دھیرے دھیرے ابھرتی آتی تھی، اس سے فراق صاحب کے احساس اور تفکر کی رفتار پیمائی کا کام بھی لیا جا سکتا تھا۔''

(ایضاً، ص18)

''ہر لفظ ایک محسوس تجربہ اور ہر خیال ایک مشہور ہیئت۔ شاید اسی لیے وہ خیالوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے گھبراتے بھی تھے۔ فکر اور جذبے کی دوئی کو مٹانے کی یہ ادا فراق صاحب کی باتوں میں بھی تھی اور تحریروں میں بھی۔''

فراق صاحب کو شمیم صاحب نے بہت قریب سے دیکھا تھا اور گہرائی سے Observe کیا تھا۔ چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، اٹھتے بیٹھتے، چہل قدمی کرتے، گفتگو اور تقریر کرتے، شعر پڑھتے، دوسروں کا مذاق بناتے اور مذاق اڑاتے ہوئے، اپنی بات دوسرے کا اقتباس کہہ کر سناتے ہوئے، ادھر ادھر کی ہانکتے ہوئے اور محفل پر چھا جانے کے تمام گُر اپناتے ہوئے— یہ سب باتیں شمیم صاحب کے سامنے کی تھیں۔ اور پھر فراق کے شعری و نثری متون کا مطالعہ بھی تھا، اس لیے فراق صاحب کے بارے میں شمیم صاحب کی رائے بچی تُلی اور صائب کہی جائے گی۔

بیدی، ستیارتھی، خواجہ احمد عباس، عابد حسین، مجیب صاحب، خلیل الرحمٰن اعظمی، شکیب جلالی، احتشام صاحب، سرور صاحب، وحید اختر، سریندر پرکاش، غیاث احمد گدی،

انتظار حسین، دیویندر اسر، زاہد ڈار، احمد مشتاق، احمد فراز، ظفر اقبال، خالدہ حسین، مین را، رام چندرن، سب پر لکھا اور ان سب کی شخصی، فکری اور تخلیقی تثلیث کو حیطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی۔ یہاں بھی شمیم صاحب تخلیق اور انسان کی ہم رشتگی کو مستحکم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ غیر ضروری نظریات، تھیوریز یا Jargons سے اجتناب ہی شمیم صاحب کا اختصاص ہے۔

شمیم صاحب کی کتاب 'ہم سفروں کے درمیاں' اٹھایئے تو یہاں بھی ان کے احباب جو شاعر و ادیب تھے یا ہیں، ان کی ایک کہکشاں ہے۔ وہ تنہائی میں بھی تنہا نہیں رہے۔ احباب کے ساتھ، ان کی یادوں اور ان کی نگارشات کے ساتھ رہے۔ پھر یہ کہ معاملہ سطحی نہیں بلکہ گہرا اور سنجیدہ رہا۔ قرۃ العین حیدر، منیر نیازی، منیب الرحمٰن، جیلانی کامران، قاضی سلیم، محمود ایاز، من موہن تلخ، عمیق حنفی، باقر مہدی، محمد علوی، محمد سلیم الرحمٰن، بلراج کومل، کمار پاشی، زبیر رضوی، شہریار، کشور ناہید، انور سجاد، نیر مسعود، نسرین انجم بھٹی اور آخر میں خالد جاوید۔ یہ سب وہ جدید ادیب و شاعر ہیں جن کی تخلیقیت (Creativity) کی ضو پاشیاں ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ شمیم صاحب نے ان سب کی شخصیتوں اور افکار و تخلیقیت کو یکجا کر کے سخن سنجی اور ادب فہمی کی کلید پیش کی ہے جس کا انھوں نے کبھی دعوا نہیں کیا۔ کچھ لوگ تو انھیں نقاد نہیں مانتے لیکن ان کی تحریریں جہانِ نقد کا بیش قیمت سرمایہ ہیں اور وقت گزرنے کے بعد نظریاتی اور جارگن والی تنقیدی تحریریں ماند پڑتی جائیں گی اور شمیم صاحب کی تحریریں، مزید نکھرتی اور روشن ہوتی جائیں گی، کیوں کہ ان میں جس تہذیبی شعور کی آنچ اور پرخلوص طرز نقد کے عناصر ہیں، وہی ان کی شناخت کی ضمانت کے لیے کافی ہیں۔ یہ ذاتی تعبیر و تفہیم کا رویہ ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

شمیم حنفی نے ادب، آرٹ اور انسان سے بنے مثلث کو ہمیشہ ہی اہمیت دی ہے۔ کبھی اس مثلث کے اندر سے اس کے تینوں زاویوں (Angles) اور اضلاع کو دیکھا اور نہارا ہے۔ ان تینوں زاویوں کے کم و بیش ہونے میں ہی زندگی کی تمام تر نیکیاں اور بدمعاشیاں پوشیدہ ہیں۔ شمیم حنفی نے ان پر سے پردے اٹھائے ہیں اور کبھی اس مثلث کے باہر کھڑے ہو کر اس کے اندر غالب کی تخلیقی حسیت اور عصر حاضر کے خرابہ سے اقبال کی ہم آہنگی پر غور و فکر کیا ہے۔ انھوں نے منٹو اور میراجی کو بھی اسی مثلث میں رکھ کر باہر کھڑے ہو گئے ہیں۔ سیاہ فام ادب پر بھی ان کا مکالمہ ذہنوں کے بند دریچوں کو کھولتا ہے۔ یہ مثلث شمیم حنفی کے لیے منشور (Prism) کی طرح ہے جس سے روشنی کی کوئی کرن گزرتی ہے تو اس پار جا کر اس کرن کے سات رنگ منعکس ہو جاتے ہیں۔ یہی تو ہے قوس قزح یعنی Rainbow۔ شمیم حنفی کی تنقید ایک پرزم ہے جس سے گزر کر کوئی بھی ادبی فن پارہ سات رنگوں پر مشتمل ایک Spectrum بناتا ہے جسے دیکھ کر جی مچل جاتا ہے۔ ان سات رنگوں میں زندگی کی تمام تر بدرنگیاں، بدمعاشیاں، جمال آگیں شعاعیں اور رنگینیاں، سیاسی و سماجی اتھل پتھل اور تہذیبوں کے زوال کی کہانی اور ماضی کا بیش بہا گوہر اب کچھ شفاف ہو کر نظر آنے لگتا ہے۔

میں نے ادب، آرٹ اور زندگی سے بنے ہوئے جس مثلث کی بات کی ہے، اس کے حوالے سے اگر شمیم صاحب کی تنقیدی نگارشات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بھی ایک مطالعے کا زاویہ ہو سکتا ہے۔ اقبال کے حوالے سے لکھی گئی کتاب کے 'پیش لفظ' میں شمیم صاحب لکھتے ہیں:

> ''بصیرت کی جس گہرائی اور فکری استحکام کے ساتھ، اقبال نے بیسویں صدی کی زندگی اور انسان کے ارتقا اور سربلندی اور پسپائی اور زوال کا احاطہ کیا ہے، اور جدید و قدیم اسلوب سے ماخوذ اصطلاحوں میں جس طرح انھوں نے اپنے گرد و پیش کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، وہ انھیں مغرب و مشرق کی آویزش اور اپنے گم شدہ تصورات کے تشخص اور بازیافت کا سب سے محکم وکیل اور مفسّر بناتی ہے (پیش لفظ، اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ، ستمبر 2010، ص 12)

میں نے کئی جگہوں پر شمیم صاحب کے 'پیش لفظ' سے ہی حوالے دیے ہیں۔ شمیم صاحب کے پیش لفظ کی خوبی یہ ہے کہ وہ کوزے میں سمندر کو بند کر دیتے ہیں، گویا کتاب کا عطر کشید کرتے ہیں۔ پیش لفظ میں وہ خواہ مخواہ کی غیر ضروری اور Irrelevant باتوں اور حوالوں سے گریز کرتے ہیں۔ چلیے ایک مختصر حوالہ 'جاوید نامہ' اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ' سے دیتا ہوں۔ مضمون کا آغاز ہوتا ہے:

''تنہائی اور ناصبوری— تخلیقی توانائی کے ان ہی دو سرچشموں سے 'جاوید نامہ' کا ظہور ہوا ہے۔ یہ سرچشمے اقبال کے منفرد شعور کا شناس نامہ بھی کہے جاسکتے ہیں۔'' (ایضاً،ص152)

وہی آرٹ، ادب اور انسان کی تثلیث یہاں بھی ہے۔ یہ دو سرچشمے اور 'جاوید نامہ' گویا تثلیث حیات ہے۔ شمیم صاحب کی تنقید کسی بھی فنکار کے باطن میں اتر کر گہری تاریکی سے تابناکیاں اور تابشیں لے کر آتی ہیں۔ یہ فن، یہ تنقیدی ہنر شمیم صاحب کے ہم عصروں میں شاید ہی نظر آئے۔ چاہے اور دوسرے پہلو اور رنگ نظر آجائیں۔ میری اس بات پر کسی کو پہلو بدلنا ہو تو بدل لے۔

غالب کا ایک شعر لکھ کر شمیم حنفی کہتے ہیں:

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

''اس ایقان کو ہم غالب کا ذاتی منشور بھی کہہ سکتے ہیں اور اسی انداز فکر کی سطح پر غالب اپنی گم ہوتی ہوئی اجتماعی تاریخ، ایک بجھتے ہوئے ماضی میں ہمیں موجود بھی دکھائی دیتے ہیں اور اس سے آگے جاتے ہوئے بھی'' (غالب کی تخلیقی حسیت، 2005،ص216)

دراصل شمیم حنفی کو نقاد کی اپنی آگہی اور بصیرت سے زیادہ شاعر کی حسیت عزیز ہے جس کا ذکر انھوں نے کیا بھی ہے۔ انھوں نے تو یہ تک لکھ دیا ہے:

''تنقید میں اپنی نمائش کا شوق ایک بار پیدا ہو جائے تو نقاد کے لیے بدمذاقی کی کوئی بھی حد آخری حد نہیں ہوتی۔'' (ایضاً،ص221)

اس اقتباس میں روئے سخن چاہے جس طرف بھی ہو، اس کے لفظوں کی صداقت پر شبہ نہیں ہوسکتا۔ کچھ نقاد (بہ زعم خود) ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے مغربی نظریات کی جگالی بہت کی ہے، لیکن ادب فہمی کے نام پر جیسے کہ وہ بیگار ہی کرتے رہے ہیں۔ ایسے نقادوں سے شمیم صاحب کا کچھ لینا دینا نہیں۔ شمیم صاحب نے مغربی ادب اور نظریوں کو کسی بھی مغرب زدہ نقاد سے کم نہیں پڑھا تھا، لیکن مغرب زدگی اور اکتساب فیض کے فرق کو شمیم صاحب بخوبی سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے مطالعے کو Digest کیا تھا بلکہ کہنا چاہیے کہ اپنے مطالعے کی وسعت کو قابو میں رکھا تھا، بے لگام گھوڑے کی طرح چھوڑ نہیں دیا تھا۔ انھوں نے بھی Miniature، Mural، The Meaning of Meaning، Precision، Abstract، Concrete، Kinetic، Metahistorical، Meta Narrative وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن آپ کو کہیں بھی Patching کا احساس نہیں ہوگا۔ اقبال کی نظم 'ذوق و شوق' پر تجزیاتی مضمون لکھتے ہوئے ایک جملہ دیکھیے:

''ذوق و شوق' دیکھنے میں ایک چھوٹی سی نظم ہے، لیکن معنوی اعتبار سے ایک مہابیانیے Grand Narrative کا ٹھاٹ رکھتی ہے۔'' (اقبال اور عصر حاضر کا خرابہ،ص216)

بہرحال، عرض یہ کرنا ہے کہ شمیم حنفی کے وسیع مطالعے اور ان کی اپنی فکری جہتوں کا جو تنوع تھا وہ ان کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے کسی کے جبر میں اپنے مطالعے کے لیے کسی نوع کے ادب کا انتخاب نہیں کیا۔ انھیں تاریخ، فلسفے، ہندوستانی دیومالا، رقص، موسیقی، دیسی گیت، ان سب میں دل چسپی تھی۔ ان کی یادداشت کا یہ عالم تھا کہ معمولی شعرا کا کلام بھی وہ سنایا کرتے تھے۔ بڑے بڑے شعرا کا کلام تو لوگ ضرورتاً بھی یاد کر لیتے ہیں۔ شمیم صاحب کے دماغی سانچے میں بڑی لچک تھی۔ پھر یہ کہ ان کی گفتگو کا انداز بہت پُراثر اور سحرانگیز تھا۔ آواز میں کھنک اور روانی۔ بہت ٹھہر ٹھہر کر اور چبا چبا کر باتیں کرنے کے بجائے وہ کم وقت میں بہت کچھ بتا دینا چاہتے تھے۔ کبھی کبھی علمی وفور کے سبب گفتگو دوسری طرف چلی جاتی، لیکن، پھر اپنی سابقہ لیک پر آجاتے۔ پرکشش شخصیت کے مالک اور ایک نہایت ہی باوقار دانشور ادیب پروفیسر شمیم حنفی کے جانے کا غم پوری اردو دنیا کو ہے لیکن ہم ان کی تخلیقی و تنقیدی نگارشات سے ہر عہد میں مستفیض ہوتے رہیں گے۔

قارئین! آپ کو شمیم صاحب کا یہ شعر افسردہ کردے گا، لیکن کیا کیجیے اس عہد میں افسردگی ہمارا مقدر ہو چکی ہے:

ہمیں گھر سے نکالا تھا تو یہ بھی سوچ لینا تھا
کہ صاحب پھر کبھی آنا نہیں ہے لوٹ کر ہم کو

○

حقانی االقاسمی
قومی کونسل برائے فروغ اردو، اردو بھون
جسولا، نئی دہلی
Cell: 989172644

میں اور کتنے ستاروں کو ڈوبتا دیکھوں

(افتخار امام صدیقی کی یاد میں)

4/اپریل 2021ء کو فیس بک کھولتے ہی مدیر شاعر افتخار امام صدیقی کے انتقال کی خبر ملی تو دل دھک سے رہ گیا۔ متواتر اور مسلسل اموات کی خبروں سے دل پہلے ہی بہت نڈھال تھا۔ جن دوستوں کے ساتھ کبھی قہقہے لگایا کرتے تھے ان کے سانحۂ ارتحال نے آنکھوں سے آنسو تک نچوڑ لئے۔ مناظر عاشق ہرگانوی، مشرف عالم ذوقی، مولا بخش، تبسم فاطمہ اور بہت سارے ادبی ستاروں کے مسلسل ٹوٹنے اور ڈوبنے نے دل کی حالت عجیب سی کردی:

میں اور کتنے ستاروں کو ڈوبتا دیکھوں

بھائی عزیز نبیل کے اس مصرعہ نے اور بھی رلا دیا کہ ستارے اسی طرح ڈوبتے رہے تو ہم روشنیاں کہاں تلاش کریں گے۔

اب ایک اور روشنی روٹھ گئی اور دل کی اداسیوں کو اور بڑھا گئی۔ ہفتہ دس دن پہلے ہی تو افتخار بھائی سے فون پر بات ہوئی تھی۔ یہ وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ گفتگو کا یہ سلسلہ اچانک یوں بند ہو جائے گا۔ وہ گفتگو جس میں خلوص کی خوشبو اور محبت کا رنگ تھا۔ ساری پرانی ملاقاتیں اور یادیں لوح ذہن پر جھلملانے لگیں۔ ملاقات کی تاریخیں اور دن مجھے یاد نہیں رہتے اس لئے مجھے پتہ نہیں کہ افتخار بھائی سے پہلی ملاقات کب ہوئی تھی۔ بس اتنا پتہ ہے کہ جب ملاقات ہوئی تھی تو وہ دن میرے لئے سب سے خوبصورت اور یادگار دن تھا۔

افتخار بھائی سے ملاقات تو بہت بعد میں ہوئی مگر مراسلت کا سلسلہ پرانا تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی سے ہی اردو، انگریزی کا طالب علم نہ ہوتے ہوئے بھی میں درجنوں اردو اور انگریزی رسائل کا باضابطہ خریدار تھا۔ کچھ رسالے بازار سے بھی خرید لاتا تھا۔ جن چند رسائل سے میری خاص دلچسپی تھی ان میں ایک ماہنامہ 'شاعر' ممبئی بھی تھا جو مجلّاتی صحافت میں ایک سنگ نشاں کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب بھی رسالہ 'شاعر' کے آنے میں تاخیر ہوتی تو میری بے چینی بڑھ جاتی تھی۔ جانے کیوں مجھے اس مجلّہ سے ایک طرح کا قلبی لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ اس میں بڑے عمدہ ادبی مباحث، مسائل اور تجزیے ہوا کرتے تھے جو اپنی طرف کھینچتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی تھی کہ اس رسالہ کی رسائی دور دراز علاقوں اور ملکوں تک تھی۔ یہ رسالہ مجھے اتنا پیارا لگتا تھا کہ اس میں چھپنے کی شدید خواہش ہوتی تھی۔ میں نے کئی بار کوشش کی مگر کامیابی نہ ملی۔ شاعر کے مشمولات کے حوالے سے میں اکثر مکتوب بھیجا کرتا تھا۔ اتفاق سے میرا ایک مکتوب اشاعت کے لئے منتخب کر لیا گیا۔ شاعر میں میرا خط شائع ہوا تو میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ کیوں کہ یہ صرف ایک خط کی اشاعت نہ تھی بلکہ ایک دیرینہ خواب کی تکمیل تھی۔ اس کے بعد شاعر کا اگلا شمارہ آیا تو میرے مکتوب پر کچھ ارباب نظر کا شدید ردعمل تھا۔ مجھے اس سے ذہنی اذیت کے بجائے قلبی مسرت ہوئی کہ اس حقیر کے معمولی خیالات کو لوگوں نے توجہ سے پڑھا اور ردعمل کا اظہار کیا۔ میں اپنے خلاف شائع ہونیوالے ادب آموز اور نصیحت آمیز خط کو میں بار بار پڑھتا تھا اور محظوظ ہوتا تھا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ مخالفانہ ردعمل میرے لئے تحرک اور پہچان کا ایک عنوان بن سکتا ہے۔

کیوں کہ حمایت سے زیادہ کبھی کبھی مخالفت مفید ثابت ہوتی ہے۔ سوایسا ہی ہوا کہ مخالفت میرے لیے تریاق ثابت ہوئی اور میں شاعر کے ساتھ مزید جڑتا گیا۔ میں شاعر کے ہر شمارے کا بے چینی سے انتظار کرتا تھا کہ اس کے ادبی فیچرس اور مباحث میرے ذوق اور جذبے کو مہمیز کرتے تھے۔ ادبی کائنات سے مکمل شناسائی کا یہ ایک بہتر وسیلہ تھا۔

دراصل اس وقت جتنے بھی ادبی رسائل وجرائد برصغیر ہندو پاک میں شائع ہوتے تھے ان میں 'شاعر' کا اپنا ایک انفراد و امتیاز تھا کہ اس رسالے سے عظیم تخلیقی اور تنقیدی ذہنوں کی وابستگی تھی اور اس کی ادارت میں ادب کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ علامہ سیماب اکبرآبادی، منظر صدیقی، اعجاز صدیقی، تاجدار احتشام صدیقی۔ بعد میں اس علمی اور ادبی کہکشاں میں افتخار امام صدیقی کی شمولیت ہوئی جو اسی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے۔ افتخار بھائی نے رسالہ شاعر میں اپنے اختراعی ذہن سے چار چاند لگادیے۔ اس کی مقبولیت اور شہرت کا گراف بڑھنے لگا کیوں کہ یہ صرف ایک ادبی مجلّہ نہیں بلکہ ادب کا ایک جام جہاں نما تھا اور اس رسالے کی ایک زریں تاریخ بھی تھی۔ فروری 1930ء سے آگرہ سے پندرہ روزہ اخبار کی شکل میں اس کا آغاز ہوا تھا اور پھر ماہنامہ کی صورت میں ادبی افق پر طلوع ہوا تو آج تک وہ روشن اور تابندہ ہے۔ ورنہ اکثر رسائل طلوع ہوتے ہی غروب ہوجاتے ہیں۔ شاعر کا اشاعتی استمرار اور تسلسل قابل رشک ہے۔ تقریباً نوے سال سے زائد ہو چکے ہیں اس رسالے کو افتخار امام صدیقی اور ان کے برادران نے نہ صرف زندہ رکھا بلکہ پوری اردو دنیا سے اس کا رشتہ جوڑ دیا۔ اس لیے کہا جاتا تھا کہ: 'اردو ہے جہاں شاعر ہے وہاں'۔

افتخار امام صدیقی سے قبل رسالہ شاعر میں بہت سے تجربے کیے گئے اور ہر تجربے کو شناخت اور مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ ارباب ادب نے خوب پذیرائی کی۔ خاص طور پر شاعر کے خصوصی شماروں کو پوری دنیا میں شہرت نصیب ہوئی۔ افسانہ نمبر، منٹو نمبر، غالب نمبر، گاندھی نمبر، ناولٹ نمبر، ہمعصر اردو ادب نمبر، نثری نظم اور آزاد غزل نمبر، اردو کی نئی بستیاں نمبر، اقبال نمبر اس کے علاوہ اردو ادب کے قومی اور عالمی منظرنامے کے حوالے سے خصوصی شمارے، اصناف اور شخصیات پر دستاویزی نوعیت کے شمارے، نئے اور پرانے ادیبوں کے حوالے سے اہم گوشے جن میں انور خاں، نثار احمد فاروقی، مشفق خواجہ، قابل اجمیری، قیصر الجعفری، احمد ندیم قاسمی، باقر مہدی کے گوشے بہت اہم ہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے نوجوان فنکاروں اور قلم کاروں کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ دیپتی مشرا، حنیف ساحل، قمر جمالی، مظہر سلیم، عظیم راہی وغیرہ وغیرہ کے فنی اور تخلیقی امکانات سے ''کل آج اور کل'' جیسے کالم کے ذریعہ اردو دنیا کو روشناس کرایا۔ ابوالخیر کشفی، جوگیندر پال، مسعود حسین خان اور دیگر زندہ شخصیات پر اعترافی گوشے شائع کیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے خاص کام یہ کیا کہ رسالہ شاعر کے ذریعے بہت سی گوشہ گیر اور گمنام خواتین کو اردو دنیا سے متعارف کرایا۔ خواتین کے ساتھ ادبی ناانصافیوں کا انھوں نے بہت خوبصورتی سے ازالہ کیا۔ مارچ کا شمارہ زیادہ تر خواتین سے مختص ہوتا تھا۔ دنیا بھر کی خواتین کی تخلیقات اور تصاویر اس میں شامل ہوتی تھیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین کی ایک بہت بڑی تعداد ادب سے جڑی ہوئی ہے اور ان کے اندر بے پناہ تخلیقی اور تنقیدی امکانات بھی ہیں۔ افتخار امام صدیقی نے مارچ 2020 کے جرعات میں لکھا ہے کہ'' ماہنامہ 'شاعر' کی یہ روایت رہی ہے کہ ہر سال 8 مارچ یوم عالمی خواتین کے موقع پر مارچ کا شمارہ اردو کے نسائی جہاں کی کسی نہ کسی معروف و مشہور فنکارہ یا کسی نووارد فنکار کے کارو افکار کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ روایت 2004 سے تاحال جاری ہے۔'' افتخار بھائی نے نسائی ادب کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ خواتین کے تعلق سے لوگوں کی نظر بھی بدلی، نظریہ بھی اور نسائی ادب کا منظر بھی تبدیل ہوا۔ انھوں نے نسائی تخلیقی وجود کے امتیازات سے ادبی دنیا کو روشناس کرایا اور خواتین کی تخلیقی قوتوں کا اعتراف کرانے میں بہت ہی سرگرم کردار ادا کیا۔ ترنم ریاض، شبنم عشائی، پروین شیر، شکیلہ رفیق، صوفیہ انجم تاج، طاہرہ اقبال اور نہ جانے کتنی خواتین پر گوشے شائع کیے۔ اس طرح شاعر کے بہت سے شمارے خواتین قلم کاروں کے لئے بادِ نوبہار ثابت ہوئے۔

ادب کے بہت سے اہم اور قیمتی تجربے رسالہ شاعر میں کیے گیے اور انھیں تجربوں کی بدولت رسالہ شاعر کے اعتبار اور وقار میں اضافہ ہوتا گیا۔ افتخار امام صدیقی نے اپنا خون جگر اس رسالے کو سینچنے میں صرف کیا اور اسی کی وجہ سے یہ رسالہ نامساعد حالات کے باوجود ہنوز زندہ وتابندہ ہے۔ محدود وسائل کے باوجود ایسے رسالہ کو زندہ رکھنا آسان کام نہیں تھا لیکن افتخار امام صدیقی اور ان کے برادران کے عزم محکم نے اس رسالے کو مرنے نہیں دیا۔ افتخار بھائی مسلسل اس کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بیماری کی حالت میں بھی انھیں اپنے سے کہیں زیادہ ماہنامہ 'شاعر' کی صحت کی فکر لگی رہتی تھی اور شاید اسی فکر نے انھیں اور زیادہ بیمار کر دیا تھا۔

افتخار بھائی سے جب میری پہلی ملاقات ہوئی تھی تو وہ خاصے صحت مند تھے۔ چہرے پر ایک خاص طرح کی چمک تھی۔ میں علی گڑھ سے دلّی بہ سلسلۂ ملازمت آ گیا تھا اور شاید اس وقت م۔ افضل صاحب کے ہفت روزہ 'اخبارِ نو' سے وابستہ تھا۔ افتخار بھائی سے وہیں ملاقات ہوئی، وہ بے حد خوش ہوئے۔ وہ مجھ سے پہلے ہی سے متعارف تھے اس لئے بہت خلوص اور محبت سے ملے اور مجھے کچھ لوگوں سے ملاقات کروانے کے لئے کئی جگہوں پر لے بھی گئے۔ اسی دوران جب ہم دونوں آئی ٹی او کا برج پار کر رہے تھے تو انھوں نے اچانک کہا: 'حقانی رکو اِدھر دیکھو، میں نے دیکھا تو نیچے بے شمار گاڑیاں اور بسیں گزر رہی تھیں۔ افتخار بھائی نے کہا کہ حقانی خودکشی کے لئے اس سے اچھی کوئی اور جگہ نہیں ہوسکتی۔' مجھے حیرت ہوئی کہ آخر افتخار بھائی کے ذہن میں یہ خیال کیوں کر آیا۔

اس ملاقات کے بعد میرا تعلق اور بھی مضبوط ہوتا گیا۔ وہ مسلسل مجھے ٹیلیفون کرتے، خبر خیریت دریافت کرتے۔ میری ملازمت کے تعلق سے فکرمند رہتے۔ میں نے اردو کے ادیبوں اور شاعروں میں خاکسار کے تئیں کسی اور کو اتنا فکرمند نہیں پایا۔ افتخار بھائی میرے لیے سراپا خلوص اور محبت تھے۔ ہمیشہ شاعر کے لئے کچھ نہ کچھ بھیجنے کو کہتے رہتے اور جب بھی انھیں کسی ادیب یا شاعر کے موبائل نمبر کی ضرورت ہوتی تو مجھے ہی زحمت دیا کرتے۔ آخری عمر میں شاید وہ نسیان کا شکار ہو گئے تھے اس لئے بار بار انھیں لوگوں کے موبائل نمبر مانگتے تھے جن کے نمبر میں پہلے بھیج چکا ہوتا تھا۔ وفات سے چند روز قبل بھی دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ ان کی آواز میں لرزش تھی۔ صاف سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ کسی خاتون کا نام لیتے تھے کہ وہ آئیں گی تم سے کچھ مشورہ کریں گی۔ تم ان کی مدد ضرور کرنا۔ جانے وہ خاتون کون تھیں، نہ ملیں اور نہ کبھی مشورہ کیا۔ اس بار بھی انھوں نے یہی کہا کہ علی گڑھ کا ادب دریچہ لکھ کر جلدی بھیج دو میں تمہارے مضمون کا انتظار کر رہا ہوں۔ تمہارا بنارس والا مضمون 'بنارس کی تخلیقی صبح' لوگوں نے بہت پسند کیا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں شہروں کے حوالے سے لکھتا رہوں مگر مصروفیات نے مجھے مہلت نہیں دی اور میں ان کے اس حکم کی تعمیل نہ کر سکا جس کا مجھے شدید افسوس ہے۔

میرے بارے میں وہ بہت اچھی سوچ رکھتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ نئی نسل میں تم سے زیادہ ذہین کوئی نہیں ہے۔ تمہاری نثر سب سے الگ ہے۔ تمہاری زبان بہت خوبصورت ہے۔ یہ ان کی محبت تھی کہ وہ اکثر میرے ٹوٹے پھوٹے جملوں کی بھی تعریف کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو یہ بھی کہتے تھے کہ نئی ترکیبیں اور نئے الفاظ اس وقت صرف دو ہی لوگ ایجاد کر رہے ہیں۔ ایک میں اور دوسرے تم۔ افتخار بھائی تو واقعی اختراعی ذہن رکھتے تھے۔ نئے الفاظ اور تراکیب ایجاد کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا مگر میری اتنی بساط کہاں کہ کوئی نیا لفظ گڑھ سکوں اور مخترع و موجد کہلاؤں۔ بس یہ ان کی محبت اور شفقت تھی ورنہ 'من آنم کہ من دانم'۔

افتخار بھائی کی محبتوں کا تسلسل کبھی ختم نہیں ہوا ورنہ اکثر محبتیں اور شفقتیں وقت اور حالات کے ساتھ دم توڑ دیتی ہیں۔ جب بھی میں بے روزگار ہوا تو مجھ سے زیادہ تشویش افتخار بھائی کو رہتی تھی۔ میرے بچے، میری فیملی، میرے مستقبل، ہر ایک کے بارے میں وہ سوچتے تھے۔ مگر ان کے ساتھ خود ہی بہت سی دشواریاں تھیں اس لیے وہ عملی طور پر کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے۔ بہر حال مشکل حالات میں مجھے ان کے محبت بھرے جملوں

سے بڑا حوصلہ ملتا تھا۔

افتخار بھائی اور میری عمر کے درمیان خاصا تفاوت اور فاصلہ تھا لیکن محبت کے باب میں عمر کے یہ فاصلے ختم سے ہو جاتے ہیں۔اس لیے انھوں نے اپنے کردار اور گفتار سے کبھی جنریشن گیپ کا احساس نہیں ہونے دیا۔یہ ان کا بڑپن تھا کہ جب بھی میری کوئی تحریر ان کی نظر سے گزرتی تو دل کھول کر داد دیتے۔تعریف میں کبھی انھوں نے بخل سے کام نہیں لیا۔ حقیقت میں وہ ایک سخی سمندر تھے۔اکثر شاعر میں کتابوں کے اشتہارات تیار کرتے وقت میری رائے کو نمایاں طور پر شائع کرتے تھے۔

میں جب 'آواں گارد' مجلّہ استعارہ سے وابستہ تھا تو اس وقت بدن کی جمالیات سیریز ادبی حلقے میں معتوب بھی تھی اور مقبول بھی۔افتخار بھائی کو میری یہ سیریز بہت پسند تھی اور وہ بہت ہی شوق اور انہماک سے پڑھتے تھے اور شاید اسی سیریز سے متاثر ہو کر انھوں نے رسالہ استعارہ کو 'جادو بدن نظمیں' اشاعت کے لئے بھیجی تھیں۔انھوں نے اپنے خط میں لکھا تھا:

ڈیر حقانی!

''وعدے کے مطابق تمہیں اپنی دو غزلیں اور باب بدن کے لئے گیارہ نظمیں ارسال کر رہا ہوں۔تاخیر تو ہوگئی ہے لیکن انھیں شامل ضرور کر لینا۔ یہ نظمیں اور ہی مختلف اور خطرناک ہیں۔ جسم سوچ بدن نظمیں ایک دوسرے رخ کی نظمیں ہیں۔ بدن کی اپنی سوچ بھی ہے۔جسم کے بارے میں اب آئندہ میری نظموں کا موضوع یہی ایک رخ ہوگا۔عورت کی مرد کے بارے میں سوچ باب بدن میں اس موضوع پر بھی لکھنا۔ اس خط کی رسید ضرور دینا۔صلاح بھائی تو دہلی سے باہر ہوں گے۔ زیادہ خیریت۔''

دعا گو

افتخار امام

واقعی افتخار بھائی کی یہ نظمیں خطرناک بھی تھیں اور خوبصورت بھی ۔نظمیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ افتخار بھائی بدن کی بوطیقا سے اچھی طرح واقف تھے۔ ذرا یہ نظم دیکھئے کہ اس میں بدن کی کتنی خوبصورت استعاراتی کائنات کے ساتھ آہنگ اور نغمگی کی کیفیت ہے:

تمہارا بدن
کتنی زبانوں، بولیوں، ٹھولیوں
کا سنگم ہے؟
بدن کے ہر انگ کی
اپنی کوئی نہ کوئی زبان
ہر زبان کی اپنی تہذیب
اس کا اپنا جغرافیہ
پوری انفرادیت کے ساتھ
میں تمہارے بدن کے
کس کس جغرافیے میں اتروں
کون کون سی زبانوں کو سمجھوں
کس کس انگ میں سما جاؤں
اور جب تم
پورے بدن سے بولتی ہو
تب؟

(استعارہ، شمارہ۔۲)

واقعی یہ جادو بدن نظمیں تھیں۔اور ان سے مجھے بھی بہت تحریک اور ترغیب ملی۔افتخار بھائی بار بار اصرار کرتے تھے کہ تمہاری یہ بدن سیریز کتابی شکل میں جلد آنی چاہئے۔ چنانچہ جب احباب کا اصرار بڑھتا گیا تو میں نے اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کیا اور افتخار بھائی سے اس کتاب کا اپنی لاگ بھی لکھوایا۔جس میں انھوں نے اس موضوع پر مبسوط گفتگو کرتے ہوئے یہ لکھا تھا:

''سہ ماہی استعارہ دہلی میں برادرم حقانی القاسمی نے بدن کی جمالیات کے موضوع پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا تھا اس کے ذیل میں راقم کی نظمیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ اب حقانی کے مذکورہ مضامین کتاب بند ہو رہے ہیں تو انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں اس موضوع پر ایک مقالہ لکھوں اور اپنی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نظموں کے ساتھ ارسال کروں۔ نظمیں، غزلیں تو لاتعداد ہیں اور رباعیاں بھی ہیں جو فراق اور اختر سے یکسر مختلف ہیں۔ بدن کی جمالیات کا تعلق ہر عورت اور مرد کی وجدان بھر سوچ سے ہے اور اس میں جنس کا تناظر ناگزیر ہے۔''

انھوں نے اس تعلق سے اپنا ایک خوبصورت سا شعر بھی تحریر کیا تھا:

بدن بھر انگڑائی میں کتنی شدت سموتی ہو
مرے اک جسم میں کتنی حدت سموتی ہو

افتخار بھائی نظم اور غزل کے بہترین شاعر تھے۔ مشاعروں میں بھی مقبول تھے اور ادبی حوالوں میں بھی شامل تھے۔ ان کی کئی غزلیں، غزل گلوکاروں نے گائی بھی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل میں بھی ان کا لہجہ مختلف اور منفرد تھا۔

تو نہیں تو زندگی میں اور کیا رہ جائے گا
دور تک تنہائیوں کا سلسلہ رہ جائے گا

میں جانتا ہوں وہ رکھتا ہے چاہتیں کتنی
مگر یہ بات اسے کس طرح بتاؤں میں

بچھڑ نہ جائے کہیں تو سفر اندھیروں میں
ترے بغیر ہر اک راستہ اداسی ہے

ہر ایک دن اداس دن تمام شب اداسیاں
کسی سے کیا بچھڑ گئے کہ جیسے کچھ بچا نہیں

پھر اس کے بعد تعلق میں فاصلے ہوں گے
مجھے سنبھال کے رکھنا بچھڑ نہ جاؤں میں

افتخار بھائی کو ناظر نعمان صدیقی نے بہت سنبھال کر رکھا مگر وہ بچھڑ گئے۔ صرف خانوادۂ شاعر کو نہیں بلکہ پوری اردو دنیا کو اداس کر گئے۔ ان کے انتقال سے اردو کی ادبی صحافت کا ایک سورج غروب ہو گیا۔ وہ سورج جس نے نہ جانے کتنے ذروں کو روشنی اور حرارت بخشی تھی۔ جس کے تابندہ اور توانا ذہن سے ادب میں تحرک اور طغیانی تھی۔ افتخار بھائی حقیقتاً اردو کے سچے عاشق تھے اور اس عشق میں انھوں نے بہت سے خسارے بھی سہے اور اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے۔ انھوں نے ادب کو توانا کرنے کے لئے خود کو نحیف و نزار کر لیا۔ خود چلنے پھرنے کی سکت نہ تھی مگر اپنے قلم کو ہمیشہ رواں دواں رکھا۔ افتخار بھائی کے پاس قلم کی قوت اور دولت تھی اور وہ بے بہا دولت انھوں نے اپنی ریاضت اور محنت سے حاصل کی تھی۔ اور اسی قلم نے انھیں پوری دنیا سے جوڑا تھا۔ ان کی ملاقاتوں اور یادوں کے سارے سلسلے اسی قلم سے جڑے ہوئے تھے۔ اسی قلم کے جادو نے مجھے ان سے قریب کیا تھا اور یہ قربتیں بعد میں ملاقاتوں میں تبدیل بھی ہوئیں۔

افتخار بھائی سے میری تین ملاقاتیں ہوئیں۔ دو ملاقاتیں دارالسلطنت دلّی میں اور تیسری ملاقات عروس البلاد بمبئی میں۔ میں ای۔ ٹی وی چینل کے سیریل 'شیشے کا گھر' کے تعلق سے بمبئی گیا ہوا تھا۔ صلاح بھائی کی صاحبزادی ارسلا قریشی اس کی پروڈیوسر تھیں۔ بمبئی میں کئی دن قیام رہا، کئی بڑے ٹی وی آرٹسٹوں سے پُرلطف ملاقاتیں رہیں۔ کچھ ادیبوں سے بھی ملنا ہوا۔ افتخار بھائی سے ملاقات کی خواہش جاگی سو میں ان سے ملنے کے لئے دینا تھ بلڈنگ پی بی مارگ ممبئی تک گیا۔ اسی کے ایک فلیٹ میں افتخار بھائی سے ملاقات ہوئی۔ چھوٹے سے کمرے میں کتابوں کا انبار تھا اور افتخار بھائی ان کتابوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ مشہور فلمی نغمہ نگار اور شاعر بھائی شکیل اعظمی بھی میرے ساتھ تھے۔ دیر تک صرف ادب نہیں نجی حوالوں سے بھی باتیں ہوتی رہیں۔ میری ملازمت، میری پریشانیاں، میرے دکھ، میرے درد۔ افتخار بھائی سے صرف ادب کا رشتہ نہیں تھا بلکہ شفقت و محبت کا وہ تعلق تھا جس میں ادبی اور نجی زندگی کے سارے معاملات شامل ہوتے ہیں۔ میرے لئے وہ چارہ ساز بھی تھے اور غمگسار بھی۔ ہمیشہ ہمدردی کے بول بولتے، تسلی دیتے، سمجھاتے بجھاتے۔ جب 2 ستمبر 2019 میں میری جان سے پیاری معصوم بیٹی انیقہ کا انتقال ہوا تو کچھ دنوں کے بعد بہت ہی لڑکھڑاتی آواز میں افتخار بھائی نے کہا تھا ''حقانی صبر کرو، حقانی صبر کرو، اللہ کی مرضی تھی۔ اب جب کہ افتخار بھائی بھی داغِ مفارقت دے گئے ہیں تو اب کون کہے گا کہ حقانی صبر کرو، صبر کرو۔ دراصل صبر کرنا آسان نہیں ہوتا۔ یہ بہت ہی مشکل عمل ہے۔ سعود عثمانی نے سچ ہی کہا ہے:

کتنی آساں ہے صبر کی تلقین
کتنا مشکل ہے دل پہ سل رکھنا

اب میں ناظر نعمان صدیقی اور حامد اقبال صدیقی اور دیگر پسماندگان سے کیسے کہوں کہ صبر کیجئے۔ مجھ میں تو اب اتنی ہمت بھی نہیں رہی کہ افتخار بھائی اور دیگر احباب کی متواتر موت نے مجھے اندر سے بالکل توڑ دیا ہے۔

●

نیاز سلطان پوری
بھٹی جرولی، سلطان پور۔ یوپی
فون نمبر:8756228058

افتخارِ صحافت نہ رہا

سالِ رواں یوں تو ساری دنیا کے لئے نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے لیکن اُردو دنیا کے لئے بطورِ خاص خسارہ کا سال رہا ہے۔ اردو ادب کی ان گنت مایہ ناز شخصیات آناً فاناً میں اپنے متعلقین کو تنہا چھوڑ کر راہیٔ ملکِ عدم ہو گئیں۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر شمیم حنفی، پروفیسر مولا بخش وغیرہ کی رحلت محبانِ اردو کے لئے نا قابلِ فراموش واقعہ ہے۔ یوں تو ہر بشر کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور بقولِ شخصے: ''موت سے کس کو رستگاری ہے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے''۔ یہی قانونِ قدرت ہے۔ یوں تو ہر جانے والا کوئی نہ کوئی گہرا اثر اپنے متعلقین پر چھوڑ تا ہے مدتوں تک محسوس کی جاتی ہے، انھیں میں امام صدیقی صاحب کی ہے ۔ آپ کی ادبی صحافت کے ایسے مہرِ جہاں تاب عالم منور ہے اور قلم کی شت سے اہلِ رہا ہے جبکہ اہلِ قلم (باستثنائے چند) نانِ اقبال جیسے فلسفی اور شاعر کو بھی نظام کے سے خوش ہوتے ہیں کہ ہماری زبان کی امریکہ ،فرانس، جرمنی اور عرب ممالک بدولت دیارِ غیر میں بھی مقبولیت حاصل اپنے روایتی علاقوں سے بھی معدوم ہو رہی یا گروہوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اب

یوں تو ہر بشر کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور بقولِ شخصے: ''موت سے کس کو رستگاری ہے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے''۔ یہی قانونِ قدرت ہے۔ یوں تو ہر جانے والا کوئی نہ کوئی گہرا اثر اپنے متعلقین پر چھوڑ تا ہے لیکن کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی کمی مدتوں تک محسوس کی جاتی ہے، انھیں میں ایک ادبی شخصیت مدیرِ شاعر جناب افتخار امام صدیقی صاحب کی ہے۔ آپ خانوادۂ سیمابؔ کے چشم و چراغ اور اُردو کی ادبی صحافت کے ایسے مہرِ جہاں تاب تھے جس کی ضیا باریوں سے چہارِ دانگِ عالم منور ہے اور قلم کی شت سے اہلِ خاندان کی کفالت کرنا آپ کا شیوہ رہا ہے

لیکن کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی کمی ایک ادبی شخصیت مدیرِ شاعر جناب افتخار خانوادۂ سیمابؔ کے چشم و چراغ اور اُردو تھے جس کی ضیا باریوں سے چہارِ دانگِ خاندان کی کفالت کرنا آپ کا شیوہ شبینہ کو محتاج رہے ہیں یہاں تک کہ ڈاکٹر وظیفہ پر تکیہ کرنا پڑا۔ ایسے تو ہم اس بات دھوم سارے جہاں میں ہے اور برطانیہ، میں اُردو اپنی کشش اور روجاہت کی کر رہی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُردو ہے اور اس کا دائرۂ اثر چند خاندانوں اردو نہ کسی کو روزگار دلا سکتی ہے اور نہ ہی اپنی پوزیشن ہی پا سکتی ہے، جب اردو والے خود ہی اُردو کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے پر تُلے ہوں تو ایسے عالم میں اُردو کو مائل بہ زوال ہونے سے کون بچا سکتا ہے پھر بھی چند ادبی گھرانوں نے اُردو کو دامے، درمے، سخنے اُردو زبان و ادب کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، ان ہی ادبی گھرانوں میں حضرت سیمابؔ کا خاندان بھی شمارہ ہوتا ہے۔

افتخار امام صدیقی کے زیر ادارت ماہنامہ شاعؔر نے وقت کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوکر ادبی ماہناموں کی صف میں نیا مقام حاصل کیا ہے۔

افتخار امام صدیقی اُردو کے باخبر مدیر تھے اور وقتاً فوقتاً اُردو دنیا میں رونما ہونے والے حادثات اور تحریکوں سے کماحقہٗ واقفیت رکھتے تھے، جدیدیت کی تحریک ہو، مابعد جدیدیت ہو یا ساختیات پسِ ساختیات، نثری نظم ہو، ہائیکو نگاری یا افسانہ نگاری ہر موضوع پر شاعؔر کے صفحات میں ضروری مواد ملتا ہے۔

شاعؔر کو برصغیر ہندو پاک یہاں تک کہ برطانیہ، جرمنی اور امریکہ میں مقیم اردو شعراء و ادباء کا قلمی تعاون حاصل رہا ہے۔ افتخار امام صدیقی نے مشن کے ساتھ ساتھ شاعؔر کو ایک کاروباری ادارہ میں بدل دیا، اُنھوں نے عالمِ اُردو کی سیکڑوں ہستیوں کا ادبی گوشہ نکال کر اپنی باخبری کا ثبوت دیا ہے۔ اس کارِ خیر کے لئے انھیں یک مشت رقم اور مواد فراہم کرنا ہوتا تھا اور شاعؔر میں شائع ہونے والے فنکار خود کو بڑا فنکار سمجھنے لگتے تھے۔

اس موقع پر راقم الحروف کے نام مرحوم مدیر شاعؔر جناب افتخار امام صدیقی کا مکتوب پیش کرنا میرے لئے اس دعویٰ کو مزید تقویت دیتا ہے۔

لیٹر پیڈ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۴ر ستمبر ۲۰۰۹ء بروز پیر

برادرم نیاؔز سلطانپوری

السلام علیکم

آپ نے فون کیا، بہت شکریہ

ستمبر کا شاعر جمعرات تا جمعہ کو پوسٹ کیا جارہا ہے، کل آج اور کل کیلئے آپ کو ارسال کرنا ہے۔

(۱) پوسٹ کارڈ رنگین تصویر (چہرہ)

(۲) پاسپورٹ سائز رنگین تصاویر کم از کم دو۔

(۳) مکمل سوانحی اشاریہ، آپ کی شادی پر مشاہیر کی آمد سے اقتباسات دو ہزار روپئے کا

شاعؔر کو برصغیر ہندو پاک یہاں تک کہ برطانیہ، جرمنی اور امریکہ میں مقیم اردو شعراء و ادباء کا قلمی تعاون حاصل رہا ہے۔ افتخار امام صدیقی نے مشن کے ساتھ ساتھ شاعؔر کو ایک کاروباری ادارہ میں بدل دیا، اُنھوں نے عالمِ اُردو کی سیکڑوں ہستیوں کا ادبی گوشہ نکال کر اپنی باخبری کا ثبوت دیا ہے۔ اس کارِ خیر کے لئے انھیں یک مشت رقم اور مواد فراہم کرنا ہوتا تھا اور شاعؔر میں شائع ہونے والے فنکار خود کو بڑا فنکار سمجھنے لگتے تھے۔

The Shair DD Mombay کے نام سے شراکت بنام ذیل کے پتے پر بذریعہ رجسٹری ارسال کیجئے، کوشش ہوگی کہ اکتوبر کے شاعؔر میں آپ کی نظم لگ جائے۔

زیادہ خیریت

مخلص

پانچ شام افتخار امام

مدیر شاعر کی اس پیش کش پر میں نے کوئی توجہ نہ دی اور مجھے یہ بات پسند نہ آئی کہ اپنا گوشہ خود پیسہ خرچ کر کے شائع کراؤں، لیکن راقم الحروف شاعؔر کو اپنا قلمی تعاون دیتا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں مرحوم سے خط و کتابت بھی رہی، لیکن آخری عمر میں فون سے خیریت معلوم کر لیتا تھا۔ اُن کا ایک اور خط ذیل کی سطور میں نقل کر رہا ہوں جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیشے کے تئیں کتنے مخلص اور دیانتدار تھے۔

مہر شاعر

۲۲ر اکتوبر ۲۰۰۱ء

محترمی نیاؔز صاحب

آپ کی ایک غزل

اطلس و کمخواب بُنتی تھیں جو پیاری انگلیاں

شاعر کے لئے منتخب کی گئی ہے۔

امید کہ غزل غیر مطبوعہ ہی ہوگی۔

میرا خط ملتے ہی اپنی ایک عدد پاسپورٹ سائز تصویر ارسال کیجئے اور جلد ارسال کیجئے۔

۱۱ر اکتوبر کا شاعر مطالعہ میں آیا ہوگا۔

نومبر کا شمارہ بھی شائع ہوگیا ہے۔

زیادہ خیریت

نیازمند (افتخار امام)

اس کے جواب میں میں نے لکھا:۔

مہر

8.11.2001

محترمی صدیقی صاحب سلام و رحمت

گرامی نامہ مورخہ ۲۲ر اکتوبر ۲۰۰۱ء ہمدست موصول ہوا۔ ذرّہ نوازی کا لاکھ لاکھ شکریہ۔

یہ جان کر از خوشی ہوئی کہ آپ نے شاعر

کے کیلئے میری غزل ''اطلس و کمخواب بُنتی تھیں ۔۔۔منتخب کرلی ہے ۔حسب الحکم ایک عدد پاسپورٹ سائز فوٹو، ایک غیر مطبوعہ غزل ارسالِ خدمت ہے، شاملِ اشاعت کرلیں اور شاعر کو V.V.P. سے ارسال کرنے کی زحمت گوارہ فرمائیں، ازحد ممنون و مشکور ہوں گا۔

فقط والسلام

خیر طلب

نیازؔ سلطان پوری

مہر

محولہ بالا غزل شاعر دسمبر ۲۰۰۱ء ص ۱۹ پر بغیر فوٹو شائع ہوئی ۔اس کے بعد بھی اپریل ۲۰۰۹ء ماہنامہ دسمبر ۲۰۱۹ء کے ذریعہ پروفیسر احمد سجاد کا تعارف اس الفاظ میں کراتے ہیں:۔

''نکلتا قد، چوڑی پیشانی، سوچ میں ڈوبی آنکھیں، تبسم ریز ہونٹ،، شیریں گفتار، باریش چہرے پر علمی وقار، رکھ رکھاؤ میں وضع دار، خوش لباس و خوش اطوار، وقت کے پابند، ہمہ وقت فعّال، دُھن کے پکے، طلباء میں ہر دلعزیز، تعلیمی محاذ کے سپہ سالار، کلام اقبالؔ کے عاشق، قرآن و سنت پر عمل پیرا۔

یہ ہیں جھارکھنڈ کے سرسید، ادبِ اسلامی کے ہمہ صنف قلم کار پروفیسر احمد سجّاد۔

نام احمد سجاد والد محمد نظیر الدین

گھر جنت ڈاکٹر رفعت سجاد (نصف بہتر)

اولادیں: طارق سجاد۔ فیصل سجاد۔ غزالہ پروین۔ رخشندہ پروین۔ شیریں عذرا۔ عائشہ حور۔ (شاعر دسمبر ۲۰۱۹ء)

جرعات، مکتوبات اور کتاب بازار شاعر کا مستقل کالم تھا۔ جُرعات نگاری میں مرحوم کو نمایاں مقام حاصل تھا، وہ کم اور مختصر الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار جس خوبصورتی سے کردیتے تھے وہ اُنھیں کا حصہ ہے۔ کتابوں پر تبصرے بھی بڑے وقیع اور فکر انگیز ہوا کرتے تھے، مکتوبات میں اُن ہی خطوط کو شامل

علم بھر خدوخال، تعقیل بھر چشم، حیرتوں حیرت سوچ ہونٹ بھر خموشی، حرف و لفظ کی ساتھی، مترنم سماعتیں وقار بھر پوشاک، شعر و ادب کی امین، اعتماد بھرا ظہاریے، سنجیدہ مگر خوش گفتار، فکریہ رقبہ جہانوں جہاں بیاض، تحیّر و تجسّس، تفکر، تغیر و تبدل کے اسرار میں گم، اپنوں میں نرالی، پاکستانی تہذیب کی نمائندہ، درس و تدریس کی غوّاص، علم جوئیاں، رنگوں کی پارکھ، خلاؤں سے مکالمہ، زمین زادی، آزادیٔ نسواں کی نقیب۔ یہ ہیں پاکستان کے نسائی ادب کی سفیر شاہین مفتی''

(شاعر مارچ ۲۰۱۸ء)

کیا جاتا تھا جس سے شاعر میں شائع شدہ تخلیقات کا غیر جانبداری سے تنقید و تبصرہ شامل ہوتا تھا۔ لیکن آخر میں مکتوبات کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔

اُنھوں نے اُردو ادب میں متعدد ثقیل اور غریب الفاظ کو اس خوبی کے ساتھ برتا کہ ان کی تقلید میں دیگر شعراء و ادباء نے بھی نت نئے اور غیر مانوس الفاظ کو رائج کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مثلاً شاہین متقی کا سراپا ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

علم بھر خدوخال، تعقیل بھر چشم، حیرتوں حیرت سوچ ہونٹ بھر خموشی، حرف و لفظ کی ساتھی، مترنم سماعتیں وقار بھر پوشاک، شعر و ادب کی امین، اعتماد بھرا ظہاریے، سنجیدہ مگر خوش گفتار، فکریہ رقبہ جہانوں جہاں بیاض، تحیّر و تجسّس، تفکر، تغیر و تبدل کے اسرار میں گم، اپنوں میں نرالی، پاکستانی تہذیب کی نمائندہ، درس و تدریس کی غوّاص، علم جوئیاں، رنگوں کی پارکھ، خلاؤں سے مکالمہ، زمین زادی، آزادیٔ نسواں کی نقیب۔ یہ ہیں پاکستان کے نسائی ادب کی سفیر شاہین مفتی''

(شاعر مارچ ۲۰۱۸ء)

اشتہارات کسی بھی اخبار اور جریدے کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اشتہارات کی بدولت آج بڑے بڑے اخبار اور رسائل تزک و احتشام کے ساتھ نکل رہے ہیں، شاعر کو بھی اشتہارات حاصل ہوتے رہے ہیں جن کی بدولت شاعر کی بروقت اشاعت ممکن ہوسکی ہے۔

آج ہمارے درمیان افتخار صدیقی صاحب موجود نہیں ہیں لیکن ان کی شفقت آمیز باتیں، اردو کی بے لوث خدمات اور انسان دوستی ایک عرصہ تک آسمانِ ادب پر چھائی رہیں گی اور اُردو کی ادبی صحافت مرحوم کی اہمیت و عظمت کا اعتراف ببانگِ دُہل کرتی رہے گی۔

☆☆

ڈاکٹر مشتاق صدف
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پروفیسر مولا بخش

کوئی تجھ سا نہیں اب درمیاں میں

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی 'مولا'
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

۲۱/اپریل ۲۰۲۱ء کو یہ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ پروفیسر مولا بخش ہمارے درمیان سے اٹھ جائیں گے۔ وہ کورونا کی زد میں تھے اور زکریا مارکیٹ کے آئی ٹی ہاسپٹل میں ۱۶/اپریل کو سانس میں شدید دقت آنے کی وجہ سے ایڈمٹ ہوئے تھے۔ میں ۱۷/اپریل کو انہیں دیکھنے ہاسپٹل گیا تھا۔ وہ گہری نیند میں تھے۔ میں نے دور سے ہی انہیں دیکھا اور ان کی اہلیہ زینت صاحبہ سے کہا کہ سونے دیجیے، پھر کبھی آجاؤں گا۔ اس وقت انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہے۔ بعد میں فون پر ان کی خیریت معلوم کرتا رہا۔ دو دنوں بعد زینت بھابی نے بتایا کہ کچھ طبیعت بہتر ہوئی ہے، سانس میں بیس تیس فیصدی اضافہ ہوا ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اگر اسی طرح ان کی باڈی سپورٹ کرتی رہی تو بہت جلد اچھے ہو جائیں گے۔ ہم سب مطمئن تھے کہ وہ جلدی روبہ صحت ہو کر گھر لوٹ آئیں گے لیکن ایڈمٹ ہونے کے چوتھے دن بھابی نے مجھے بتایا کہ اب طبیعت بگڑتی جا رہی ہے۔ سانس لینے میں بہت دقت آرہی ہے۔ باڈی اب پہلے کی طرح سپورٹ نہیں کر پا رہی ہے۔ یہ سن کر کچھ دھڑکا لگا اور دل سے یہ دعا نکلی کہ اے خدا میرے دوست مولا بخش کو شفائے کاملہ عطا فرما۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا ابھی تو ۱۰/اپریل کو ان کے ساتھ ہم شاہ جہاں پور میں بزرگ شاعر خالد علوی کے شعری مجموعے ''تشنگی'' کی رسم اجرا میں گئے تھے۔ ہمارے ساتھ ڈاکٹر معید رشیدی بھی تھے۔ ۱۱/اپریل کو تقریب میں ہم تینوں نے شرکت کی۔ انھوں نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے خالد علوی کے کلام پر عالمانہ گفتگو کی۔ خاکسار اور معید رشیدی نے بھی اس موقع پر اظہار خیال کیا۔ آمد و رفت میں ہم تینوں تقریباً ۱۲ گھنٹے ساتھ ساتھ رہے۔ شاہ جہاں پور میں ایک ہوٹل میں قیام بھی رہا۔ ان کی طبیعت پہلے سے ہی خراب چل رہی تھی۔ میں نے وہاں جانے سے منع بھی کیا۔ انھوں نے ایک دن قبل جانے کا پروگرام ملتوی بھی کر دیا لیکن ۱۰/اپریل کو صبح صبح فون آیا کہ نہیں ہم آج چلیں گے۔ شاہ جہاں پور والوں کا بہت نقصان ہو جائے گا۔ کارڈز چھپ کر تقسیم ہو چکے ہیں اور وہ لوگ بہت فکرمند ہیں۔ میں اپنا کمٹ منٹ پورا کروں گا۔ ہم تینوں ۱۰/اپریل کو وہاں رات میں پہنچے۔ پروگرام میں ہم سب شریک ہوئے۔ میں نے تقریب سے قبل ان سے کہا کہ آج آپ صرف دس پندرہ منٹ ہی گفتگو کریں گے۔ آپ کی طبیعت ناساز ہے، لیکن جب وہ تقریر کرنے لگے تو انہیں یہ بات یاد ہی نہیں رہی کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ وہ چالیس منٹ تک بولتے رہے۔ اس درمیان میں نے دو بار پانی کا گلاس بھی پیش کیا کہ ان کی زبان خشک ہو رہی تھی اور کچھ کھانسی بھی آرہی تھی۔ میں نے اس وقت بھی تقریر ختم کرنے پر اصرار کیا۔ جب وہ تقریر کرنے کے بعد اسٹیج پر

بیٹھے تو ان کا دم پھول رہا تھا۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ ان کی آخری تقریر ہوگی۔ انھوں نے حسب معمول یہاں بھی عمدہ شعری فہم وفراست کا مظاہرہ کیا۔ خوب تالیاں بٹوریں۔ تقریب کے بعد ملنے والوں کا تانتا لگ گیا۔ سب سے وہ بڑے خلوص سے ملتے رہے۔ میں نے ان سے کہا کہ واپس علی گڑھ لوٹنا بھی ہے۔ میری اہلیہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ ابھی گھر سے فون آیا تھا۔ جلدی نکلنے کی کوشش کیجیے۔ انھوں نے کہا کہ اتنی عزت کہاں کسی کو ملتی ہے۔ دل تو کر رہا ہے کہ کچھ دیر اور رکا جائے۔ خیر ہم تینوں اب وہاں سے نکل چکے تھے۔ آمدورفت میں طبیعت کی خرابی کے باوجود وہ ہنساتے رہے، قہقہہ لگاتے رہے اور اپنی گفتگو سے اپنے علم کا لوہا منواتے رہے۔ علی گڑھ میں جب ہم لوگ داخل ہوئے تو کہنے لگے کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ سر میں درد ہے۔ کچھ بخار بھی ہے اور طبیعت بہت بوجھل ہو رہی ہے۔ میں اور معید ہم دونوں نے ان سے کہا کہ کل کسی بھی صورت میں چیک اپ کروالیجے گا، کورونا کا دور ہے۔ محتاط رہنا بہت ضروری ہے۔ انھوں نے ہامی بھی بھر لی لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ٹیسٹ کرانے سے وہ کتراتے رہے۔ رفتہ رفتہ مرض بڑھتا گیا اور ۱۶؍اپریل کو سحری کے وقت انہیں سانس لینے میں جب بہت زیادہ دقت پیش آئی تو انہیں فوراً اسپتال میں داخل کروایا گیا، جہاں ڈاکٹروں نے Ventilator پر ڈال دیا۔ پھر جو ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔

مجھے ۲۱؍اپریل ۲۰۲۱ء کی تاریخ ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس دن صبح آٹھ بجے ان کے انتقال کی اطلاع ان کی اہلیہ زینت صاحبہ نے مجھے فون پر دی۔ انھوں نے روتے ہوئے بس اتنا کہا کہ ''سب کچھ ختم ہوگیا۔ آپ کے دوست اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ہم انہیں ہاسپٹل سے گھر لے جا رہے ہیں۔ میں اب کسی اور کو فون کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ آپ جس کو خبر دینا چاہیں دے دیجیے۔'' یہ خبر سن کر میرے ہوش و حواس اڑ گئے۔ میں ساکت ہوگیا، پھر کچھ دیر بعد میں نے سب سے پہلے شعبۂ اردو کے چیئرمین پروفیسر محمد علی جوہر کو یہ افسوسناک خبر سنائی۔ پروفیسر سید محمد ہاشم، پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر کوثر مظہری، ڈاکٹر خالد سیف اللہ، ڈاکٹر زبیر شاداب اور ڈاکٹر راشد انور راشد کو بھی فون کیا۔ بعد میں سوشل میڈیا کے ذریعے یہ خبر پورے ہندوستان میں پہنچ گئی اور پوری اردو دنیا سوگوار ہوگئی۔ اسی دن بعد نماز عصر یونیورسٹی قبرستان میں انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

مولا بخش انصاری ۱۳؍جنوری ۱۹۶۳ء کو مجھریا، رام گڑھوا، مشرقی چمپارن، بہار کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں حاصل کی۔ ہائی اسکول (۱۹۷۹ء) بہار بورڈ، پٹنہ سے کیا اور پھر بہار یونیورسٹی، مظفر پور سے انٹرمیڈیٹ (۱۹۸۱ء) کرنے کے بعد انھوں نے رانچی یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ جہاں سے بی اے (۱۹۸۴ء) اور ایم اے (۱۹۸۷ء) پاس کیا۔ بعد ازیں انھوں نے دہلی کا رخ کیا اور جے این یو سے ایم فل (۱۹۹۱ء) اور شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی سے ''عہد سرسید کے نثری اسلوب'' کے موضوع پر پروفیسر امیر عارفی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی (۱۹۹۹ء) کی سند حاصل کی۔

پی ایچ ڈی کے زمانے میں ان کے گھر کے مالی حالات اچھے نہیں تھے۔ ملازمت کی تلاش میں برسوں تگ ودو کرنے کے بعد قدرت نے ان کی محنت اور ایثار کو دیکھتے ہوئے کرم فرمائی کی اور وہ دہلی یونیورسٹی کے دیال سنگھ کالج میں لکچرر ہو گئے۔ یہاں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے کئی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ یہاں تیرہ برس نو ماہ درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ پھر اے ایم یو علی گڑھ میں ۲۲؍نومبر ۲۰۱۴ء کو ڈائرکٹ پروفیسر کی حیثیت سے انکی تقرری عمل میں آئی۔ اردو شعبہ میں ڈائریکٹ پروفیسر کی حیثیت سے یہ پہلی تقرری تھی، اس لیے اس زمانہ میں اس کا خوب چرچا رہا۔ ان کے ادبی کارناموں کی فہرست دیکھ کر مجھے بہت حیرانی ہوتی ہے۔ انھوں نے ادبی تنقید، غزل تنقید، فکشن تنقید، نظریاتی تنقید، نثری تنقید اور اسلوبیاتی تنقید کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب پر بھی جم کر لکھا۔ مابعد جدید تنقید اور مابعد جدید ادب کے تعلق سے ان کی خاص پہچان تھی۔ بلکہ یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ معاصرین میں نئی نسل کے مابعد جدید نقادوں

میں ان کا شمار صف اول میں ہوتا ہے۔ان کی تساہلی یہ رہی کہ بہتر سے بہتر کی جستجو میں کتابیں کم منظرعام پر آسکیں۔مضامین تو ان کے سیکڑوں کی تعداد میں قومی اور بین الاقوامی رسائل وجرائد میں شائع ہوئے۔ اگر ان کو ہی وہ یکجا کرتے تو نصف درجن کتابیں چھپ سکتی تھیں۔کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ اب وہ شروع کررہے تھے کہ زندگی نے وفانہیں کی۔اب تک ان کی پانچ کتابیں منظرعام پر آچکی ہیں، جن میں خواجہ محمد اثر (مونوگراف، اردو اکادمی، دہلی)، جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ،خواجہ حسن نظامی کی نثر: ثقافتی لائحہ عمل،خواجہ حسن نظامی (مونوگراف،ساہتیہ اکادمی) اور گراں خواب چینی سنبھلنے لگے (سفرنامۂ چین) شامل ہیں۔ انھوں نے کچھ عمدہ ترجمے بھی ہندی اور انگریزی سے اردو میں کیے ہیں۔

جہاں تک فیملی اور پسماندگان کی بات ہے تو ان کی دوشادیاں ہیں۔پہلی بیوی رخسانہ خاتون سے چار بیٹیاں صداخاتون، شبانہ خاتون،شبنم خاتون،سائرہ خاتون اور دو بیٹے شاہد اقبال اور ثاقب اقبال ہیں۔جبکہ دوسری بیوی زینت پروین سے ایک بیٹا عبدالرحمٰن جامی ہے۔ان کے والد جناب حسیب اللہ انصاری باحیات ہیں اور والدہ بسم اللہ خاتون کی رحلت ہوچکی ہے۔

ان کی عملی زندگی میں کئی مقتدر شخصیات نے اہم رول ادا کیا، جن میں پروفیسر امیر عارفی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، یہی سید نوشاد علی، پروفیسر شافع قدوائی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ان کے حلقۂ احباب کا دائرہ کافی وسیع ہے، ان میں پروفیسر ظل الرحمٰن، پروفیسر خورشید احمد، پروفیسر اے آر قدوائی، پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر کوثر مظہری، پروفیسر سراج اجملی، پروفیسر رضی الرحمٰن، پروفیسر آفتاب عالم آفاقی، ڈاکٹر شیخ محمد عقیل، جناب شعیب رضا فاطمی، ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈاکٹر ارشاد نیازی، ڈاکٹر سرور ساجد، ڈاکٹر زبیر شاداب، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ڈاکٹر نگار عظیم، جناب احمد رشید، ڈاکٹر مشتاق صدف، ڈاکٹر معید رشیدی وغیرہ کے اسم گرامی بطور خاص شامل ہیں۔شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تمام اساتذہ سے ان کا ہمیشہ مخلصانہ رویہ رہا۔ان کی مقناطیسی شخصیت کا ہی یہ اثر تھا کہ ہر شخص خود کو ان سے بہت قریب سمجھتا تھا۔

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

پروفیسر مولا بخش سے میری پہلی ملاقات تقریباً تیس سال قبل ۱۹۹۲ء میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے جھیلم لان میں ہوئی تھی، جب میں وہاں اردو سے ایم اے کا طالب علم تھا۔ پھر دوستی کا ایک طویل سلسلہ چل پڑا۔ وقت گزرتا رہا، دوستی پروان چڑھتی گئی۔ان کے تعلق سے یادوں کی ایک ایسی خوبصورت کہکشاں ذہن و دل میں موجود ہے جسے یہاں بیان کرنے اور اسے کاغذ پر اتارنے کے لیے بہت وقت درکار تو ہے۔ اس درمیان ڈاکٹر کوثر مظہری ہم دونوں کے مشترک دوست بن گئے ۔ہم تینوں کی دوستی بہت مشہور ہوئی۔کبھی کسی ادبی محفل میں ہم لوگوں کا جانا ہوتا تو ساتھ ساتھ جاتے۔ سمیناروں میں ساتھ ساتھ سوال کرتے، ساتھ ساتھ بیٹھتے، یہ مضبوط تثلیث دیکھ کر اردو کے ممتاز شاعر مرحوم مظہر امام بہت معصومیت سے ہم تینوں کو تھری ایڈیٹ (Three Idiot) کہا کرتے تھے۔

مولا بخش شروع سے ہی بہت جینیئس (Genious) تھے۔سمیناروں میں جب وہ سوال کرتے تو کبھی کبھی لوگ ان کا مذاق بھی اڑایا کرتے تھے لیکن انھوں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی بلکہ ہمیشہ لکھتے پڑھتے رہے، سوال کرتے رہے۔ پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ سمیناروں اور ادبی محفلوں پر چھا گئے۔ اب لوگ ان سے سوال پوچھنے لگے۔ اردو کے بڑے بڑے نقاد اور ادیب ان کو سیریس (Serious) لینے لگے۔ان کے مطالعہ کی وسعت کے قائل ہوگئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مولا بخش کا شمار نئی نسل کے نمائندہ نقادوں میں ہونے لگا۔اب تو عالم یہ تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی کوئی ادبی گفتگو کرتے یا خطبہ دیتے تو سب ہمہ تن گوش رہتے۔شعبہ اردو، اے ایم یو کے باصلاحیت استادوں میں سے وہ ایک تھے۔وہ طلبا وطالبات میں بے حد مقبول تھے۔مولا بھائی سے میرا کبھی کبھی اختلاف بھی ہوجاتا لیکن پھر ہم دونوں ایک ہوجاتے۔ گلے شکوے مٹ جاتے۔دراصل

زندگی ہے۔ ادھران کا معمول سا بن گیا تھا کہ دوپہر کو اکثر وہ اپنی تدریسی ذمہ داریوں سے فارغ ہوکر اردو اکادمی آجاتے۔ 'دبستان زبیر' میں گھنٹوں کچھ ادبی اور کچھ نیم ادبی گفتگو ہوتی۔ آج کل وہ ایک ساتھ کئی پروجیکٹس پر کام کررہے تھے۔ بڑی دل سوزی اور عرق ریزی سے تنقیدی اسلوبیات کی دوجلدیں تیار کرلی تھیں۔ ان کی اشاعت کا مرحلہ چل رہا تھا۔ ''اردو تنقید کے مشرقی اور مغربی کنارے''، ''ماحولیات اور ادب''، ''منٹو کا بیانیہ جمال'' اور ''ثقافتی مطالعات'' پر ان کی تصانیف سے ہم سب مستفید ہوتے لیکن ان کا یہ کام ادھورا رہ گیا۔ یہ گوہر شب تاب نقاد اب منوں مٹی کے نیچے دب چکا ہے۔ اٹھاون سال کی عمر کوئی زیادہ عمر نہیں ہوتی۔ ابھی تو ان کو بہت کچھ لکھنا پڑھنا تھا، بہت کچھ کرنا باقی تھا۔

وہ کوئی بھی علمی اور ادبی کام بڑی ذمہ داری، انہماک اور جانفشانی سے کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ بہت سی یادیں دھندلی ہوجاتی ہیں لیکن ان یادوں کے پیچھے جو شخص ہوتا ہے وہ ہمیشہ ذہن میں رہتا ہے۔ مولابخش کا نام بھی میرے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوسکتا۔ میری یادوں کے نیلگوں فلک پر بہت سے واقعات رقصاں ہیں۔ یہاں کس کس کا ذکر کروں۔ مجھے یاد ہے کہ جب وہ ''جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ'' والی اپنی تنقیدی کتاب لکھ رہے تھے تو ان دنوں مجھ سے ان کا بہت رابطہ رہا۔ مجھے وہ اکثر و بیشتر اپنے گھر بلا کر صفحات کے صفحات سنادیا کرتے۔ میں ان کی آنکھوں میں محنت کی داد وصول کرنے کی چاہت کو محسوس کرتا اور خوب داد وتحسین سے نوازتا۔ اس کتاب میں انھوں نے جدید ادبی تھیوری کی تمام گرہوں کو کھول کر رکھ دیا۔ نیز گوپی چند نارنگ کی تنقیدی معتبریت کو پوری اردو دنیا کے سامنے ایک نئے انداز سے پیش کیا۔ یہ کتاب ۲۰۰۹ء میں جب شائع ہوکر آئی تو اس کی پہلی کاپی لے کر ہم دونوں آٹو سے نارنگ صاحب کے گھر پہنچے اور ان کی خدمت میں کتاب پیش کی۔ اس وقت نارنگ صاحب کے چہرے کی تمکنت دیکھنے لائق تھی۔ جب نارنگ صاحب نے کتاب کی خوب تعریف کی، محنت کی داد دی اور تہ دل سے شکریہ ادا کیا تو مولا بھائی کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ بہت خوش تھے۔ دوسرے دن صبح فون پر بتایا کہ خوشی میں مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ انہیں اس بات کی بے انتہا مسرت تھی کہ نارنگ صاحب جیسے قدآور نقاد نے ان کی کتاب کو پسند کیا۔ میں ان دنوں ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی میں پروگرام آفیسر تھا۔ میں نے مولا بھائی سے ساہتیہ اکادمی کے معمار ادب سیریز کے تحت خواجہ حسن نظامی پر ایک مونوگراف بھی لکھوایا جسے ادبی حلقوں میں خوب سراہا گیا۔ بعد میں خواجہ حسن نظامی پر ان کی دوسری مبسوط کتاب ''خواجہ حسن نظامی کی نثر: ثقافتی لائحۂ عمل'' بھی منظرعام پر آئی۔ اس کام کی آج بھی پذیرائی ہوتی ہے۔

دریں اثنا ساہتیہ اکادمی کی جانب سے مختلف زبانوں کے ادیبوں کے ایک وفد کو چین جانے کی سرکار نے منظوری دی تو اردو کی نمائندگی کے لیے کئی نام سامنے آئے لیکن گوپی چند نارنگ نے اس ناچیز سے رائے لی اور پھر مولابخش کے نام پر مہر لگادی۔ مولا بھائی نے چین کا یادگار سفر کیا، بعد میں انھوں نے اس سفر کی پوری روداد لکھی جو 'گراں خواب چینی سنبھلنے لگے' کے نام سے سفرنامہ کی شکل میں منظرعام پر آیا۔ ان کا یہ سفرنامہ اردو سفرناموں کی تاریخ میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

برسوں لگی رہی ہیں ان مہر و مہ کی آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب صاحب نظر بنے ہے

مولابخش پر یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے۔ صاحب نظر بننے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ مولابخش خود کمہار بھی تھے اور چاک بھی۔ انھوں نے کمہار کی طرح اپنی زندگی میں بڑی جانفشانی کی اور چاک کی طرح خود کو سنوارا اور نکھارا بھی۔ ان کا تعلق جس مٹی سے تھا اس مٹی کو سونا انھوں نے خود بنایا۔ ان کی زندگی کے سفر کی ایک لمبی داستان ہے۔ اپنے ایک انٹرویو میں انھوں نے خود کہا تھا کہ اگر میں پروفیسر نہ ہوتا تو ایک ٹیلر ماسٹر ہوتا۔ اس بات کا اظہار وہ اکثر ہم لوگوں سے بھی کیا کرتے تھے۔ انہیں اپنی زندگی کی حقیقت بتانے میں کوئی شرم اور ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی۔ وہ جب دہلی آئے تو اپنی گزربسر کے لیے ٹیلرنگ (Tailoring) کا کام کیا، لیکن اعلیٰ تعلیم کے حصول کا جنون ان پر ہمیشہ طاری رہا۔ دراصل ان کی زندگی ایک چڑھتے

ہوئے 'نالے' کی مثل شروع ہوتی ہے اور ندیوں سے گذر کر سمندر کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ وہ بعض دفعہ فاقہ کشی سے بھی دوچار ہوئے، لیکن ہمت کبھی نہیں ہاری۔ آگے بڑھتے گئے۔

پروفیسر مولا بخش مجموعۂ خوبی تھے۔ وہ یاروں کے یار اور شاگردوں کے لیے مشفق استاد تھے۔ وہ اپنے بڑے بزرگوں کے ہمیشہ وفادار رہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے ادبی وتنقیدی میدان کے شہسوار بھی تھے۔ معاصر تنقید نگاروں میں وہ ایک ایسے دانشور تھے جن کو تمام تر تحریکات پر دسترس حاصل تھی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ کسی بھی موضوع پر گھنٹوں بولنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ جس محفل میں بھی ہوتے وہ محفل ہنسی اور قہقہوں سے گلزار ہو جایا کرتی تھی۔ ہماری ادبی محفلوں کی وہ روح رواں ہوا کرتے تھے۔ ان کی وقتی غیر حاضری کا بھی ہم سب نوٹس لیتے تھے۔ اب وہ ادبی محفلوں سے ہمیشہ غیر حاضر رہیں گے، یہ سوچ کر ہم سب ایک عجیب سی ذہنی کیفیت سے دوچار ہیں۔ انہیں ادیبوں کے بہت سے لطیفے یاد تھے جو حسب ضرورت سناتے رہتے۔ گفتگو میں وہ چھوٹے بڑے کا خیال رکھے بغیر سب کچھ کہہ دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ ہنسی مذاق میں بہت حساس بھی ہو جایا کرتے تھے، لیکن کبھی کسی کی ذات پر حملہ نہیں کرتے تھے۔ بشری کمزوریاں سب میں ہوتی ہیں، ان میں بھی تھیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ ان کا اختلاف جن لوگوں سے رہا ان کے بارے میں وہ کبھی فحش باتیں نہیں کرتے تھے، وہ بہت حساس مزاج تھے۔ کسی کی تکلیف سنتے تو پریشان ہو جاتے۔ وہ ہر فرد کو جینے کا خوب حوصلہ دیتے۔ وہ کسی کے لیے کچھ کرتے یا نہیں کرتے لیکن یہ ان میں بہت اچھی عادت تھی کہ وہ ہمت دلاتے جاتے۔ وہ غریبوں کی مدد بھی بڑی خاموشی سے کیا کرتے تھے۔ وہ سخی تھے، اور خدا سخی کو بہت پسند کرتا ہے۔

خدا نے انہیں سحر زدہ کرنے والی آواز کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ وہ شاعر بھی تھے۔ ان کا تخلص 'اسیر' تھا۔ اس لیے وہ اپنا نام کہیں کہیں مولا بخش اسیر بھی لکھا کرتے تھے۔ وہ اپنے کلام کو اکثر مشاعروں میں یہ کہہ کر سناتے کہ ''میں ترنم کے لیے شاعری کرتا ہوں تو لیجئے ترنم حاضر ہے۔'' یہ ان کی انکساری تھی۔ ان کا کوئی شعری مجموعہ منظر عام پر نہیں آیا۔ انھوں نے مختصر کلام کہا لیکن جب شعری نشستوں اور ادبی محفلوں میں سناتے تو خوب داد وصول کرتے۔ فرائڈے کلب کی وہ جان تھے۔ اب کلب کی ادبی نشستوں میں کون رنگ بھرے گا؟ وہ اکثر اس بات کا ذکر بھی کرتے تھے کہ ناگفتہ بہ حالات میں پیسوں کے لیے انھوں نے آرکیسٹرا (Orchestra) میں بھی خوب فلمی گانے گائے ہیں۔ حالانکہ ان کے والد اس کو ناپسند کرتے تھے۔ ذاتی محفلوں میں وہ دوستوں کے اصرار پر کبھی کبھار فلمی گانے اور غزلیں سنایا بھی کرتے تھے۔ ان کی ایک غزل مجھے بہت پسند ہے جو اکثر میں ان سے فرمائش کر کے سنتا تھا۔ اس کے دو اشعار آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

گھومتی پھرتی ہیں خواہش کی ہزاروں پریاں
جسم میرا بھی کوئی شیش محل ہو جیسے

موت ایک ایسی پہیلی کہ سمجھنا مشکل
زندگی خواب میں چلنے کا عمل ہو جیسے

ادب میں وہ ایک بہت ہی سرگرم اور فعال پروفیسر رہے۔ دو سو سے زائد نیشنل اور انٹرنیشنل سمیناروں میں شرکت کی۔ ان کے ڈیڑھ سو سے زائد مضامین اردو کے موقر ادبی رسائل وجرائد میں شائع ہوئے۔ تقریباً پچاس لکچرز دیے، تقریباً تین درجن ورکشاپ میں حصہ لیا۔ پچاس سے زیادہ انھوں نے ریڈیو کے مختلف پروگراموں میں اپنی موجودگی درج کروائی۔ ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں کئی انجمنوں اور اردو اکادمیوں نے اپنے انعامات واعزازات سے بھی نوازا۔ جن میں دہلی اردو اکادمی کا ''تحقیق وتنقید ایوارڈ ۲۰۱۱'' قابل ذکر ہے۔

مولا بھائی ابھی تو آپ کو ادب کے بہت سارے معرکے سر کرنے تھے۔ شہرت کی بہت سی بلندیوں تک پہنچنا تھا۔ ابھی تو سلیکشن کمیٹیوں میں جانا شروع کیا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ ساہتیہ اکادمی ایڈوائزری بورڈ کے ممبر رہے، نیشنل بک ٹرسٹ کے پینل ممبر، این سی پی یو ایل کے رکن، این آئی او ایس کے ممبر اسکریننگ، خواجہ معین الدین بھاشا یونیورسٹی اور دین دیال اپادھیائے

یونیورسٹی گورکھپور کے بورڈ آف اسٹڈی کے ممبر کی حیثیت سے کام کیا لیکن یہ تو آپ کی اسکالرشپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، ابھی تو آپ کے کئی خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونا تھا۔ ابھی تو بیٹیوں اور بیٹوں کی شادیاں کرنی تھیں، ابھی تو آپ کی علمی وادبی کارناموں پر داد وتحسین کے ڈونگرے بجنے شروع ہی ہوئے تھے۔ مولا بھائی ابھی تو ہم سب آپ کے بہت سارے ادبی کارناموں کے منتظر تھے لیکن نہ جانے کیوں آپ روٹھ گئے۔ آپ نے تو رامپور رضا لائبریری میں امتیاز علی خاں عرشی میموریل لکچر دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ ایک ساتھ مل کر کئی کام کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ گوپی چند نارنگ پر میری آنے والی کتاب کا مقدمہ لکھنے والے تھے۔ چھ سال پہلے ہی تو آپ نے زندگی سے ایک جنگ جیتی تھی اور نئی زندگی کی شروعات کی تھی۔ جس حوصلہ، امنگ، چاہت، تمنا اور جستجو کے ساتھ کچھ کرتے رہنے کا عزم کیا تھا مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا۔ ماہ رمضان میں اچانک آپ کا رخصت ہونا ایک ایسا واقعہ ہے جسے کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ آپ نے آخری رخت سفر ماہ رمضان میں باندھا۔ یہ دیکھ کر اتنا تو ضرور اطمینان ہوا کہ آپ پر خدا کی خاص رحمت ہے۔

مولا بھائی آپ نے کبھی مجھ سے مذاقاً کہا تھا کہ اگر میں آپ لوگوں سے پہلے ہجرت کر گیا تو مجھے یاد کیجئے گا نا؟ یاد ہے میں اس وقت آپ سے ناراض ہو گیا تھا۔ پھر آپ نے اپنی بات واپس لے لی تھی۔ آج وہ باتیں یاد کر کے بہت غم زدہ ہوں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے کہنے کے لیے۔ بس میری طرف سے آپ کے لیے یہ ایک منظوم خراج عقیدت ہے:

بہت سے لوگ آئے اس مکاں میں
کوئی ثانی نہیں تیرا جہاں میں

ترے رختِ سفر کا وقت ہے یہ
کبھی آیا نہیں وہم وگماں میں

شکستِ زندگی آساں نہیں تھی
ملی تھی جیت تم کو خوں فشاں میں

ترے جانے کا غم دل میں ہے ایسا
کہ جیسے تیر الجھا ہوا ہو کماں میں

خموشی چھا گئی، آنکھیں ہوئیں نم
کہ سب کچھ گم ہوا آہ وفغاں میں

تمہاری باتیں اک اک یاد کر کے
بہت روئیں گے ہم تیرے زیاں میں

ادب کے تم شناور، تم تھے ناقد
تمہیں ہم یاد رکھیں گے بیاں میں

ہنسی اور قہقہوں کے تم ولی تھے
کوئی تجھ سا نہیں اب درمیاں میں

ہمارے واسطے شب تاب تھے تم
اندھیرے سے بھرے دورِ گراں میں

میں کیسے دل کو سمجھاؤں بتادو
مجسم تم ہوئے دردِ نہاں میں

ترے انداز میں یہ پوچھتا ہوں
ترا دل لگ گیا کیا لامکاں میں

صدف ہجر و وصال یار کیا ہے؟
مسافر ہم بھی تم بھی اس جہاں میں

پروفیسر مولا بخش نے ہمیشہ ادبی اقدار کے عرفان پر اصرار کیا اور سخن فہمی کے تقاضوں کو بڑی گہرائی سے سمجھا۔ حالی، شبلی، کلیم الدین احمد، اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، محمد حسن عسکری، آل احمد سرور، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، قاضی افضال حسین، ابوالکلام قاسمی، خورشید احمد، شافع قدوائی وغیرہ جیسے قد آور نقادوں کی دانشورانہ روایت کا غائر مطالعہ کیا پھر اپنی راہ ہموار کی۔ اردو تنقید کے نئے آفاق کو روشن کیا۔ ادب میں 'بت ہزار شیوہ' کو نمایاں کیا۔ مشرقی روایت اور علم و دانش کے جدید رجحانات پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کا ادبی ذوق بلا کا تھا۔ کشادہ ذہنی رگ رگ سے جھلکتی تھی۔ آزادیِ اظہار، جرأت اظہار اور متن کے معروضی مطالعہ پر ان کا فوکس ہوتا تھا۔ ان کی بعض تنقیدی تحریریں تو ایسی ہیں جن کے مطالعے سے نصف صدی کا قصہ آنکھوں میں رقص کرنے لگتا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے اپنے ایک مضمون 'آل احمد سرور: پیرِ مغاں ہے مردِ خلیق' میں ڈاکٹر گیان چند جین کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''سرور صاحب کو دشمن بنانے میں کمال حاصل ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر سطح

کا اور ہر عمر کے لوگوں میں سرور صاحب کی عزت اور احترام کرنے والے کثرت سے نکلیں گے لیکن اگر آپ کے پاس سوچنے والا ذہن ہے اور آپ جرأت اظہار سے بہرہ اندوز ہیں، یعنی کلمۂ حق کہنے پر قادر ہیں تو مخالفت نہیں ہوگی تو کیا ہوگا'' کم وبیش یہی معاملہ مولا بخش کا بھی تھا۔ انھوں نے جرأت اظہار سے کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اپنی تحریروں میں بھی اور اپنی تقریروں میں بھی۔ وہ وہی بات کرتے تھے جو حق ہوا کرتی تھی۔ مولا بخش نے ادب میں ادعائیت اور محدود ادبی موقف کو رد کیا۔ ذہنی آزادی پر قدغن لگانے والوں کی خوب خبر لی۔ ان کی ترجیحات دوسروں کی طرح منشوری نوعیت کی نہیں تھیں۔ اس لیے بہتوں نے انہیں ناپسند بھی کیا لیکن مولا بخش نے ان سے الجھنے کے بجائے تحریری طور پر جواب دیا۔ اپنی فکر کو انگیز کرنے کے ساتھ ادب کے عرفان کو عام کرنے پر زیادہ وقت صرف کیا اور یہی وہ خوبی تھی جس نے مولا بخش کو کندن بنا دیا۔

مولا بخش کا انتقال اہلِ اردو کے لیے ایک بڑا خسارہ تو ہے ہی میرا ذاتی نقصان بھی ہے۔ میرے لیے یہ ایک ایسے دوست کا انتقال ہے جو مجھ سے لڑتا بھی تھا اور مجھ پر مرتا بھی تھا، جو روٹھ بھی جایا کرتا تھا اور منا بھی لیا جاتا تھا۔ میری زندگی کے ایک اہم موڑ پر رہنمائی کے ساتھ مدد بھی کی۔ وہ اردو کے مے خانوں میں کبھی ہنگامہ آرائی بھی کرتا تھا اور کبھی ساقی بن کر رندوں کو پیت اور پریت کی مے بھی پلاتا تھا۔ وہ سراپا محبت بھی تھا اور تنقید کا استعارہ بھی۔ وہ دوستوں کے لیے چٹان کی طرح ہمیشہ کھڑا بھی رہتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ مولا بخش کی موت ہو چکی ہے لیکن میری طرح بہت سے ان کے چاہنے والے ایسے بھی ہیں جنہیں ان کی موت کا یقین اب تک نہیں ہو سکا ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ ''لوگوں کو آزماؤ نہیں ورنہ اکیلے رہ جاؤ گے۔'' میں نے یہی سوچ کر اپنے اس دوست مولا بخش کو کبھی نہیں آزمایا۔ اچھے سے اچھے دوست وقت کے ساتھ ساتھ بدل جاتے ہیں، موسم کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ دھوپ چھاؤں دیکھ کر پیراہن بدل لیتے ہیں لیکن یہ مولا بخش کی شخصیت تھی کہ کبھی خود کو نہیں بدلا۔ اپنے املے کو ہمیشہ درست رکھا۔ اپنی صرف ونحو کو میلا نہیں ہونے دیا۔ وہ تنازعات اور الزامات کے کٹہرے میں بھی کھڑے ہوئے لیکن بری بھی ہوئے۔ ان کی شخصیت میں شہادت کا مژدہ بھی تھا اور حیاتِ جاوداں کی بشارت بھی۔ انھوں نے ادب اور زندگی کے گہر ہا رمقاصد کے حصول کے لیے نقد جاں کو بھی ٹھکانے لگا دیا لیکن فتح کو یقینی بنایا۔ ایسے بے مثل دوستوں کی اب تعداد سمٹتی جا رہی ہے۔ میں نے حالی کو تو نہیں دیکھا لیکن مولا بخش کو ضرور دیکھا ہے جنھوں نے ان کی تنقیدی روایت کو ایک کڑی کی حیثیت سے اپنی تحریروں میں روشن کر رکھا تھا۔ معاصر تنقیدی منظر نامہ میں اس ایک کڑی کے ٹوٹ جانے سے اردو کے ساتھ ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی ممکن ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

پروفیسر مولا بخش کی زندگی کلاسیکی فارسی شاعر فرخی سیستانی اور اردو شاعر احسان دانش کی طرح کانٹوں بھری گذری لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے تمام نشیب وفراز اور سرد وگرم زمانہ سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اپنی صلاحیتوں سے سب کو متاثر کیا۔ اپنے حوصلوں کی بلند تمثیلوں اور خوابوں کی نیرنگیوں کو حقیقت میں بدلنے کے لیے روز وشب محنت کی اور آخر کار کامیابی کی کئی منزلیں سر کیں۔ ان کی موت فطرت انسانی سے عبارت ہے۔ ہر شخص جینا چاہتا ہے، مرنا کسی کو پسند نہیں لیکن یہ قانون فطرت ہے کہ سب کو ایک دن موت کا مزہ چکھنا ہے۔ سچ پوچھیے تو جینے کا اصل مزہ مرنے سے ہے 'نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا'۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن وہ اپنی تحریروں اور ہمارے ذہنوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

☆☆

پروفیسر خالد محمود
ڈی ڈی اے فلیٹ پاکٹ۔۹، فلیٹ نمبر بی۔۲۰
ڈسولا، نیو دہلی

مکتبہ جامعہ شاہد علی خاں لمٹیڈ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب شاہد علی خاں صاحب مکتبہ جامعہ لمٹیڈ کے جنرل مینیجر ہوا کرتے تھے۔ان دنوں مکتبہ جامعہ قدیم طرز کی اس چھوٹی سی دومنزلہ عمارت کا نام تھا، جو جامعہ ٹیچرس کالج اور ''سیدین منزل'' کے درمیان جلوہ گہِ خاص و عام بنی ہوئی تھی۔ یہ عمارت اپنے اندر اس قدر جذب و کشش رکھتی تھی کہ اس کے نزدیک سے گزرنے والا ہر شخص اس کی سادگی میں پوشیدہ آن بان اور شان کے آگے سر عقیدت خم کر دیتا اور اس کے بڑے سے بورڈ پر مکتبہ جامعہ لمٹیڈ لکھا ہوا دیکھ کر سرِ مسرت بلند کرتا ہوا گزرتا۔اس عمارت کی نچلی منزل کے تین کمروں میں کتابیں آباد تھیں اور اوپری منزل کے دو کمروں میں شاہد صاحب کی فیملی قید تھی۔اوپر ایک بڑا سا ہال بھی تھا۔(بڑے ہال سے میرا مطلب ہے دوسرے کمروں سے بڑا) جس نے ایک چھوٹی سی کوٹھری اپنی بغل میں دبا رکھی تھی۔ یہ ہال زیادہ بڑا نہ سہی مگر پورا کا پورا مکتبہ اسی میں سمٹ کر آ گیا تھا۔اس ہال کے ایک کونے میں مکتبہ جامعہ کے جنرل مینیجر شاہد علی خاں ایک ایسی ٹیبل کے پیچھے بیٹھتے تھے جو عمر و عیار کی زنبیل سے کسی طور کم نہ تھی۔اس پر کیا نہ تھا؟ کتابیں، رسائل، مسودے، فائلیں، کتابت شدہ اور غیر کتابت تخلیقات، ٹائپل، تصاویر، کھلے خط، بے کھلے خط، موصول شدہ خطوں کے جوابات اور ان خطوں کے جوابات بھی جو ابھی موصول نہیں ہوئے تھے۔ کتاب نما اور پیام تعلیم کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخے، قلموں کا ہجوم سب اسی پر تھا۔اس کے علاوہ سگریٹ کے اتنے پیکٹ، جن کی تعداد ہمارے آپ کے گناہوں سے کسی طرح کم نہ ہوگی، ہمہ وقت پڑے رہتے تھے۔اسی ٹیبل پر ایک ایش ٹرے بھی تھی جو ہر وقت ایش (سگریٹ کی راکھ) کی منتظر رہتی مگر ایش کے بدلے عیش کرتی۔شاہد صاحب سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑنے کے قائل ہی نہ تھے۔راکھ آزاد تھی۔اس کا جب جہاں اور جس وقت جی چاہتا از خود گر جاتی۔مکتبہ کی تمام برانچوں کے ضروری اور غیر ضروری کاغذات بھی اسی ٹیبل پر باہم دست و گریباں رہتے تھے۔اس کے باوجود جس کاغذ کی ضرورت ہوتی شاہد صاحب چشم زدن میں اسی بھیڑ سے صاف نکال لیتے۔

اس ٹیبل کی قدامت کے بارے میں (دروغ بر گردن راوی) جامعہ کے سب سے معتبر اور مستند محقق جناب عبداللطیف اعظمی صاحب کا خیال تھا کہ یہ اماں حوّا کے جہیز میں جنت سے آئی تھی۔اولاد آدم کی میراث تھی، اس پر سب کا حق تھا مگر شاہد صاحب کے خوف سے کوئی زبان نہیں کھولتا (واللہ اعلم بالصواب) اسی ٹیبل پر ہڑپّا موہنجوداڑو کی کھدائی سے نکلے ہوئے چائے کے ایک طویل القامت کپ نے بھی اپنی مستقل جگہ بنا رکھی تھی۔اس کپ میں ایک سیال سی کریہہ المنظر کالی کلونٹی شے ہر وقت انڈیلی جاتی تھی۔ جسے مکتبہ والے خدا انھیں سچ بولنے کی توفیق دے، چائے کہتے تھے، اس ''غارت گرِ خوش گوار موڈ'' کو دیکھتے ہی ہم میں سے بعضوں کے منھ کا مزا اور بعضوں کا پورا منھ بگڑ جاتا، پھر جب وہ شے سرد ہوتے ہوتے برف کے ہم رتبہ ہو جاتی تو شاہد صاحب اس میں سگریٹ کا دھواں گھول کر سارا دن خشوع و خضوع کے ساتھ پیتے رہتے تھے۔شاہد صاحب کے بارے میں ہمارا آبزرویشن یہ ہے کہ وہ جب مکتبہ کے کاموں میں مصروف ہوتے تو ان کا استغراق، انھیں عشق کی اس منزل تک لے جاتا جہاں ہستی اور نیستی میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔اس عالم میں انھیں سے بعضوں کے منھ کا مزا اور بعضوں کا پورا منھ

بگڑ جاتا، پھر جب وہ شے سرد ہوتے ہوتے تھے ہوئے اس کا احسان اٹھانا ان کی غیور طبیعت کو برف کے ہم رتبہ ہوجاتی تو شاہد صاحب اس اس گوارا نہ تھا۔ پٹھانوں کی غیرت سے کون میں سگریٹ کا دھواں گھول کر سارا دن خشوع و واقف نہیں۔ کبھی کبھی ہم جیسے مستقل حاضر خضوع کے ساتھ پیتے رہتے تھے۔ باشوں کو اس دلچسپ صورت حال سے بھی

شاہد صاحب کے بارے میں سابقہ پڑتا جب مکتبہ کا اسٹاف ہر نو وارد کی اس ہمارا آبزرویشن یہ ہے کہ وہ جب مکتبہ کے خواہش پر کہ شاہد صاحب سے ملاقات کرنی کاموں میں مصروف ہوتے تو ان کا ہے بیک جنبش زبان یہ کہتے ہوئے پانی پھیر استغراق، انھیں عشق کی اس منزل تک لے دیتا کہ شاہد صاحب موجود نہیں۔ اور شاہد جاتا جہاں ہستی اور نیستی میں کوئی فرق باقی صاحب سر جھکائے ہوئے اطمینان سے اپنے نہیں رہتا۔ اس عالم میں انھیں یہ خبر ہی نہیں کام میں مصروف رہتے۔ ایک بار انھوں نے ہوتی تھی کہ چائے کے نام پر انھیں کیا پلایا جا ہمارے استفسار کے منھ پر اس جملے کا سیلوٹیپ رہا ہے۔ یوں بھی مکتبہ کے ذائقے نے ان چپکا دیا تھا کہ اگر میں دن بھر لوگوں سے ملتا رہا کے ہر ذائقے کو اپنے اثر میں لے رکھا تھا۔ تو مکتبہ کا کام کون کرے گا۔ یہی حال سگریٹ نوشی کا تھا دھواں منھ میں جاتا

محل وقوع کے اعتبار سے شاہد اور اپنا سا منھ لے کر پلٹ آتا۔ حلق سے علی خاں کے مکتبہ کا جغرافیہ کچھ یوں بنتا ہے اترنے کی ہمت ہی نہ ہوتی۔ بعض اوقات کہ اس کی عمارت کے عقب میں جانب انگلیاں یا ہونٹ جل جاتے تب انھیں اطلاع مغرب جامعہ کے مکانات تھے۔ تین ملتی کہ سگریٹ کی شرارت ہے۔ ان کا اطراف میں عمارت سے بھی بڑا سرسبز لان دایاں ہاتھ، سگریٹ، قلم اور چائے کی دست تھا۔ چاروں طرف قد آدم دیوار تھی اور صدر گیری کرتا اور ان کا دل، دماغ اور آنکھیں دروازہ اس کشادہ گلی میں کھلتا تھا جسے گل مہر اوراق مکتبہ کی ورق گردانی۔ کبھی دیکھا تو نہیں انکلیو کہتے ہیں۔ اسی انکلیو میں ڈاکٹر عابد مگر شاید ایسا بھی ضرور ہوا ہوگا کہ قلم منھ میں حسین، صالحہ عابد حسین، اور پروفیسر صغرا دبا کر سگریٹ سے لکھنے لگے ہوں۔ مکتبہ مہدی کی رہائش گاہ ''عابد ولا'' ہے۔ اسی جامعہ کے جس ہال میں شاہد صاحب کی ٹیبل یا میں محترمہ سیدہ سیدین حمید ''سیدین منزل'' میز تھی اسی ہال میں اللہ کے بنائے ہوئے کچھ میں رہتی ہیں اور اسی میں مکتبہ کے بالمقابل اور لوگ بھی بحیثیت کارکنان بیٹھتے تھے۔ اس سابق صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین ہال کی ایک انفرادیت یہ تھی کہ یہاں بلند آواز مرحوم کا دولت کدہ واقع ہے۔ گل مہر انکلیو کی سے بھی سازش ممکن تھی۔ شاہد صاحب سننے اسی بارونق گلی میں شاہد صاحب نے مکتبہ کے قائل ہی نہ تھے۔ آلۂ سماعت ہوتے جامعہ کا وہ رنگ جما رکھا تھا کہ اردو والوں کی آنکھیں ہمیشہ ادھر ہی لگی رہتیں۔ اُس عہد کا کون سا اہل قلم ہوگا جس نے مکتبہ کے دیدار کی سعادت حاصل نہ کی ہو۔ مکتبہ کے دیدار کا مطلب شاہد صاحب کا دیدار بھی تھا۔

کہنے کو تو شاہد علی خاں مکتبہ کے جنرل مینیجر ہی تھے مگر وہ منصب و نصب کی پروا کیے بغیر ضرورت کے مطابق مکتبہ کے سارے کام خود کر لیتے۔ چنانچہ وہ مکتبہ کی سربراہی بھی کرتے اور بوقت ضرورت دفتری بھی بن جاتے۔ کتاب نما اور پیام تعلیم کے ایڈیٹر بھی تھے اور ریکارڈ کیپر بھی۔ صفائی کرم چاری اور چپراسی کا کام کرنے میں بھی انھیں کوئی قباحت نہ تھی۔ جب مکتبہ کے پاس ایمبیسیڈر کار تھی تو اس کے ڈرائیور بھی خود ہی ہوا کرتے تھے۔ چوبیس گھنٹے کے پاسبان بھی وہی تھے۔ انھیں ہر وقت مکتبہ کا خرچ بچانے اور آمدنی بڑھانے کی دھن سوار رہتی تھی۔ دراصل سارا معاملہ عشق کا تھا۔ عشق فطرتاً اذیت پسند اور صبر طلب ہوتا ہے مگر عاشق کو اسی میں لذت محسوس ہوتی ہے۔ شاہد صاحب نے صبر بھی کیا اور صعوبتیں بھی اٹھائیں جیسا کہ اس راہ میں ہوتا آیا ہے مگر چوں کہ وہ فنافی المکتبہ تھے اس لیے انھیں اپنی صعوبتوں سے کبھی کوئی گلہ نہ ہوا۔ البتہ مکتبہ کو چوٹ پہنچتی تو وہ تلملا اٹھتے اور چوٹ پہنچانے والے کی شامت آجاتی۔

شاہد صاحب فطرتاً مجلسی آدمی ہیں مگر جب مکتبہ کے کسی کام میں مصروف ہوں یا خصوصاً پیام تعلیم مرتب کر رہے ہوں اس وقت دخل در معقولات پسند نہیں کرتے

موقع پر یکسوئی قائم رکھنے کی وجہ سے کسی غیر سے ملاقات یا فون پر بات کرنا انھیں گراں گزرتا۔ اگر کوئی فون ان کے نام آتا اشارے سے منع کر دیتے۔ اگرچہ کتاب نما کو فہرست کتب سے ادبی رسالہ انھوں نے ہی بنایا تھا، مگر انھیں پیام تعلیم زیادہ عزیز تھا۔ پیام تعلیم میں بغرض اشاعت آنے والے مضامین اور خصوصاً بچوں کی تخلیقات نہایت غور سے دیکھتے تھے۔ حرف حرف پڑھتے اور سرخ روشنائی سے اصلاح کرتے جاتے۔ بچوں کو برابر خط لکھتے ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ بہت زیادہ کاٹ چھانٹ پر کوئی کہہ اٹھتا کہ یہ مضمون تو بالکل سرخ ہوگیا ہے تو فوراً جواب دیتے ہر بڑا ادیب بچپن میں ایسی ہی غلطیاں کرتا ہے۔ میں نے کئی بڑے ادیبوں کی ابتدائی تحریریں دیکھی ہیں۔ یہی بچے اردو کا مستقبل ہیں۔ انھیں میں سے سردار جعفری، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی اور ظ۔ انصاری پیدا ہوں گے۔ شاہد علی خاں کی دو بیویاں تھیں ایک میمونہ شاہد دوسری مکتبہ شاہد۔ ایک سے نکاح کیا تھا دوسری سے عشق۔ دونوں سے پانچ اولادیں ہیں۔ عابد، تسنیم، ماجد، کتاب نما، پیام تعلیم، آخرالذکر دو اولادیں مکتبہ سے ہیں۔

شاہد علی خاں نہایت خوبصورت، خوش وضع، خوش مزاج، خوش اخلاق، دراز قامت، سادہ لوح، جامہ زیب اور مضطرب شخصیت کے مالک ہیں۔ پینٹ شرٹ، ٹی شرٹ اور ٹائی کوٹ ہر لباس ان پر خوب سجتا ہے۔ جب سی پٹھانی سوٹ پہن لیتے ہیں تو سوٹ کی قیمت فضا بڑھ جاتی ہے۔ بہت سی خواتین کتابوں کے بہانے انھیں دیکھنے مکتبہ آتیں مگر میمونہ بھابی پر نظر پڑتے ہی فوراً کتابیں خرید کر نامراد چلی جاتیں۔

۱۹۷۶ء میں آج سے ٹھیک چالیس سال پہلے جامعہ ہائر سیکنڈری اسکول میں بحیثیت اردو پی جی ٹی میرا تقرر عمل میں آیا تو سب سے پہلے مظفر حنفی صاحب، حنیف کیفی صاحب اور صغرا مہدی صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ میری طرح ان تینوں کا بھی بھوپال سے تعلق رہ چکا تھا اس لیے ذاتی طور پر میں ان سے واقف تھا۔ ملازمت جوائن کرنے کے بعد سب سے پہلے شاہد علی خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے ملاقات کی۔ وہ دن اور آج کا دن شاہد صاحب کے خلوص و محبت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ میں نے بھی ان کے احترام میں کوئی کسر اٹھا کر نہیں رکھی۔ پہلی ملاقات کا پودا بڑھتے بڑھتے تناور درخت بن گیا، اور اس کے سائے میں دیکھتے ہی دیکھتے چالیس برس گزر گئے۔ اس دوران یہ تو ضرور ہوا کہ مختلف مصروفیات کے باعث کئی بار ملاقاتوں کا وقفہ طویل ہوگیا، اور اس میں پہلے جیسی شدت باقی نہیں رہی، مگر حدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ شاہد صاحب نے جب مکتبہ چھوڑا تو وہاں میری آمد و رفت بھی سرد پڑ گئی، اُدھر پاؤں ہی نہیں اٹھتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ یہ سلسلہ بالکل ہی منقطع ہوگیا۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ مکتبہ کی ساری کشش کا راز شاہد صاحب کے وجود میں پنہاں تھا۔ گویا ایک طلسم تھا جو ٹوٹ گیا۔ تاہم ان سے جو تعلق تھا وہ قائم رہا اور انشاءاللہ قائم رہے گا۔

شاہد صاحب کے عہد میں مکتبہ جامعہ شاعروں، ادیبوں، طالب علموں اور اساتذہ کے لیے ایک زیارت گاہ سے کم نہ تھا۔ بہت لوگ آتے جاتے رہتے کچھ ہم جیسے مستقل حاضر باش بھی تھے جو اکثر آتے اور خوب دل لگا کر بیٹھتے شاہد صاحب خود بھی ہمارے منتظر رہتے۔ ہم نہیں پہنچتے تو بلوا لیے جاتے اور پھر شاہد صاحب کے قہقہوں اور حاضر باشوں کے جوابی قہقہوں کا دور چلتا۔ ساری محفل دیر تک زعفران کا کھیت بنی رہتی۔ ان دنوں مکتبہ میں ادبی ہنگامہ آرائیاں اپنے عرج پر تھیں چھوٹا سا ایک غیر رسمی گروپ بن گیا تھا، جس میں شاہد صاحب کے علاوہ پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر مظفر حنفی، پروفیسر صغرا مہدی اور یہ خاکسار شامل تھے۔ کچھ اور بھی لوگ گھٹتے بڑھتے رہتے۔ کبھی کبھی جناب مالک رام، جناب کرنل بشیر حسین زیدی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی پروفیسر مشیر الحق، جناب عبدالحق خاں، جناب معظم جیراجپوری، پروفیسر ضیاالحسن فاروقی، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر حنیف کیفی، جناب عبداللطیف اعظمی وغیرہ تشریف لے آتے۔ جے این یو سے اقبال مسعود آجاتے۔ جناب سردار جعفری جب بمبئی سے آتے یا جناب عابد رضا بیدار پٹنہ سے تشریف لاتے تو وقت نکال کر شاہد صاحب سے ملاقات کرتے اور مکتبہ میں کافی وقت گزارتے۔ ہمیشہ ایک خوش گواری

قائم رہتی تھی۔ ان دنوں مکتبہ کے پاس ایک ایمبیسڈر کار ہوا کرتی تھی۔ عمر میں شاہد صاحب سے چند سال بڑی ہوگی۔ شاہد صاحب اسے خود ڈرائیو کرتے اور بڑے احترام سے چلاتے۔ اسی کی رفاقت میں لبرٹی آرٹ پریس جاتے۔ وہ بھی شاہد صاحب کی بہت عزت کرتی تھی۔ کبھی ان کے سامنے بے لگام نہیں ہوئی۔ اس کی رفتار شاہد صاحب کی رفتار سے تھوڑی سی کم تھی۔ شاہد صاحب کی رفتار کا مقابلہ صرف ان کی زبان ہی کرتی رہی کسی غیر کو جرأت نہ ہوسکی۔ اس کار میں ازراہ دوراندیشی دو صحت مند آدمی بٹھائے جاتے تھے جس کے نتیجے میں یہ خاکسار اور عبداللطیف اعظمی اکثر بیٹھے نظر آتے۔ اپنے بٹھائے جانے کی مصلحت تو میں سمجھ گیا کہ ہٹا کٹا تھا، مگر عبداللطیف اعظمی صاحب جیسے نحیف و نزار کا مصرف میری سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ انجمن ترقی اردو سے لے کر غالب اکیڈمی اور غالب انسٹی ٹیوٹ تک ہر پروگرام میں لازماً شریک ہوتے اور اسی گاڑی میں ہمیشہ اگلی سیٹ پر بیٹھ کر جاتے۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وائس چانسلر کے خودمختار پی اے تھے۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب کے زمانے میں بحیثیت پی اے ان کے خوداختیاری اختیارات وائس چانسلر سے بھی زیادہ ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے جامعہ کے شعبۂ اردو میں بیس سال تک پی ایچ۔ڈی کرنے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ وہ ایک بہت ہی پیاری اور باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ اصول پسند، سخت گیر اور تحقیق سے بھی بڑے محقق۔ انھوں نے اپنے تحقیقی اصول خود وضع کیے تھے۔ چنانچہ ایک شاعر کے انتقال کے بعد اس کی تاریخ وفات طے کرتے ہوئے انھوں نے ملک الموت کی گواہی کو بھی یہ کہتے ہوئے ازروئے تحقیق رد کر دیا تھا کہ اول تو شاعر مرتا ہی نہیں، مرتا بھی ہے تو بے موت مرجاتا ہے، ملک الموت کا احسان نہیں لیتا۔ اب جب کہ اس کی موت میں ملک الموت کا کوئی یوگدان ہی نہیں تو اس کی گواہی کا بھی کیا اعتبار۔ وہ خوش رفتار، خودگفتار، ظرافت شعار، اضطراب شکار، معصوم صفت اور چھیڑ چھاڑ پسند انسان تھے۔ اپنی بات پر ڈٹے رہنا انھیں عزیز تھا۔ جس کپڑے کی ٹوپی پہنتے اسی کی شیروانی سلواتے اور ہمیشہ ٹوپی اور شیروانی میں مبتلا رہتے۔ ان کے ان تمام داخلی اور خارجی اوصاف کے باوجود میں نے شاہد صاحب سے پوچھ ہی لیا کہ اگر آپ لطیف صاحب کو اسی مقصد سے اپنی کار میں بٹھاتے ہیں جس مقصد سے مجھے بٹھایا جاتا ہے تو یہ سمجھ لیجیے کہ مکتبہ کی کار شاعرہ یا ادیبہ نہیں ہے جو لطیف صاحب کے تحقیقی عزائم سے مرعوب یا خوف زدہ ہوجائے۔ بلکہ مجھے ڈر ہے کہ ایمبیسڈر نے اگر لطیف صاحب کو دیکھ لیا تو وہ راہ میں کہیں بھی دیدہ ودانستہ کھڑی ہوسکتی ہے۔ ان نامساعد حالات میں لطیف صاحب یا ان کے تحقیقی وسائل کسی کام نہیں آئیں گے، چنانچہ یہ اَن فِٹ ہیں۔ میں نے شاہد صاحب کو یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ راہ میں بند ہوجانے کی صورت میں اگر لطیف صاحب نے اس نامحرم کو آگے پش کرنے کی کوشش کی تو وہ غیرت مند ضد میں پیچھے چلنا شروع کرسکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے یہ ساری باتیں لطیف صاحب کی موجودگی میں انھیں کو گواہ بنا کر شاہد صاحب کے گوش گزار کی تھیں اور انھیں یہ بھی اطلاع دی تھی کہ میرے علم کے مطابق آپ کی ایمبیسڈر لطیف صاحب کا پیکر خاکی ملاحظہ کرچکی ہے۔ جواباً شاہد صاحب نے ہنس کر فرمایا تھا تم مطمئن رہو ایمبیسڈر اور لطیف صاحب میں معاہدہ ہو چکا ہے جس کی رو سے لطیف صاحب اس میں بیٹھ کر تحقیقی باتیں نہیں کریں گے اور ایمبیسڈر راہ میں بند ہونے کا خیال بھی دل میں نہیں لائے گی۔ (''معاہدہ ہو چکا ہے'' شاہد صاحب نے اس انداز سے کہا تھا جیسے ''نکاح ہو چکا ہے'' کہنا کیا چاہتے ہوں) میں چپ ہوگیا اور وہ دونوں اپنے عہد پر قائم رہے۔ کار بڑی وضعدار نکلی ایک دو بار تو پٹرول ختم ہونے کے بعد بھی مروتاً چلتی رہی۔ کار کی آخری عمر میں لطیف صاحب بھی کافی ضعیف ہو چکے تھے۔ ان کی بیگم نفیسہ بھابی انھیں باہر جانے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتیں مگر وہ باز نہ آتے اور ہر پروگرام میں جانے کی ضد کرتے۔ ان کی شوخی میں آخر وقت تک کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ایک بار ان کی ضد کے آگے پھر سپر انداز ہوکر بھابی نے میرے اور شاہد صاحب کے ساتھ انجمن کے پروگرام میں انھیں بادل ناخواستہ بھیج دیا۔ واپسی پر شاہد صاحب نے اپنی گاڑی ان کے گھر کے نزدیک کھڑی کی اور مجھے حکم دیا کہ میں لطیف صاحب کو ان کی بیگم کے سپرد کرنے کے بعد ان سے رسید لے

لوں ۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور نفیسہ بھابی سے یہ رسید رکھوالی۔

''ایک عدد عبداللطیف اعظمی ثابت و سالم وصول پائے اور باہوش وحواس یہ رسید لکھ دی۔ تاکہ سند رہے اور وقت بے وقت کام آئے۔''

لطیف صاحب نے اس پر بحیثیت گواہ اپنے دستخط ثبت کیے۔ان تمام لطائف کے ساتھ ساتھ لطیف صاحب نے جو تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں سنجیدہ حلقوں میں کھلے دل سے ان کا اعتراف کیا جاتا ہے۔

۱۹۸۵ء کا واقعہ ہے شاہد صاحب اور ان کے رفقا کی ٹیم نے جس میں بڑے بڑے نام شامل تھے پروفیسر محمد مجیب صاحب پر ایک ضخیم کتاب ''محمد مجیب احوال وافکار'' رات دن لگ کر مرتب کی، اور ایک بڑے جلسے میں یہ کتاب مجیب صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی۔ بڑی شاندار کتاب تھی اور بڑا یادگار جلسہ ہوا۔ جلسے سے فراغت کے فوراً بعد جب تمام لوگ جلسے کی کامیابی سے سرشار تھے اور کتاب کی اشاعت پر مسرور، مطمئن اور شاداں و فرحاں نظر آرہے تھے میں نے شاہد صاحب سے عرض کیا کہ مجیب صاحب کے بعد ان کے اور جامعہ کے عاشق صادق لطیف صاحب کا جشن بھی ہونا چاہیے۔ شاہد صاحب نے میری اس تجویز کو نہایت خوش دلی کے ساتھ قبول کیا۔اسی وقت ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے صدر پروفیسر انور صدیقی مقرر ہوئے اور مجھے کنوینر بنایا گیا۔ ممبران میں شاہد صاحب کے علاوہ جناب معظم جیراجپوری، جناب عبدالحق خاں، جناب پروفیسر مشیرالحق، جناب پروفیسر شمیم حنفی، جناب پروفیسر مظفر حنفی اور جناب محمد انس شامل تھے۔ تمام ممبران جشن کی تاریخ لینے لطیف صاحب کے گھر پہنچے۔ پُر تکلف کھانا کھایا اور ہنستے ہنساتے واپس آئے۔ ۸/مارچ ۱۹۸۵ء کو ٹیچرس کالج کے سمینار ہال میں ''جشن در بیان لطیف'' کے عنوان سے یہ قہقہہ بردوش جشن، پروفیسر ضیاالحسن فاروقی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں جامعہ کے بے شمار اساتذہ اور کارکنان کے علاوہ کرنل بشیر حسین زیدی، جناب انور جمال قدوائی، پروفیسر مشیرالحق، پروفیسر محمد اکرام خاں اور ڈاکٹر سلامت اللہ جیسے کئی سابق موجودہ اور مستقبل کے وائس چانسلرس نے نہ صرف شرکت فرمائی بلکہ خوبصورت تقریریں بھی کیں۔ کئی دلچسپ مضامین پڑھے گئے۔مظفر حنفی صاحب نے روایتی انداز کا ایک شاندار قصیدہ پڑھا جس میں قصیدے کے تمام اجزائے ترکیبی کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ میں نے بھی لطیف صاحب کا ایک خاکہ ''ذکر اس پری وش کا'' سنایا۔شاہد صاحب نے جشن کے مضامین اور منظوم تہنیت ناموں پر مشتمل کتاب چھاپ کر اسی جشن کے موقع پر لطیف صاحب کی خدمت میں پیش کی۔اس جشن کی بے مثال کامیابی سے شہ پا کر دو انجمنیں قائم ہوئیں ایک ''انجمن تحسین باہمی'' اور دوسری ''انجمن جشن کروالو'' کیا اچھے دن تھے جو گزر گئے اور کیا لوگ تھے جو رخصت ہوئے۔ شاہد صاحب کے زمانے میں مکتبہ میں ایک زندگی تھی ایک رونق تھی اور مکتبہ ایک اردو تحریک کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

میں نے شاہد صاحب سے بہت کچھ سیکھا ہے ۔ اردو سے محبت تو خیر ہماری بھی گھٹی میں شامل تھی۔ احسان شناسی، ایثار پسندی، ایمانداری، بے نیازی اور رزق حلال پر اصرار جیسی نعمتیں الحمدللہ وراثت میں مل گئی تھیں۔مگر کام سے غیر معمولی رغبت، حوصلہ مندی، عزم واستقلال اور ذاتی نفع ونقصان سے بے پرواہو کر مکتبہ کی خدمت اور اس کے فائدے کے لیے دوستوں سے ایثار وتعاون کا بے جھجک مطالبہ، شاہد صاحب کی وہ صفات عالیہ ہیں جو انھیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ شاہد صاحب کے زمانے میں مکتبہ سے میری تین کتابیں شائع ہوئیں۔ ''سمندر آشنا''، ''ادب کی تعبیر''، اور ''اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ'' ان تینوں کے مصارف میں نے خود اپنے پاس سے ادا کیے تھے (مکتبہ نے میری کبھی کوئی کتاب اپنی گرہ سے نہیں چھاپی) مگر میری بیشتر کتابیں وہیں رہتیں تھیں۔ضرورت ہوتی تو وہیں سے لے آتا۔ سفرنامہ چوں کہ اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں شامل تھا اس لیے یہ کتاب خوب فروخت ہوئی۔ایک مرتبہ جب دوسرے کچھ لوگ اپنی کتابوں کی فروخت کا حساب کر رہے تھے،

میں نے بھی مکتبہ کے اکاؤنٹنٹ سے تذکرۃً کہہ دیا کہ ہماری کتابوں کا حساب بھی دیکھ لیں۔ اس سے پہلے کہ اکاؤنٹنٹ صاحب کوئی جواب دیں شاہد صاحب نے بڑے حق سے فرمایا ''تمہیں پیسوں کی ضرورت نہیں مکتبہ کو زیادہ ضرورت ہے۔'' مکتبہ سے شاہد صاحب کا یہ پیار، یہ فکرمندی، یہ دردمندی، دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ ان کی یہ صاف گوئی بھی مجھے بھلی معلوم ہوئی۔ بات نہایت معقول اور صد فیصد درست تھی۔ شاہد صاحب کا یہ جواب مجھ پر ان کے اعتماد اور اپنائیت کی دلیل تھا۔ ایک پیغام تھا جو مجھے اچھا لگا، اور اس نے مجھے اس درجہ متاثر کیا کہ میں نے اس پیغام کو اپنی گرہ میں باندھ لیا۔ میں نے سوچا مجھے واقعی پیسوں کی اتنی ضرورت کہاں ہے جتنی مکتبہ کو ہے۔ میں نے شاہد صاحب کا پڑھایا ہوا یہ سبق ہمیشہ یاد رکھا۔ یہ سبق مجھے اس وقت بھی یاد تھا جب میں ۲۰۱۰ء سے کر ۲۰۱۴ء تک تقریباً پانچ سال مکتبہ جامعہ کا اعزازی مینیجنگ ڈائریکٹر رہا اور اسی حیثیت سے کتاب نما کا مدیر اعلیٰ بنایا گیا۔ مدیر بننے کے بعد بھی میں نے کتاب نما کی خریداری ترک نہیں کی اور حسب معمول زر سالانہ ادا کرتا رہا۔ اسی طرح جب میں نے مکتبہ کے کیلنڈر کی سالانہ اشاعت کا آغاز کیا تو اپنے احباب اور جامعہ کے ارباب حل وعقد کو بھی کیلنڈر رقیمتاً ہی پیش کیا۔ خود بھی ہر سال سو پچاس کاپیاں خرید کر تقسیم کرتا رہا۔ اسی دوران بحیثیت مینیجنگ ڈائریکٹر جب میں مکتبہ کی ممبئی برانچ کا معائنہ کرنے اور دوسری مرتبہ قومی کونسل کے کتاب میلے میں شرکت کی غرض سے بہ حکم شیخ الجامعہ ممبئی گیا تو وہاں اپنے قیام و طعام اور جہاز سے آمد و رفت کے تمام اخراجات دونوں مرتبہ خود اپنی جیب سے ادا کیے۔ مکتبہ کو زیر بار نہیں ہونے دیا۔ حالاں کہ ٹی۔ اے اور ڈی۔ اے وصول کرنے کا مجھے اخلاقی و قانونی حق حاصل تھا۔ مگر شاہد صاحب کی پرخلوص آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی ''تمہیں پیسوں کی ضرورت نہیں مکتبہ کو زیادہ ضرورت ہے۔'' مجھے خوشی ہے کہ میری کاوش اور اس وقت کے اردو دوست وائس چانسلر جناب نجیب جنگ صاحب کی خصوصی دلچسپی کی وجہ سے مکتبہ جامعہ کی چار سو قیمتی کتابیں جو دیمک کی غذا بنتی جارہی تھیں۔ قومی کونسل کے اشتراک سے شائع ہوکر مکتبہ جامعہ کی چاروں برانچوں میں پہنچ گئیں۔ کونسل نے ہر کتاب کی گیارہ سو کاپیاں چھاپی تھیں اس حساب سے کل تعداد چار لاکھ چالیس ہزار ہوتی ہے جو بڑی حصولیابی تھی۔ میری ہی کوشش سے ''بوانا'' کا پلاٹ بھی مکتبہ نے خرید لیا۔ مزید برآں مکتبہ کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ایس۔ آر۔ کے بلڈنگ کے عقب میں پوشیدہ دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں سے نکال کر مین روڈ کی دو منزلہ وسیع وعریض عمارت میں لانے کا اعزاز بھی مجھے حاصل ہوا۔

شاہد صاحب کے اس سبق نے مجھ سے بڑے بڑے کام لیے ہیں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ساتھ ہی شعبۂ اردو کے رفقا اور طلبا کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے سرگرم عملی تعاون نے میرے عزائم اور حوصلے کو بحال رکھا اور میرے جوش وجذبے کو سرد نہیں ہونے دیا۔ مکتبہ کے تمام کارکنان بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں، جو نہایت قلیل تنخواہ پر صبح سے شام تک محنت کرتے ہیں اور جنھوں نے مکتبہ کی از سر نو تعمیر وترقی میں قدم قدم پر میرا ساتھ دیا تھا۔ مجھے احساس ہے کہ مکتبہ کی ان غیر معمولی کامیابیوں اور کامرانیوں کے حصول کی جدو جہد میں ان کی محنتوں کا عرق شامل ہے۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے (آمین)۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ میرے مربی اور محبی شاہد علی خاں صاحب کے مکتبہ جامعہ سے عشق کا آغاز ممبئی برانچ سے ہوا تھا۔ مگر میں وہاں کا گواہ نہ بن سکا۔ دلی میں اسے پھلتا پھولتا ضرور دیکھا ہے اور خوب دیکھا ہے یہاں جو دیکھا ہے اور جو محسوس کیا ہے انھیں تاثرات کو اپنے انداز میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم مجھے اعتراف ہے کہ یہ ان کی داستان عشق کا عشر عشیر بھی نہیں۔ ان کے کارنامے مربوط ومبسوط کتاب کے متقاضی ہیں۔ وہ اپنے رنگ میں تنہا ہیں ان کا کوئی حریف نہیں اور ہو بھی نہیں سکتا۔ بقول غالبؔ

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق

○

ڈاکٹر رؤف خیر
موتی محل، گولکنڈہ، حیدرآباد
cell : 9440945645

ابوالکلام قاسمی۔ ماضی تا امروز

گذشتہ چھے مہینوں میں اردو شعروادب کا بہت نقصان ہوا۔ کئی ادیب وشاعر کورونا کا شکار ہوئے تو کئی رسالے لاک ڈاؤن میں یا تو بند ہوگئے یا بے ضابطہ نکلے۔ یہاں تک کہ سرکاری رسالے بھی صرف آن لائن پڑھے جانے لگے۔ اللہ کا شکر ہے اتنا بھی غنیمت رہا کہ بند نہیں کر دیے گئے البتہ ''نیا دور'' پلسا ہٹ کی نذر ہوا۔ دسمبر 2020ء سے مئی 2021ء تک بہت خراب صورت حال رہی۔ فضا قدرے سنبھل گئی تھی کہ سات جولائی کو عالمی شہرت یافتہ شہنشاہِ جذبات یوسف خان کا دامن حیات زلیخائے موت نے چاک کر ڈالا۔

دامن اُس یوسف کا آیا ٹکڑے ہوکر ہاتھ میں
اُڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئے پر ہاتھ میں

مدھومتی، دھنّو اور انارکلی کا سہاگ اجڑ گیا۔

آٹھ جولائی 2021ء کو دینی مدرسے کے فارغ اور دنیوی جامعہ کے کامل ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے۔ مرقّہ حال حافظ عبدالجلیل کے گھر قصبہ ءدوگھرا ضلع دربھنگہ بہار میں 20 دسمبر 1952ء کو ابوالکلام قاسمی نے آنکھیں کھولیں۔ اپنے دو چھوٹے بھائی عبدالعلّام اور سیف الاسلام اور ایک بہن درخشاں خانم کے چہیتے ابوالکلام تھے تو ابوالکلام کا سرمایہ بھی یہ علمی و مذہبی خاندان تھا۔ ان کے والد چوں کہ مذہبی فکر کے حامل تھے، ابوالکلام کو ابتدائی تعلیم بھی مذہبی نوعیت ہی کی دلائی گئی۔ ان کا داخلہ دارالعلوم حسینیہ میں کرایا گیا جہاں انھوں نے 1956ء سے 1963ء تک دینی تعلیم پائی۔ پھر انھوں نے دارالعلوم دیوبند سے عالمیت و فاضلیت کی سند حاصل کی۔ 1970ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے میٹرک کامیاب کیا۔ 1973ء میں انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا اور بی اے آنرز کیا۔ اس وقت تک ابوالکلام قاسمی باریش تھے۔ 1975ء میں ایم۔اے اردو جیسے ہی کامیاب کیا ان کا تقرر علی گڑھ یونیورسٹی ہی میں لکچرر کی حیثیت سے ہوگیا۔

ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے بھی کہا تھا کہ اسلام ڈاڑھی میں یا ٹخنے سے اوپر پاجامہ پہننے کے فروع میں اسیر ہوکر نہیں رہ گیا ہے۔ مودودی صاحب کی بات کسی مفتی کے فتوے سے کم نہیں ہوتی۔ چناں چہ ہندو پاک میں پھیلے ہوئے ان کے تقریباً تمام ماننے والے ان کی دی ہوئی رعایت سے فائدہ اٹھا کر ڈاڑھی خسر Trim کراتے ہیں اور ٹخنے کے اوپر ازار بندی پر بھی کار بند نہیں ہوتے ایسی چیزوں کو وہ فروعی سمجھتے ہیں۔ ابوالکلام قاسمی نے بھی ڈاڑھی کو خیر باد کہہ دیا۔ 1984ء میں ابوالکلام نے ''مشرقی شعریات اور تنقید کی روایت'' کے موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کر لی۔ نام میں ڈاکٹر کا اضافہ ہوا مگر سابقہ قاسمی بھی رسماً برقرار رہا۔ مزاج میں دیوبندیت دخیل نہیں تھی۔ اب وہ فارغ البالی میں مست رہے۔ کوئی بھی یونیورسٹی ہو، ریڈیو سٹیشن اور دوردرشن سنٹر ہو راجہ اندر کا اکھاڑا ہوتا ہے۔ یہاں قل اعوذیت نہیں چلتی۔ 1979ء میں ابوالکلام قاسمی محترمہ دردانہ لکچرر سے نکاح

کے بندھن میں بندھ گئے جو بعد میں عبداللہ گرلز کالج میں صدر شعبہء اردو رہیں۔ ابوالکلام قاسمی بھی لکچرر سے، ریڈر، پروفیسر، ڈین فیکلٹی آف ہیومانیٹیز علی گڑھ یونیورسٹی ہوکر وظیفہء حسنِ خدمت پر سبک دوش ہوئے۔

میں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد سے ''عزیز احمد بہ حیثیتِ شاعر و مترجم'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھا تھا تو میرے ممتحن پروفیسر ابوالکلام قاسمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پروفیسر مظفر شہ میری حیدرآباد یونیورسٹی تھے۔ (جو بعد میں وائس چانسلر عبدالحق کرنول یونیورسٹی ہوگئے) Viva کے لیے ابوالکلام قاسمی تشریف نہ لا سکے صرف پروفیسر مظفر شہ میری ہی تشریف لائے تھے۔

ابوالکلام قاسمی سے میرا ربط اس زمانے سے رہا جب وہ علی گڑھ سے رسالہ ''الفاظ'' نکالا کرتے تھے۔ 78-1977 کے آس پاس چاروں طرف فسادات کا موسم تھا۔ علی گڑھ بھی اس کی زد میں تھا اور حیدرآباد میں ہم بھی فسادات سے نمٹ رہے تھے میں نے اس پس منظر میں جو غزلیں کہی تھیں اُن میں سے دو غزلیں ابوالکلام قاسمی نے جنوری 1979ء کے شمارے میں شائع کی تھیں۔ ان غزلوں کے چند اشعار صاحبانِ ذوق کی نذر ہیں۔

اَن ہونی تھی جو ہو کے رہی دُکھ یہی تو ہے
کیا سائرن تھے رہ گئے بج بج کے شہر میں

بونے سب اپنے سایوں سے خوش ہم سے ہیں خفا
اندھیر کس قدر ہے یہ سورج کے شہر میں

اس جنگ میں تو دستِ اماں بھی شریک ہے
اک بے کلی کا راج ہے دھیرج کے شہر میں

مہنگا پڑے گا میرا لہو سوچ لیجئے
میں سخت جاں ہوں قتلِ مروج کے شہر میں

میں نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد سے ''عزیز احمد بہ حیثیتِ شاعر و مترجم'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھا تھا تو میرے ممتحن پروفیسر ابوالکلام قاسمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور پروفیسر مظفر شہ میری حیدرآباد یونیورسٹی تھے۔ (جو بعد میں وائس چانسلر عبدالحق کرنول یونیورسٹی ہوگئے) Viva کے لیے ابوالکلام قاسمی تشریف نہ لا سکے صرف پروفیسر مظفر شہ میری ہی تشریف لائے تھے۔

انصاف کی جو پوچھو تو کہہ دوں خطا معاف
احساسِ مجرمانہ ہے ہر جج کے شہر میں

ہمراہ جبرئیل و ابابیل بھی نہیں
بھیجا گیا ہوں اَوس کے خرزرج کے شہر میں

میں خطِ خیر۔ اسود و ابیض کے درمیان
حرفِ صحیح ہے لہجہء کج مج کے شہر میں

اور اس کے ساتھ دوسری غزل بھی سنگلاخ زمین ہی میں تھی۔

تا بکے منزل بہ منزل ہم مسافر بھاگتے
آنکھ اب ٹھیری ہوئی ہے اور مناظر بھاگتے

اے حریفِ ہر قدم۔ شہ مات سے بچنے کی سوچ
اِس بساطِ خاک سے کیا ہم سے شاطر بھاگتے

ہم تو آئے ہیں یہاں مٹنے مٹانے کیلئے
اس زمینِ کربلا سے کس کی خاطر بھاگتے

خیر شبِ خوں مار کر چھپ جانے والے ہم نہیں
معرکہ سر کرنے نکلے ہیں تو کیا پھر بھاگتے
کھود لیتے ہیں کنواں شہداب پا لیتے ہیں خیرؔ
اس زمینِ سخت سے کیا ہم سے شاعر بھاگتے

ہندو پاک کے بعض معیاری رسائل میں یہ غزلیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی غزل تو اسی دوران ماہ نامہ ''شمع'' دہلی میں بھی شائع ہوئی تھی۔ یہ غزلیں میرے دوسرے شعری مجموعے ایلاف (سنہ اشاعت 1982ء) میں شامل ہیں جس میں غالبؔ تعداد ''ترائیلوں'' کی ہے۔

ابوالکلام قاسمی نے ''الفاظ'' کا گوپی چند نارنگ نمبر بھی نکالا تھا جس کا فائدہ بھی ہوا کہ ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ بھی قاسمی کے حصے میں آیا۔ نارنگ صاحب کسی کا احسان نہیں رکھتے بلکہ احسان کیا کرتے ہیں۔ ساہتیہ اکاڈمی انعام یافتگاں کی فہرست کافی طویل

ہے چند نام جینت پرمار، ش ک نظام، کرشن کمار طور وغیرہ کے ساتھ ابوالکلام قاسمی کا نام بھی جڑ گیا۔

ابوالکلام قاسمی کو مغرب کی بہ نسبت مشرق سے بہت دل چسپی رہی ہے اس میں ان کے دارالعلوم سے فراغت کو بھی دخل ہوسکتا ہے۔ ان کی ایک کتاب ''مشرق کی باز یافت'' 1982ء میں آچکی ہے ۔ ویسے انھوں نے ''مشرقی شعریات اور تنقید کی روایت'' جیسے موضوع پر 1984ء میں پی ایچ ڈی کی۔ روایت سے گزر کر جدیدیت کی نیرنگی کو پھلانگتے ہوئے مابعد جدیدیت کے دامن میں آگئے جو رنگِ نارنگ ہے۔ ان کا شمار بھی مابعد جدیدیت کے ہم نواؤں اور نقادوں میں ہوتا ہے۔

ابوالکلام قاسمی کو لکھنے پڑھنے سے خاصہ شغف رہا ہے۔ ان کی کئی کتابیں ان کے اس شغف کی غماز ہیں۔ ان کی کتاب ''تخلیقی تجربہ'' 1982ء میں منظر عام پر آئی۔ تنقید کے ساتھ ساتھ انھیں تحقیق و تدوین سے بھی سروکار رہا ہے جس کا ثبوت ''انعام اللہ خاں یقیں اور تنقید کی روایت'' 1993ء میں منظر عام پر آیا۔ ابوالکلام قاسمی نے ''انتخابِ فراق گورکھپوری'' کے ذریعے 1997ء میں شعری ذوق کا مظاہرہ بھی کیا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسی مرنجان مرنج شخصیت کو خراجِ تحسین کے طور پر ''رشید احمد صدیقی۔ قدر و قیمت'' 1988ء میں پیش کی۔ وہ بے چارے سلمیٰ کے حیران کن جرأت مندانہ اقدام سے نہایت دل گرفتہ گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔

ابوالکلام قاسمی ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ تحقیق، تدوین، تنقید کے ساتھ ساتھ انھیں فکشن سے بھی غیر معمولی لگاؤ تھا۔ چنانچہ انھوں نے ای۔ ایم۔ فاسٹر کی کتاب Aspects of Novel کا انگریزی سے اردو میں ''ناول کا فن'' کے نام سے ترجمہ بھی

> ابوالکلام قاسمی کو لکھنے پڑھنے سے خاصہ شغف رہا ہے۔ ان کی کئی کتابیں ان کے اس شغف کی غماز ہیں۔ ان کی کتاب ''تخلیقی تجربہ'' 1982ء میں منظر عام پر آئی۔ تنقید کے ساتھ ساتھ انھیں تحقیق و تدوین سے بھی سروکار رہا ہے جس کا ثبوت ''انعام اللہ خاں یقیں اور تنقید کی روایت'' 1993ء میں منظر عام پر آیا۔ ابوالکلام قاسمی نے ''انتخابِ فراق گورکھپوری'' کے ذریعے 1997ء میں شعری ذوق کا مظاہرہ بھی کیا۔

1979ء میں کرڈالا۔

ان سارے پہلوؤں کی روشنی میں انھیں 1999ء میں ساہتیہ اکاڈمی انعام سے نوازا گیا۔ انھوں نے ''اردو فکشن آزادی کے بعد'' جیسا تحقیقی کارنامہ بھی انجام دیا جو 2000ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد ''شاعری کی تنقید'' بھی کی جو 2001ء میں شائع ہوئی، 2007ء میں ''معاصر تنقیدی رویے'' جیسی کتاب کے ذریعے تنقیدی رطب و یابس کی خبر لی۔ ''نظریاتی تنقید'' کا جائزہ بھی انھوں نے 2006ء میں پیش کر کے اپنی صاحب نظری کا ثبوت دیا تھا۔ ابوالکلام قاسمی کا ایک اور کارنامہ ''کثرتِ تعبیر'' نے 2012ء میں دن کی روشنی دیکھی ۔ ہر پروفیسر میرؔ، غالبؔ و اقبالؔ پر کچھ نہ کچھ خامہ فرسائی کرتا ہی ہے چناں چہ ابوالکلام قاسمی نے ''غالبؔ شخصیت اور شاعری'' لکھ کر یہ فریضہ بھی انجام دیا۔ اس کے علاوہ ''اقبال شناسی'' کے سلسلے میں بھی آپ نے بہت کچھ لکھا۔

ابوالکلام قاسمی نے کئی رسالوں میں ادارتی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔ ''الفاظ'' تو وہ خود علی گڑھ سے ساتویں دہائی میں نکالا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ فکر و فن، تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ میگزین سے بھی وہ وابستہ رہے ہیں۔ ادھر کئی برسوں سے وہ اپنا رسالہ ''امروز'' سہ ماہی بڑے اہتمام سے شائع کر رہے تھے۔ ادبی حلقوں میں ''امروز'' نے اپنی پہچان بھی قائم کی تھی مگر قاسمی کے بعد امروز بھی شاید ماضی کے حوالے ہوجائے۔

رہے نام اللہ کا

اعتراف: کوائف قاسمی کے لیے پروفیسر منظر حسین (رانچی یونیورسٹی) کے ایک تعزیتی مضمون سے استفادہ کیا گیا ہے جو ابوالکلام قاسمی کی وفات کے دوسرے ہی روز بعض اخبارات میں شائع ہوا تھا۔

☆☆

ڈاکٹر امام اعظم
ریجنل ڈائریکٹر (مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)، کولکاتا ریجنل سینٹر
۱-اے/۱، چھاتوبابو لین، (محسن ہال)، تیسری منزل کولکاتا-۱۴
موبائل : 08902496545 / 9431085816

مناظر عاشق ہرگانوی: داستانی طرز کے قلم کار

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی داستانی طرز اور انداز کے قلم کار ہیں، جن کی زندگی کے حقائق اور تخلیقی سرگرمیوں کی انفرادیت الگ رنگ لیے ہوئے ہے۔ وہ ایک طرف تنقید نگار اور محقق ہیں تو دوسری طرف شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، مضمون نگار، بچوں کے ادیب، طنز و مزاح نگار اور صحافی بھی ہیں۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ہر پہلو سے انھوں نے خود کو نمایاں رکھا ہے اور ان کے خیالات وسیع سے وسیع تر ہوتے رہے ہیں۔ وہ معلم بھی تھے کہ ۳۴-۳۵ رسال (ستمبر ۱۹۷۸ء تا جون ۲۰۱۳ء) تک یونیورسٹی کے طلبا و طالبات کو پڑھاتے رہے اور پروفیسر کے عہدے پر فائز رہ کر کشادہ دلی اور خود احتسابی کے لائحۂ عمل کی ضرورت کا درس دیتے رہے۔ موصوف نے ملازمت کی شروعات مارکھم کالج، ہزاری باغ میں ۱۹۷۸ء سے کی۔ پھر تین سال کے بعد ۱۹۸۱ء میں وہ مارواڑی کالج بھاگلپور آ گئے اور یہیں سے ۱۹۹۶ء میں پی جی شعبۂ اردو، تلکا مانجھی یونیورسٹی میں ان کا تبادلہ ہوا جہاں سے وہ جولائی ۲۰۱۳ء میں سبکدوش ہوئے۔ دنیا بھر سے انھیں تین درجن سے زیادہ انعام و اکرام ملے ہیں جن سے ان کی شناخت روشن ہوئی ہے۔

شش جہت اور ہشت پہلو شخصیت کے بارے میں پڑھا اور سنا تھا لیکن ڈاکٹر ہرگانوی کی شخصیت اور قلم کے اتنے پہلو ہیں کہ کون سا نام لیا جائے، میں صرف سوچ رہا ہوں۔ ان کی تحریروں میں اور شخصیت کی سادگی میں احساس و شعور کی بیدار مغزی اور نفسیاتی معاملات کی تہہ داری دیکھی اور پرکھی جا سکتی ہے۔ جدید نسل کے لیے وہ مشعلِ راہ ہیں کہ نئے پرانے سبھی کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور کردار سازی میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اردو ادب سے تھوڑی سی دلچسپی رکھنے والا شخص بھی مناظر عاشق ہرگانوی کو ضرور جانتا ہے کیوں کہ ان کے ذہن، دل اور فن میں کائنات گیر فراخی ہے اور انھوں نے ہر معیار کے رسائل میں بے تحاشہ لکھا ہے۔

بنیادی طور پر مناظر عاشق ہرگانوی تنقید نگار ہیں۔ تنقید کی ۱۲۵ رسے زیادہ کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ جنوری ۲۰۱۶ء میں کولکاتا کی افسانہ نگار محترمہ ترنم جمال کی کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی سے انٹرویوز'' شائع ہوئی ہے جس میں ان سے لیے گئے ۳۶ رمصاحبے شامل ہیں جنھیں پڑھنے کے بعد تہہ بہ تہہ مناظر عاشق ہرگانوی منعکس ہوتے ہیں۔ ۲۰۱۹ء میں ادھو مہاجن بسمل کی کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی سے مصاحبہ'' منظر عام پر آئی ہے، جس میں نذیر فتح پوری اور ان کے رسالہ ''اسباق'' پر سوالات کے جواب ہیں۔ اس مصاحبہ والی کتاب کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ پونا یونیورسٹی سے محترمہ شمشاد جلیل شاد ''اسباق'' پر پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔ ابھی تک یعنی اپریل ۲۰۲۱ء تک مناظر صاحب کی ۲۶۴ رکتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ انہوں نے دور قدیم، ترقی پسند تحریک، دور جدید اور مابعد جدید کے بیشتر ادباء و شعراء کو اپنے طور پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ کلاسیکی فنکاروں کو بھی انہوں نے

اپنے دائرۂ قلم میں رکھا ہے اور اپنی تنقیدی کسوٹی پر ان کی آراء کو جانچا اور پرکھا ہیا وران کے عیوب ومحاسن پر اپنی رائے دی ہے۔ ساختیات اور پسِ ساختیات جیسے پیچیدہ موضوع کو سہل انداز میں سمجھانے، اس کی افادیت کو بتانے اور اس کے نظریاتی سمت کو طے کرنے کیلئے جو پیمانہ مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنایا وہ بہرحال ان دبستان تنقید کو برتنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اس حوالے سے گوپی چند نارنگ اور وزیر آغا پر ان کی چار کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ''تمثیل نو'' دربھنگہ میں بائیس قسط میں ان کے مضامین اس کے علاوہ ہیں۔ ماہنامہ ''صریر'' کراچی میں ان کے انٹرویو اور مباحث الگ ہیں۔ اپنے رسالہ ''کوہسار جرنل'' کے ذریعہ بھی انھوں نے بہت سارا مواد اس پہلو سے اردو کو دیا ہے اور ''تنقید کی نئی لہر'' کے نام سے ان کی کتاب بھی ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی نے فکشن کے تجربے بھی کئے ہیں جن میں افسانہ، ناول اور ڈراما شامل ہیں۔ ناول '' آنچ '' میں ڈاکٹر ہرگانوی نے زندگی کو بعینہٖ لیا ہے جس میں کسک اور تخلیقی عمل کا انعکاس دھیمے دھیمے روح میں اترتا ہے اور گریز اور انکار کے دھارے پر انسانی رشتوں کی اساسی حقیقت کو قبول کرتا ہے خاص طور پر محبت کی زندگی کو اجاگر کرتا ہے۔ ان کا نیا ناول ''شبنمی لمس کے بعد'' دھماکہ خیز ثابت ہوا ہے کہ اس کی تکنیک نئی ہے، اسلوب نیا ہے اور واقعات کی مصوری میں زندگی کے تناظرات کو برتنے کا الگ ذائقہ ہے۔ ساتھ ہی بدن کی جمالیات پر جیسا مواد اس ناول میں موجود ہے، اس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔ اس ناول پر اتنے سارے مضامین لکھے گئے ہیں کہ تقریباً ۳۰۰ر صفحات کی کتاب عنقریب منظرِ عام پر آرہی ہے۔ اس ناول پر اتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ نے انعام بھی دیا ہے اور نذیر فتح پوری اور خالد حسین خاں کی کتابوں کے ساتھ خود مناظر صاحب کی ترتیب دی ہوئی منظوم کتاب ۷ر زبانوں میں ایک ساتھ منظرِ عام پر آچکی ہے۔ اس سے اس ناول کی مقبولیت کا

> مناظر عاشق ہرگانوی نے فکشن کے تجربے بھی کئے ہیں جن میں افسانہ، ناول اور ڈراما شامل ہیں۔ ناول '' آنچ '' میں ڈاکٹر ہرگانوی نے زندگی کو بعینہٖ لیا ہے جس میں کسک اور تخلیقی عمل کا انعکاس دھیمے دھیمے روح میں اترتا ہے اور گریز اور انکار کے دھارے پر انسانی رشتوں کی اساسی حقیقت کو قبول کرتا ہے۔

اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری پر بہت سارے مضامین لکھے گئے ہیں اُن میں سے ۲۵ر مضامین کو عذرا مناظ نے ''مناظر عاشق ہرگانوی کی افسانوی جہتیں'' کے عنوان سے ۲۰۱۷ء میں کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے ۲۰ر افسانوں کا ناقدین کے ذریعہ تجزیہ ڈاکٹر عرش منیر نے ''مناظر عاشق ہرگانوی کے افسانے اور تجزیئے'' کے نام سے ۲۰۱۷ء میں ہی منظر عام پر لاکر ان کی افسانوی جہت کو نمایاں کیا ہے۔ عذرا مناظ کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ''مناظر عاشق ہرگانوی کے افسانوں کی انفرادیت'' کے نام سے ۱۶۰ر صفحے میں کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ابنِ صفی جیسے جاسوسی ناول نگار پر کتاب لکھنے کی پہل کی جب کہ جاسوسی ادب کو اردو میں کوئی مقام نہیں مل سکا تھا۔ ڈاکٹر ہرگانوی نے یکے بعد دیگرے ابنِ صفی پر تین کتابیں ''ابنِ صفی کے جاسوسی ناولوں میں طنز ومزاح''، ''ابنِ صفی کا جاسوسی سنسار'' اور ''ابنِ صفی کے ۱۰۱ رادار یے'' اردو کو دی ہیں۔ چوتھی کتاب بھی وہ تیار کررہے ہیں۔

ڈاکٹر ہرگانوی نے بچوں کے ادب پر بہت کچھ لکھا ہے۔ تین درجن سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور اخلاقیات کا درس دینے کے ساتھ ساتھ جاسوسی اور بھوت پریت کی کہانیاں اور ناول لکھ کر تفریح بھی مہیا کی ہے۔ اردو میں بچوں کے ادب کی پہلی اینتھولوجی ساہتیہ اکیڈمی دہلی نے ڈاکٹر ہرگانوی کے ذریعہ تیار کرا کے شائع کی ہے اور انھیں ساہتیہ اکاڈمی نے اپنے اہم ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔ ان کی کتاب ''جیسے کو تیسا'' اب بائیس زبانوں میں شائع ہوگی کہ ساہتیہ اکیڈمی کے قواعد وضوابط میں شامل ہے۔

اگست ۲۰۰۰ء میں انٹرنیشنل سیمینار میں شرکت کے لئے ڈاکٹر ہرگانوی لندن گئے تھے جہاں ۱۶ر ممالک کے دانشوروں نے سیمینار میں شرکت کی اور عالمی مشاعرہ بھی ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر ہرگانوی نے کی۔ یہاں انہیں قرۃ العین حیدر کے ہاتھوں 'حالی

ایوارڈ' دیا گیا۔

جب مناظر صاحب ہندوستان واپس آ گئے تب بی بی سی لندن والوں کو اس کا علم ہوا۔ وہاں کے حل وعقد نے بھاگل پور فون کر کے رابطہ قائم کیا کہ انٹرویو لینا چاہتے ہیں۔ آخر طے پایا کہ آدھے گھنٹے کا لائیو انٹرویو فون پر ہی لیا جائے گا، جس کے دوران ایشیا کے سامعین بھی سوالات کریں گے اور یہ انٹرویو بی بی سی سے ۱۲/جنوری ۲۰۰۱ء کو نشر ہوا۔

ہرگانوی تنوع پسند ہیں۔ مشاہیر ادب سے انٹرویو کی ۶/کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زہرہ داؤدی، انور شیخ اور جاسوسی ناول نگار عارف مارہروی سے الگ الگ موضوعات پر پوری پوری کتابیں ہیں۔ وہ چوں کہ ہندی میں بھی اپنی پہچان رکھتے ہیں، اس لیے ہندی میں ۲۰۱۶ء سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے۔ ہندی میں انٹرویو کی پوری پوری پہلی کتاب ان کے نام سے ہے۔ ابھی تک ''یُگل کشور پرساد سوالوں کے گھیرے میں''، ''ڈاکٹر امریندر سوالوں کے گھیرے میں''، ''ڈاکٹر آبھا پوروے سوالوں کے گھیرے میں''، ''ڈاکٹر سری نواس شرما سوالوں کے گھیرے میں'' اور ''کتھا کار رنجن سوالوں کے گھیرے میں'' منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ اس سلسلے کی مزید کتابیں تیاری کے مرحلے میں ہیں۔ ہائیکو، ماہیا، کہہ مکرنی، غزالہ، کہمن، دوہا غزل، دوہا گیت، غزل نما اور رعنا وغیرہ اصنافِ سخن میں پہلا انتخاب اردو میں ڈاکٹر ہرگانوی نے ہی دیا ہے۔ صنف ''غزل نما'' میں تحقیق سے کام لے کر مناظر عاشق ہرگانوی نے ثابت کیا کہ شاہد جمیل اس کے موجد ہیں۔ انھوں نے اپنے رسالہ ''کوہسار جرنل'' کا ''غزل نما نمبر'' شائع کیا۔ ساتھ ہی غزل نما کا انتخاب اور غزل نما پر مضامین کا مجموعہ شائع کر کے پوری اردو دنیا میں ایسی گونج پیدا کر دی کہ میٹرو چینل کراچی پاکستان کے پروڈیوسر فہیم جاوید نے ہرگانوی صاحب کو فون کیا کہ وہ غزل نما پر انٹرویو لینا چاہتے ہیں جو پورے ایشیا کے سامعین کے لئے ہوگا۔ آخر طے پایا کہ انٹرویو لینے کے ساتھ ایک مذاکرہ بھی کیا جائے، جس میں شاہد جمیل (انڈیا)

ہرگانوی تنوع پسند ہیں۔ مشاہیر ادب سے انٹرویو کی ۶/کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زہرہ داؤدی، انور شیخ اور جاسوسی ناول نگار عارف مارہروی سے الگ الگ موضوعات پر پوری پوری کتابیں ہیں۔ وہ چوں کہ ہندی میں بھی اپنی پہچان رکھتے ہیں، اس لیے ہندی میں ۲۰۱۶ء سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے۔

اور عبیداللہ ساگر (کراچی) بھی شریک ہوں گے۔ افشاں سحر اینکر ہوں گی۔ یہ مذاکرہ ۱۹/مارچ ۲۰۱۲ء کو پونے دو گھنٹہ تک نشر ہوتا رہا، جسے دونوں ممالک کے پرنٹ میڈیا نے خوب اچھالا۔ اسی طرح ای ٹی وی اردو نے مناظر عاشق ہرگانوی کے گھر جا کر چار گھنٹے تک شوٹنگ کی تھی اور ہر زاویے سے ان سے انٹرویو لیا تھا۔ اڑیا ٹی وی نے بھی مناظر صاحب کے گھر جا کر ریکارڈنگ کی تھی۔ یہ انٹرویو بھی ٹیلی کاسٹ ہوا۔

مناظر عاشق ہرگانوی نے جاپانی اصنافِ سخن پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ ہائیکو جیسی صنف کا پہلا انتخاب اردو کو ان کا کارنامہ ہے۔ پانچ، سات، پانچ سلیبل کی اس صنف کے لیے اردو کی ۳۷/بحریں وضع کر کے شاعروں کے لیے اس صنف میں طبع آزمائی کی راہ آسان کر دی ہے۔ جاپانی صنف 'رینگا' کے تین مجموعے ''رینگا'' ڈاکٹر فراز حامدی کے اشتراک سے، ''سناٹوں کا شور'' حلیم صابر کے اشتراک سے اور ''سلسلے اجالوں کے'' احسان ثاقب کے اشتراک سے شائع کر چکے ہیں۔ رینگا میں پانچ مصرعے ہوتے ہیں جن میں تین مصرعہ ایک شاعر کہتا ہے اور دو مصرعے میں دوسرا شاعر بات مکمل کرتا ہے۔ جیسا کہ اظہر من الشّمس ہے کہ آزاد غزل کے موجد مظہر امام ہیں لیکن بقول ان کے اس کی گود بھرائی اور رفتار پکڑنے کی کوششوں کا کام مناظر عاشق ہرگانوی نے کیا ہے۔ اپنے رسالہ 'کوہسار جرنل' کے ذریعہ اور 'گلبن' احمد آباد، 'توازن' مالیگاؤں، 'اسباق' پونا، 'معلم اردو' لکھنؤ، 'صریر' کراچی، 'سخنور' کراچی، 'جدید ادب' خان پور (پاکستان) وغیرہ رسائل کے ذریعہ انہوں نے آزاد غزل سے متعلق سوالنامہ جاری کر کے اور دوسرے ذرائع استعمال کر کے اس صنف سخن کو نئی زندگی، حیاتِ نو اور تیز رفتاری عطا کی۔ خود اپنے رسالہ 'کوہسار جرنل' کا 'آزاد غزل نمبر' شائع کیا جس میں مضامین کے علاوہ ۱۵۶/شعراء کی آزاد غزلیں شامل تھیں۔ مناظر صاحب ۲۰۱۵ء میں حج بیت اللہ کو گئے

تھے۔ جانے سے قبل انھوں نے اپنی نعتوں کا مجموعہ ''ہر سانس محمد ﷺ پڑھتی ہے'' شائع کرایا تھا جسے ہند و پاک پیمانے پر قبولیت ملی ہے ۔نعتوں کے اس مجموعے کا انگریزی ترجمہ جناب سیّد محمود احمد کریمی نے "Encomium to Holy Prophet" کے نام سے شائع کرایا ہے۔ڈاکٹر ہرگانوی کی نعت گوئی پر بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے ۲۵؍مضامین اور ۶؍منظوم تاثرات کو ڈاکٹر زہرہ شمائل (دربھنگہ) نے ۲۰۱۷ء میں کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ان کی زودگوئی کے باوجود ان کے یہاں یکسانیت یا مونوٹونی کا احساس نہیں ہوتا۔ مناظر عاشق ہرگانوی ہندی اور انگریزی زبان میں بھی لکھتے ہیں۔ ہندی میں ۱۵؍اور انگریزی میں دو کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ہندی میں ان کے کام کی اہمیت ایسی ہے کہ ہندی کے معروف ناقد یُگل کشور پرساد نے ان پر ہندی میں ۲۱۲ ؍صفحے کی تنقیدی کتاب 'مناظر عاشق ہرگانوی سرجک ایوم سمالوچک' کے نام سے لکھ کر شائع کرائی اور ان کی کتاب ''عضویاتی غزلیں'' جب ہندی میں منظرِ عام پر آئی تو ان غزلوں کا تجزیہ بھی ہندی میں کتابی شکل میں ''ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی سراپا سوندریہ غزلیں: 'درشٹی پری درشٹی'' کے نام سے یگل کشور پرساد نے شائع کرایا ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی کے لکھے پر ۶۴؍کتابیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ان میں میری کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی کا لٹریری زون'' بھی شامل ہے جس کا کینوس بڑا ہے اور اس میں بہت سارے پہلو کی بازآفرینی ہے۔ آج اردو ادب میں جہاں کساد بازاری ہے، جہاں تعصب ہے، جہاں استحصال کی کوششیں ہیں وہیں ان پر کتابیں لکھنے اور مرتب کرنے کی کوششیں بھی ہورہی ہیں۔ امریکہ میں مقیم ڈاکٹر مظفر مہدی کی کتاب 'مناظر عاشق ہرگانوی کی شاعرانہ جہتیں' اس لئے اہم ہے کہ شاعری کی مختلف اصناف میں ان کی کاوشوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ اطلاع مسرت بخش ہے کہ ان پر مزید ۵؍کتابیں لکھی جاچکی ہیں، جو زیرِ اشاعت ہیں ۔ان دنوں پروفیسر ہرگانوی یو جی سی اور نیٹ کے نصاب کے مطابق ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی کے لیے کتابیں تیار کررہے ہیں جس میں کتاب ''مناظرِ ادب'' (حصہ نظم، حصہ غزل اور حصہ انشائیہ) شائع ہوچکی ہیں۔حصہ افسانہ زیرِ طبع ہے۔اسی سلسلے میں خواجہ احمد عباس کے پہلے افسانوی مجموعہ 'ایک لڑکی' کو انہوں نے ۱۶۰؍ معروضی سوالات کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے۔

> مناظر عاشق ہرگانوی ہندی اور انگریزی زبان میں بھی لکھتے ہیں۔ ہندی میں ۱۵؍اور انگریزی میں دو کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ہندی میں ان کے کام کی اہمیت ایسی ہے کہ ہندی کے معروف ناقد یُگل کشور پرساد نے ان پر ہندی میں ۲۱۲ ؍صفحے کی تنقیدی کتاب 'مناظر عاشق ہرگانوی سرجک ایوم سمالوچک' کے نام سے لکھ کر شائع کرائی۔

مناظر عاشق ہرگانوی کی طنز و مزاح نگاری پر کتاب 'ہرگانوی: طنز و مزاح کے دائرے میں'' چھپ کر آگئی ہے۔ اس میں مشاہیر ادب کے ۲۳ مضامین ااور چھ مشاہیر کے نقد پارے شامل ہیں جن میں جمیل جالبی، جگن ناتھ آزاد، مشفق خواجہ، عنوان چشتی، کرامت علی کرامت، یوسف ناظم، انور سدید وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے اردو غزل کی روایت میں اضافہ کرتے ہوئے ۲۰۱۰ء میں عورتوں کے جسمانی اعضاء کے ۲۲؍حصے پر ۲۴؍غزلیں کہی ہیں جو فل سائز کی ۲۲؍تصویروں کے ساتھ ''عضویاتی غزلیں'' کے نام سے منظر عام پر آئیں۔ یہ غزلیں انگریزی اور ہندی میں تصویروں کے ساتھ کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں۔ ویسے ہرگانوی نے مختلف اصناف اور موضوعات پر اردو کو نئی کتابیں دی ہیں۔ ''ماں'' جیسے موضوع پر منثور اور منظوم ڈاکٹر ہرگانوی کی پانچ کتابیں ہیں۔ غزلوں کے کئی انتخاب بھی ان کے کارناموں میں شامل ہیں۔ غزل میں نیا تجربہ کرتے ہوئے انھوں نے احسان ثاقب کے ساتھ مل کر ''مشترکہ غزلیں'' جیسی کتاب اردو کو دی ہے۔ طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں ان کی کتاب ''ادب میں گھوسٹ ازم'' اہمیت کی حامل ہے۔اس حوالے سے نئی کتاب ''اردو ادب میں جوتے'' شائع ہوچکی ہے جس کی ۲۰۰؍جلدیں خرید کر قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی نے لائبریریوں میں تقسیم کی ہیں۔ درجنوں

افسانوں، نظموں اور مضامین کے تراجم کے ساتھ ترجمہ شدہ ناول ''گاندھاری'' بھی منظر عام پر آکر ادب کی فضا میں سانس لے رہا ہے۔ اس ناول کو بک ٹرسٹ آف انڈیا، دہلی نے شائع کیا ہے۔ ان کا ترجمہ شدہ ناول ''گرم پہلوؤں والا مکان'' پہلا ریڈیو ناول ہے جسے مقبولیت ملی ہے۔ ''لو جہاد'' پر ترجمہ شدہ ناول 'بھیگی ہوئی لڑکی' بھی شائع ہوچکی ہے۔ ۲۰۰۹ء میں ''ژرف گوئی'' جیسی کتاب بھی منظر عام پر آئی تھی جس پر نذیر فتح پوری نے پوری کتاب لکھی تھی اور ان دونوں کتابوں پر جتنے مضامین آئے تھے انھیں شبیر فراز فتح پوری نے ۲۰۱۹ء میں کتابی شکل میں شائع کی ہے۔ غزل نما اور دہشت گردی پر ان کی منظوم کتابیں مقبول ہوئی ہیں۔ ''لسانی لغت'' کے چار ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں اور ہند و پاک کے کئی رسائل اسے قسط وار شائع کرچکے ہیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی انگیکا زبان میں بھی لکھتے رہے ہیں جس میں ان کی پانچ کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں اور اس زبان اور اس کے ادب کو پہلی بار اردو میں انھوں نے ''انگیکا زبان: پس منظر، پیش منظر'' کتاب لکھ کر متعارف کرایا ہے۔ اس کتاب پر انھیں یوپی اردو اکاڈمی سے انعام مل چکا ہے۔ اس کی اشاعت کیلئے بہار اردو اکاڈمی نے مالی تعاون دیا تھا۔ انگیکا زبان بھاگل پور یونیورسٹی میں ایم اے تک پڑھائی جاتی ہے اور اس میں پی ایچ ڈی بھی ہورہی ہے لیکن اس زبان میں لغت نہیں ہے۔ لغت تیار کرنے کی ذمہ داری انگیکا اکاڈمی نے ڈاکٹر موصوف کو دی ہے جس پر وہ منفرد انداز سے کام کررہے ہیں کہ انگیکا کے الفاظ کے معنیٰ اردو، ہندی اور انگریزی میں دے کر منفرد ڈکشنری تیار کررہے ہیں۔ انگیکا زبان میں بچوں کے پہلے ناول نگار ڈاکٹر ہرگانوی ہیں۔ تین ناول تواتر سے شائع کراکے اپنا مقام محفوظ کرلیا ہے۔ انگریزی میں مناظر عاشق ہرگانوی کے پوئم کا مجموعہ "Never Again" بہت مقبول ہوا تھا۔ امریکہ کے ناقدین نے بھی اس کتاب کے

> مناظر عاشق ہرگانوی انگیکا زبان میں بھی لکھتے رہے ہیں جس میں ان کی پانچ کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں اور اس زبان اور اس کے ادب کو پہلی بار اردو میں انھوں نے ''انگیکا زبان: پس منظر، پیش منظر'' کتاب لکھ کر متعارف کرایا ہے۔ اس کتاب پر انھیں یوپی اردو اکاڈمی سے انعام مل چکا ہے۔

حوالے سے مضامین لکھے ہیں۔

موصوف نے سفرنامے بھی لکھے ہیں۔ ان میں ''لندن یاترا'' اور ''پونا یاترا'' جیسی کتابیں مقبول ہوئی ہیں۔ اردو افسانچوں کا پہلا، دوسرا اور تیسرا عالمی انتخاب ڈاکٹر ہرگانوی نے ہی اردو کو دیا ہے۔ 'قوس قزح'، 'پرت در پرت' اور 'خواتین کے افسانچے' کے نام سے ان کی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں 'قوس قزح' اردو، ہندی، انگریزی اور بنگلہ میں ایک ساتھ شائع ہوکر مقبولیت حاصل کرچکی ہے۔ اردو افسانچوں پر ان کی نگرانی میں پہلی پی ایچ ڈی ہوئی ہے اور افسانچوں کے حوالے سے نذیر فتح پوری نے کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی کی افسانچہ دوستی'' لکھی ہے۔ کسی افسانچہ نگار پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔ ان دنوں وہ افسانچوں پر تنقیدی کتاب لکھ رہے ہیں۔ ساتھ ہی مناظر صاحب کے ایک افسانچہ 'حملہ کے وقت' پر ۳۰/تجزیے شائع ہوئے ہیں۔ ہندی، انگریزی اور تیلگو میں بھی اس کا ترجمہ ہوا ہے۔ سارا مواد کتابی شکل میں زیرِ طبع ہے جس میں ۵۰/سے زیادہ تجزیے اور ۱۳-۱۴ زبان میں اس کا ترجمہ ایک ہی کتاب میں شامل ہیں۔ اردو آٹوگراف بک بھی اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں ان کے ذریعہ مشاہیرِ ادب کے ۱۷۱/آٹوگراف کے عکس، تعارف اور تصویر کے ساتھ شامل ہیں۔ ان کی کتاب ''ہمعصر اردو رسائل: جائزہ'' بھی انفرادیت رکھتی ہے۔ ۴۲۸/صفحے کی یہ کتاب اردو صحافت میں اضافہ ہے، جس میں اکیسویں صدی میں پوری دنیا سے شائع ہونے والے ۲۵۴/رسائل پر ان کے تبصرے پتے کے ساتھ شامل ہیں۔ اس کتاب کے دو ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اسی نوعیت کی ایک اور کتاب 'اکیسویں صدی کے ہم عصر اردو رسائل' بھی شائع ہوچکی ہے جس میں ۱۷۲/رسائل پر تبصرہ ہے۔ یہ کتاب ۳۰۴ صفحے کی ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی صحافی بھی ہیں۔ انہوں نے ادبی صحافت میں کئی اختراعی تجربے کئے ہیں اور اپنے رسالہ ''کوہسار

جرنل'' کے ذریعہ پوری اردو دنیا کے قارئین اور قلم کاروں کو متوجہ کیا ہے اور اپنے خیالات کے حصار میں لانے کی کامیاب سعی کی ہے۔ پوری اردو دنیا کے قریب تین درجن رسائل کی ادارت میں شامل رہے ہیں۔ سوئیڈن کے رسالہ ''زاویہ'' کو ایڈٹ کرتے رہے ہیں اور ۱۹۷۹ء سے اپنا رسالہ ''کوہسار جرنل'' نکال رہے ہیں جس میں نئی اور متروک اصناف کی ترویج و اشاعت ہو رہی ہے۔ ابھی تک اس کے ۱۸۰؍شمارے منظر عام پر آچکے ہیں۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو زبان اور اظہار پر اتنی قدرت ہے کہ قلم کی بوند سے نوری شعاع کے ست رنگے منظر کو اپنی گرفت میں لینے کا ہنر جانتے ہیں۔ انہوں نے ادب سے عشق کر کے حیات و کائنات کی تفہیم اور ترسیل اپنی بھرپور رعنائی اور توانائی کے ساتھ کی ہے۔ فنی بصیرت، تخلیقی ہنرمندی اور عصری آگہی کی نقش گری ان کی تحریروں کو منور کرتی ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی فطرتاً حساس ہیں۔ ساتھ ہی اچھے فن کار، شاعر اور ادیب ہونے کی غیر معمولی صلاحیت ان میں ہے۔ وہ تہذیبی تواتر اور تمدنی استحکام کے پوشیدہ امکانات پر روشنی ڈالنے کی قدرت سے مالا مال ہیں۔ اسی لیے عرفانِ ذات، کشفِ حیات اور اظہار و ابلاغ کی منزلیں طے کرتے رہے ہیں جن سے ان کی فنکارانہ شخصیت کی صناعی آفاقی مظہر کی حامل بن چکی ہے۔

تنقید پر مناظر عاشق ہرگانوی کی ۱۲۵؍کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں ''تنقیدی زاویے، تنقیدی اساس، تنقیدی شعور، فہم و تفہیم، تنقید و تفہیم، امتزاج، ناگزیر، تنقیدی دبستان، تنقیدی مضامین، ترسیل و تفہیم وغیرہ کے علاوہ عبدالحلیم شرر، گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، محمد حسن، جوگندر پال، مظہر امام، طاہر سعید ہارون، خوشتر مکرانوی، فراز حامدی، نذیر فتح پوری، نریش کمار شاد، پریمی رومانی، کلیم عاجز، رضوان احمد، علیم طاہر، منصور عمر، ساحر شیوی، رحمانی سلیم احمد، سیّد ظفر ہاشمی، سجاد بخاری، علیم صبا نویدی، ودیا ساگر آنند، سعید روشن، شاہد جمیل، مشتاق احمد، ڈاکٹر امام اعظم وغیرہ پر تنقیدی کتابوں کے علاوہ ابھی پچھلے دنوں 'نیویارک میں اردو غزل'، برطانیہ کے ہمعصر ادیب و شاعر، مغربی بنگال کے ہمعصر ادیب و شاعر وغیرہ تنقیدی کتابیں منظر عام پر آکر مقبول ہو چکی ہیں۔ موضوعی تنقید پر، ساختیاتی تنقید پر، پسِ ساختیاتی تنقید پر، امتزاجی تنقید پر، تخلیقیت پسند تنقید پر اور سائنٹفک تنقید پر مناظر عاشق ہرگانوی کی الگ الگ کتابیں ہیں جن کا ذکر تازہ ہواؤں کی طرح ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کو زبان اور اظہار پر اتنی قدرت ہے کہ قلم کی بوند سے نوری شعاع کے ست رنگے منظر کو اپنی گرفت میں لینے کا ہنر جانتے ہیں۔ انہوں نے ادب سے عشق کر کے حیات و کائنات کی تفہیم اور ترسیل اپنی بھرپور رعنائی اور توانائی کے ساتھ کی ہے۔

دو تین سال میں ڈاکٹر ہرگانوی کی چند اہم کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں، جو چرچے میں ہیں۔ ان کی کتاب ''عضویاتی غزلیں'' کا انگریزی ترجمہ دربھنگہ کے ماہرِ تعلیم سیّد محمود احمد کریمی نے Organwise Ghazalen کے نام سے کیا ہے۔ اس میں نسوانی جسم کے ہر عضو پر تصویریں بھی ہیں۔ ڈاکٹر ہرگانوی نے خود پر طویل نظم ''ایک نظم اپنے لئے'' لکھی تھی۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بہرائچ کے محمد حسنین نے A Poem for myself کے نام سے کیا ہے جس میں مشاہیرِ ادب کے ساتھ ڈاکٹر ہرگانوی کی ۲۷؍تصویریں بھی شامل ہیں۔ ''عضویاتی غزلیں'' کا ہندی ترجمہ خود مصنف نے کیا ہے۔ یہ کتاب ''سراپا سوندریہ غزلیں'' کے نام سے باتصویر منظرِ عام پر آچکی ہے۔ مناظر صاحب نے تقریباً ۱۵۰؍افسانے لکھے ہیں جو ۱۹۶۳ء سے رسائل میں شائع اور ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہوتے رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''بکھری اکائیاں'' اپریل ۲۰۱۶ء میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس کتاب میں ۳۶؍افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں پر اتنے مضامین لکھے گئے ہیں کہ دو جلدوں میں ان کی اشاعت ہوئی ہے۔ ہرگانوی صاحب پر مزید کئی نئی کتابیں قارئین کو متوجہ کر رہی ہیں۔ بھاگل پور فساد پر ڈاکٹر ہرگانوی کی منظوم کتاب ''آنکھوں دیکھی'' بیحد مقبول ہوئی تھی۔ اس پر اردو دنیا کے بیشتر مشاہیرِ ادب نے کچھ نہ کچھ لکھا تھا۔ ان میں سے بیشتر مواد کو احمد معراج (کولکاتا) نے ''مناظر عاشق ہرگانوی کی

آنکھوں دیکھی: تجزیہ'' کے نام سے ترتیب دیا ہے۔ ۲۰۰/صفحے کی یہ کتاب فساد پر اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر ہرگانوی کی ۲/اور کتابیں ''فراز حامدی اختراعی ذہن کے نابغۂ عصر'' اور ''نادید کا تخلیقیت پسند مطالعہ'' بھی منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ان پر ڈاکٹر شبانہ خاتون کی کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی کی تنقیدی شناخت''، محمد افضل خاں کی کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی: شاعروں کی دوربین نگاہ میں'' منظرِ عام پر آکر توجہ کا مرکز بنی ہیں۔ صفی الرحمان راعین کی کتابیں ''مناظر عاشق ہرگانوی کی ادبی آبیاری''، ''مناظر عاشق ہرگانوی کی ادبی فنکاری''، ''مناظر عاشق ہرگانوی اور ڈاک ٹکٹ کی اعزاز یابی'' اور ''ہرگانوی اور کوہسار جرنل کی رجحان سازی'' منظرِعام پر آچکی ہیں۔ نذیر فتح پوری نے مناظر صاحب پر ۸/کتابیں لکھی ہیں۔ بچوں کے لیے ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''ہم دونوں کی غلطی'' ابھی ابھی منظرِعام پر آیا ہے۔ یوپی اردو اکاڈمی (لکھنؤ) سے ۲۰۸/صفحات پر مشتمل ان کی کتاب ''کلیم عاجز'' شائع ہوچکی ہے۔ ساہتیہ اکادمی (دہلی) سے ان کی نئی کتاب ''نریش کمار شاد'' بھی منظرعام پر آچکی ہے۔ ۳۲۵/صفحات پر مشتمل اپنے موضوع پر پہلی کتاب ''ایک سو ایک خواتین تنقید نگار (اکیسویں صدی اور ہندوستان کے تناظر میں)'' منظر عام میں آکر چرچا میں ہے۔ ۲۰۱۹ء میں ہی ان کے ناول ''شبنمی لمس کے بعد'' کے منظوم تجزیے (۷/زبان میں ایک ساتھ)، ''میر تقی میر: بچوں کے شاعر''، ''مرزا محمد رفیع سودا: بچوں کے شاعر'' اور ''سعادت حسن منٹو: بچوں کے کہانی کار'' شائع ہوچکی ہیں۔ ابھی ابھی ان کی کتاب ''عزیز احمد: بچوں کے ناول نگار'' بھی شائع ہوئی ہے۔ مناظر صاحب کے ناول ''شبنمی لمس کے بعد'' پر نذیر فتح پوری اور ڈاکٹر خالد حسین خاں کی تجزیاتی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ مناظر عاشق ہرگانوی کے 'رینگا' کو محمد حسنین نے انگریزی میں 'The Chain of Light' کے نام سے ترجمہ کیا ہے جس کی اشاعت ہوچکی ہے۔

> نذیر فتح پوری نے مناظر صاحب پر ۸/کتابیں لکھی ہیں۔ بچوں کے لیے ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''ہم دونوں کی غلطی'' ابھی ابھی منظرِعام پر آیا ہے۔ یوپی اردو اکاڈمی (لکھنؤ) سے ۲۰۸/صفحات پر مشتمل ان کی کتاب ''کلیم عاجز'' شائع ہو چکی ہے۔ ساہتیہ اکادمی (دہلی) سے ان کی نئی کتاب ''نریش کمار شاد'' بھی منظرعام پر آچکی ہے۔

'رینگا' کا ہی ایک اور مجموعہ محمد حسنین نے ترجمہ کردیا ہے۔ The Faith of Morn کے نام سے یہ کتاب بھی شائع ہوچکی ہے۔ ساتھ ہی The Noise of Silence بھی شائع ہوچکی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر ہرگانوی کے ۲۲/افسانوں کا انگریزی ترجمہ سید محمود احمد کریمی نے 'Assortment of short-Stories' کے نام سے کیا ہے۔ یہ کتاب بیحد مقبول ہوئی ہے۔ مناظر صاحب کی ایک کتاب ''یادیں باتیں'' آئی تھی جس میں ۱۱/مرحوم مشاہیر کی یادیں، باتیں شامل تھیں۔ ۲۰۲۰ء کے جنوری میں اس کی دوسری جلد ''یادوں کے آئینے میں'' منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس میں ۱۴/مرحوم مشاہیر کی چہل پہل شامل ہے۔ یہ دونوں کتابیں جداگانہ حیثیت کی حامل ہیں۔ پروفیسر عبدالمنان طرزی نے 'مناظر عاشق ہرگانوی: توشیحی نظمیں'' کے نام سے منظوم کتاب لکھی ہے جو چھپ چکی ہے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی ہے کیونکہ اس میں وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، جمیل جالبی اور انور سدید کے ان چار اقوال کے پیش نظر توشیحی نظم لکھی گئی ہے جو مناظر عاشق ہرگانوی سے متعلق ہیں۔ اس کتاب میں مناظر صاحب کی مشاہیر ادب کے ساتھ ۲۷/تصویریں بھی ہیں۔ ڈاکٹر عشرت بیتاب کی کتاب ''ہرگانوی کی تخلیقی بصیرت'' ۲۰۱۸ء میں اور ڈاکٹر اسما پروین کی کتاب ''ہرگانوی اور ہائیکو نگاری'' ۲۰۱۹ء میں اشاعت پذیر ہوئی ہیں۔ محمد سبحان کی کتاب ''ہرگانوی کی لندن یاترا: عہد کا البم'' اور طلعت انجم فخر کی کتاب ''ہرگانوی: پچھّم بردوان کے ناقدین کا محاسبہ'' ۲۰۱۹ء میں آئی ہیں۔ اس کے علاوہ مناظر عاشق ہرگانوی کے نام سہیل عظیم آبادی کے ۴۸/خطوط کتابی شکل میں مع عکس تحریر منظر عام پر آچکے ہیں۔ ۲۰۱۸ء میں ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''تنقیدی اساس''، ''فہم و تفہیم''، ''تنقیدی شعور'' اور ''ساحر شیوی کا نیا شناخت نامہ'' شائع ہوچکے ہیں۔ ساتھ ہی ڈاکٹر عبدالمنان طرزی کی 'طرزِ بیانی'، جاسوسی ناول نگار 'عارف مارہروی سے انٹرویو' بھی

چھپ چکی ہیں۔ بی الہام فاطمہ کی کتاب ''مناظر عاشق ہرگانوی: خواتین قلم کار کی نظر میں'' پریس سے آچکی ہے۔ یہ کتاب ۲۴۰؍ صفحات پر محیط ہے۔ ''ڈاکٹر امام اعظم کی باز آفرینی''، ''پروفیسر محمد حسن بنام پروفیسر عبدالواسع'' اور ''رعنا'' کے ساتھ ''سرگزشتِ اسیر'' بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔ مناظر عاشق ہرگانوی پر ڈاکٹر احسان عالم کی کتابیں ''ہرگانوی: فکر و نظر کی چند جہتیں'' اور ''ہرگانوی کے مختلف رنگ'' بھی شائع ہوچکی ہیں۔ مناظر عاشق ہرگانوی پر نذیر فتح پوری کی نئی کتاب کمپوزنگ میں ہے۔ گذشتہ دنوں دربھنگہ میں مناظر عاشق ہرگانوی پر ایک سیمینار ہوا تھا جس میں پڑھے گئے اور موصول شدہ مضامین کو منصور خوشتر نے ''پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی: ایک نابغہ'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ کتاب ''جمیل جالبی: یادیں، باتیں'' بھی منظرِ عام پر آچکی ہے۔ ۲۰۱۹ء میں ہرگانوی صاحب کی پندرہ کتابیں اور ان پر ۱۰؍ کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ موصوف ''نینی تال یاترا'' کا ڈول ڈال چکے ہیں۔ نظام صدیقی، پروفیسر ارتضیٰ کریم اور ڈاکٹر عبدالحق امام پر ان کی کتابیں جلد متوقع ہیں۔ مناظر عاشق ہرگانوی پر مقالہ لکھ کر عبید حاصل نے جے پور یونیورسٹی (راجستھان) سے ایم فل، ریحانہ عزیز نے چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ (یوپی) اور ایم عالم نے ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ (جھارکھنڈ) سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ سدھو، کانہو یونیورسٹی، دُمکا (جھارکھنڈ) میں پی ایچ ڈی کے لیے رجسٹریشن ہوا ہے۔ ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ (بہار) سے محترمہ عذرا مناظ ''مناظر عاشق ہرگانوی: ایک منفرد افسانہ نگار'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لے چکی ہیں۔ بھوپیندر نرائن منڈل یونیورسٹی، مدھے پورہ (بہار) سے محمد فاروق (کولکاتا) ''پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی طنز و مزاح نگاری'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ قلم بند کررہے ہیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی کی ادبی اور

مناظر عاشق ہرگانوی کی ذاتی زندگی پر توجہ دی جائے تو انکے یہاں آسودگی کی جلوہ نمائی ملتی ہے ان کی اہلیہ محترمہ فرزانہ پروین بھاگلپور یونیورسٹی سے اردو آنرس میں ٹاپر رہنے کے باوجود ہاؤس وائف ہیں۔ انکے دو بیٹے انجینئر ذیشان فیصل اور انجینئر دانش حسن ہیں۔ ایک بیٹی بریشہ پروین ہے جو ڈاکٹر ہے اور انکے داماد احتشام احمد روشن بھی ایم ایس ڈاکٹر ہیں۔

تعلیمی خدمات کے پیش نظر ہندوستانی محکمہ ڈاک نے ۲۰۱۸ء میں ان پر پانچ روپے کا ڈاک ٹکٹ جاری کیا ہے، جو نہ صرف ان کے لئے بلکہ اردو حلقوں کے لئے بھی بڑا اعزاز ہے۔ ۲۰۱۸ء میں ہی ہندی اور انگریزی میں لکھنے کی وجہ سے دہلی کے ادارہ ''انگ مدد فاؤنڈیشن'' نے بھاگلپور جاکر اور پروگرام کر کے ''تلکا مانجھی راشٹریہ سمّان'' دیا ہے اور اسی سال انگریزی میں لکھنے کی وجہ سے دہلی کے ادارہ ''فرینڈ شپ فورم آف انڈیا'' نے ''گولڈن پرسنالٹی ایوارڈ'' سے نوازا ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی کی ذاتی زندگی پر توجہ دی جائے تو ان کے یہاں آسودگی کی جلوہ نمائی ملتی ہے۔ ان کی اہلیہ محترمہ فرزانہ پروین بھاگلپور یونیورسٹی سے اردو آنرس میں ٹاپر رہنے کے باوجود ہاؤس وائف ہیں۔ ان کے دو بیٹے انجینئر ذیشان فیصل اور انجینئر دانش حسن ہیں۔ ایک بیٹی بریشہ پروین ہے جو ڈاکٹر ہے اور ان کے داماد احتشام احمد روشن بھی ایم ایس ڈاکٹر ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے ذیشان فیصل کی بیگم بھی ڈاکٹر ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے دادا خان بہادر حاجی عبدالرحیم مرحوم وکالت کرتے تھے۔ ان کے والد عبدالسلام صدیقی مرحوم بینک میں منیجر تھے۔ ان کی والدہ عنصری خاتون ہاؤس وائف تھیں۔ مناظر عاشق ہرگانوی کی دونوں بہنوں اور بہنوئیوں کا انتقال ہوچکا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی بھی گزشتہ ۱۷؍اپریل ۲۰۲۱ء دوپہر ڈھائی بجے کے قریب اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ تدفین دوسرے روز یعنی ۱۸؍اپریل ۲۰۲۱ء صبح نو بجے ان کی رہائش گاہ کے نزدیک برہپورہ بھیکن پور قبرستان، بھاگلپور میں عمل میں آئی۔ مضمون کا اختتام اپنے اس قطعہ پر کررہا ہوں:

شاعرِ شیریں دہن تھے ڈاکٹر ہرگانوی
نازشِ شعر و سخن تھے ڈاکٹر ہرگانوی
جن کی ہر تحریر میں پنہاں شعورِ آگہی
موجبِ معیارِ فن تھے ڈاکٹر ہرگانوی

.....



خلیل احسن
سابق ڈسٹرکٹ آڈٹ آفیسر
E-07, سرودے نگر (اندرا نگر) لکھنؤ
Mob: 9415462706

عنبر بہرائچی کا تخلیقی شعور غزل کے آئینہ میں

آخر مٹی نے ان کو بھی ڈھانپ لیا
ہاتھوں پر آکاش لئے جو پھرتے تھے

عنبر بہرائچی کا یہ شعر جہاں اُن کی رخصت ہونے اور موت جیسی ابدی حقیقت سے پردہ اُٹھاتا ہے وہیں یہ ہم عصر شعراء وادباء کی ناگہانی جدائی کے پس منظر اور پیش منظر کو بھی آئینہ دکھاتا ہے۔ کسے معلوم تھا کہ یہ وبائی سال ہم سے اِس عاشقِ اردو کو ہمیشہ کے لئے جدا کردے گا اور ہمیں اُس کی دائمی جدائی پر اپنے احساسات وتأثرات کو رقم کرنے کے لئے اُسی کے شعر کو حوالہ بنانا پڑے گا۔ یہ اِس شعر کی صداقت وحقیقت ہے جو اپنے تخلیق کار سے حیات وممات کے اصل رمز کو آشکار کرنے کے لئے شعری اظہار پر مجبور کرتی ہے۔ شعرِ مذکور کے مصرعہ ثانی ''ہاتھوں پر آکاش لئے جو پھرتے تھے'' کے ضمن میں عنبر کا آئینہ حیات متعدد مناظر پیش کرتا ہے۔

☆ تعلیمی فراغت کے بعد یوپی کے سول سروس (P.C.S) مقابلہ جاتی امتحان میں کامیابی کا منظر۔

☆ سول سروس کے اعلیٰ عہدوں پر رہتے ہوئے ایک فرض شناس افسر کی مصروف زندگی کا منظر

☆ فرائض کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق کی آبیاری وسرشاری کے تحت ایک تخلیق کار کے مختلف ادبی جہات میں رواں دواں تخلیقی سفر کا روشن منظر

عنبر کے آئینۂ حیات کے وہ مناظر جو ان کی ذاتی وخانگی زندگی سے متعلق ہیں، ان کی موت ۷ رمئی ۲۰۲۱ء کو ہوئی ہے، شاید اِسی موت کے لئے عنبر نے شعر کا مصرع اول نظم کیا ہے۔

''آخر مٹی نے ان کو بھی ڈھانپ لیا''

۷ رمئی ۲۰۲۱ء کو عنبر کے پیکرِ خاکی کو بظاہر مٹی نے ڈھانپ لیا ہے اور وہ آغوشِ لحد میں پہنچ کر ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں، مگر اسی کے ساتھ ساتھ دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ وہ ایک تخلیق کار کی حیثیت سے اپنے تخلیقی فن پاروں کی صورت میں آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہمیشہ موجود رہیں گے۔ شاید اسی لئے عنبر نے اپنی زندگی کے اعلیٰ مقام ومنصب پر فائز ہونے کے باوجود اپنا رشتہ فنونِ لطیفہ سے منقطع نہیں کیا۔

عنبر کے تخلیقی فن پارے جو اُن کو ہمیشہ عالمِ ادب میں بقائے دوام بخشیں گے، اُن کا آغاز ۱۹۸۷ء میں ایک رزمیہ شعری مجموعہ ''مہابھنشکرمن'' سے ہوتا ہے جس میں مہاتما گوتم بدھ کے فلسفۂ حیات کو پیش کیا گیا ہے۔ اِس کے بعد ۱۹۹۰ء میں شعری مجموعہ ''دوب'' اور ۱۹۹۵ء شعری مجموعہ ''سوکھی ٹہنی پر ہریل'' آیا۔ نظموں پر مشتمل یہی وہ فن پارہ ہے، جس نے عنبر کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتگان کی صف میں جگہ دی اور مقبولیت

کی معراج پر پہونچایا۔ ۱۹۹۶ء میں نعتیہ قصیدہ رزمیہ کی صورت میں ''لم یات نظیرک فی نظر'' کے عنوان سے شایع ہوا جس میں سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف ادوار کے واقعاتی پسِ منظر میں انتہائی بلند و پُرشکوہ انداز میں پیش کیا گیا ہے ۔ ۲۰۰۰ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا، ساتھ ہی اس پر ایک مذاکرہ (ڈاکٹر) سعود عالم قاسمی کی زیر صدارت جناب علی مبارک عثمانی (مرحوم) کے انتظام وانصرام میں اُن کی رہائش گاہ سترکھ (بارہ بنکی) میں ہوا، ۲۰۰۰ء میں ہی غزلوں کا مجموعہ ''گمنام جزیروں کی تمکنت'' اور ۲۰۱۰ء میں نعتیہ مجموعہ ''روپ انوپ'' شائع ہوا۔ ۲۰۱۳ء میں آخری شعری مجموعہ ''ملنگ ملہار'' شائع ہوکر مقبولِ خاص وعام ہوا۔

شعری سرمایہ کے علاوہ ان کی نثری تصانیف بھی اہمیت کی حامل ہیں، جواُن کی تنقیدی بصیرت اور سنسکرت زبان کے ادبِ عالیہ پر ان کی مکمل دسترس کی نشاندہی کرتی ہیں ان تصانیف میں اردو زبان کا یہ خوش فکر، سنجیدہ شاعر سنسکرت زبان وادب کا عالم نظر آتا ہے۔ یہاں ان کی کثیر الجہتی اور مختلف زبانوں کے ادبِ عالی سے اُن کی وابستگی، عشق کا اظہار ملتا ہے ۔ یہ تنقیدی سرمایہ اِن عناوین کے ساتھ منظرعام پر آیا جن سے مختلف مکتبۂ فکر کے اہلِ علم فیض یاب ہوئے:

۱۔ اقبالؔ اور ایک ادّھین ۔ ۱۹۸۵ء (ہندی زبان میں)

۲۔ سنسکرت شعریات۔ ۱۹۹۹ء (اردو)

۳۔ سنسکرت بوطیقا (چند جہات) ۲۰۰۳ء (اردو)

۴۔ آنند ورد ھن اور ان کی شعریات۔ ۲۰۰۷ء (اردو) (ساہتیہ اکادمی موگوگراف)

۵۔ سنسکرت شاعری۔ ۲۰۰۹ء (اردو)

مذکورہ حقائق سے واضح ہے کہ عنبرؔ کا ادبی سرمایہ مختلف اصنافِ ادب کے لسانی پیکر میں سامنے آیا ہے۔ اِس مضمون میں سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے، دوسرے مضمون کی طوالت بھی مانع ہے۔ اسلئے متذکرہ تمام ادبی سرمایہ سے اصنافِ شعری خصوصاً صنفِ غزل سے متعلق اُن کے شعری اختصاص تک یہ مضمون محدود رہے گا۔ قارئین کے ذہن میں یہ سوال آسکتا ہے کہ آخر غزلیہ شاعری ہی کیوں؟ عنبرؔ کے شعری اکتسابات وکمالات کے اصل جوہر تو نظم کے فارم میں ہی ظاہر ہوئے ہیں۔ اُنھیں ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ بھی نظموں پر مشتمل مجموعہ ''سوکھی ٹہنی پر ہریل'' کی نگارشات پر عطا ہوا تھا۔ اِس مضمون کی صورت میں عنبرؔ کی غزلیہ شاعری کی جانب شعوری طور پر میرے رجوع ہونے کی اصل وجہ درج بالا استفسار میں ہی پوشیدہ ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے حصول کے بعد اُن کا شعری پیکر ایک نظم وشاعر کی حیثیت سے اہلِ نقد نے تراشا اور اُن کی خدو خال اِس طرح اُبھارے کہ اُس میں ایک غزل گو شاعر کا وجود گم ہوتا نظر آیا۔ جبکہ عنبرؔ اپنے اولین مجموعۂ کلام ''دوب'' میں ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت کراتے نظر آتے ہیں۔ ''دوب'' مجموعہ کا یہ شعر اپنے تخلیق کار کا تعارف اِس طرح کراتا ہے:

عادتاً پتھر پہ گل بوٹے بنائے عمر بھر
نقش کوئی ریت پر میں نے کبھی کھینچا نہیں

مذکور بالا شعر کے حوالہ سے ان کا نظریہ فن واضح ہوجاتا ہے۔ اقبالؔ کی زبان میں یوں کہیں گے: ''نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر'' وہ اپنے خونِ جگر سے ایسے نقش اور گل بوٹے بناتے ہیں جن کا اثر دائمی رہتا ہے، ریت پر نقش بنانا ان کی فطرت نہیں کیونکہ ان کے اثرات وقتی اور عارضی ہوتے ہیں۔ یہ فنکار بہ حیثیت شاعر اپنا تخلیقی نظریہ سنسکرت شعریات کے عالم اچاریہ کنتک کے الفاظ میں یوں پیش کرتا ہے۔

''لفظ اور معنی جب ایک ہی جیسی خصوصیات والے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کی خوبصورتی میں اِضافہ کرتے ہیں، تبھی شعر کی ہوتی ہے''۔ (دیباچہ ''دوب'' ص۵)

پہلا مجموعہ کلام ''دوب'' اپنے تخلیق کار کے اسی شعری نظریہ کی نہ صرف عکاسی کرتا ہے بلکہ ایک ایسے تخلیق کار کا تعارف بھی کراتا ہے جس کے شعری اظہار کی جڑیں اس کی اپنی زمین میں پیوست ہیں وہ اپنی شاعری کی جڑوں کو ہندوستانی روایات، سنسکرت اور فارسی جیسی کلاسیکی زبانوں نیر اودھی، برج اور بھوجپوری جیسی علاقائی زبانوں کی شاعری میں تلاش کرتا ہے، وہ اپنے دیگر معاصرین کے برعکس درآمد شدہ نظریات وتصورات کو من وعن قبول نہیں کرتا۔ وہ ترجمہ اور تخلیق کے فرق کو

بخوبی سمجھتا ہے اوران کے مابین ایک حدِ فاصل ہمیشہ قائم رکھتا ہے۔

موضوعاتی اعتبار سے وہ اپنی قدیم تہذیب اوراس کے روشن کرداروں سے اپنے شعری پیکر کا خاکہ بناتا ہے پھر مختلف کلاسیکی وعلاقائی زبانوں کے مانوس الفاظ کا جامہ عطا کر کے اُسے سجاتا ہے اورفطری وجدان اور مطالعہ ومشاہدہ کی گہرائیوں میں جذب کر کے اُسے تخلیق کے روپ میں پیش کرتا ہے۔مجموعۂ کلام ''دوب'' کے نام کا انتخاب ہی شاعر کے اسی ذہنی رویّہ کی عکاسی کرتا ہے۔اردو شعرو ادب کے منظر نامے میں بظاہر ''دوب'' کی کوئی ادبی حیثیت نہیں۔پھر کیا وجہ ہے کہ عہدِ جدید کا یہ باشعور فنکار اپنے اولین مجموعہ کا نام ''دوب'' منتخب کرتا ہے۔اس کے لاشعور میں یہ بے حقیقت کمزور پودا کیسے رچ بس گیا کہ وہ اُس کی تخلیق کی شناخت بن گیا۔اس کی وجہ تسمیہ شاعر یوں بیان کرتا ہے:

''زندہ رہنے کا سلیقہ تو دوب ہی کو آتا ہے کہ ہر جگہ، ہر حال اور ہر موسم میں وہ ایک شانِ بے نیازی سے سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔''

(دیباچہ ''دوب'' ص ۷)

''آج کی دنیا میں جہاں مادّی ترقی کے برعکس انسانی قدروں کو بتدریج زوال پذیر ہوتے ہوئے پایا ہے ،وہیں انسانیت کو دوب اور اپنی مادری زبان اردو کی طرح ہی سخت جان پایا ہے۔'' (دیباچہ ''دوب'' ص ۱۳)

اسی ضمن میں مجموعہ کے یہ تعارفی اشعار بھی ملاحظہ فرمالیں:

دیو قامت پیڑ آندھی میں زمیں پر گر پڑے
دوب کے بازو ہر ایک جھونکے سے ٹکراتے رہے

رات عنبر کہکشاں سے دوب یہ کہنے لگی
چھاؤں میں میری ہزاروں چاند ہی سوئے ہوئے

مذکورہ نثری اقتباسات کا موضوعاتی وفکری پس منظر کس خوبصورت علامتی انداز میں اِن اشعار کے قالب میں ڈھل کر سامنے آ گیا ہے۔

یہ اشعار ایک ایسا آئینہ ہیں جس میں شاعر کا فکری وشعوری فلسفہ پوری آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہے۔شاعر جب اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے اوراس کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہے تو اُسے مشکل سے مشکل حالات ہراساں نہیں کرتے ،اُن میں بھی وہ جینے کا ہنر ڈھونڈ نکالتا ہے۔اُسے نہ کوئی عظیم وطاقت ور شخصیت مرعوب کرتی ہے اور نہ فطرت کی کوئی کمزور سے کمزور شئے بے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔یہ رجائی انداز اِس شاعر کا طرۂ امتیاز ہے۔امید کے چراغوں کی اسی روشنی سے اُنکا شعری سرمایہ جگمگا رہا ہے۔اِسی روشنی میں زندگی کی تلخ حقیقتیں بھی سامنے آتی ہیں اور انفرادی و اجتماعی ناہمواریاں ،جبر واستحصال اور معاشرتی انحطاط کے مکروہ چہرے بھی نظر آتے ہیں ،اس کے باوجود وہ امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔انکے یہاں ابتدائی ضعیف کوشش بھی احساس نامرادی واحساس کمتری کی علامت نہیں بلکہ قوت کا سرچشمہ ہے۔ان کا فنکارانہ شعور عظیم قوموں کے تاریخی پس منظر اور مختلف تحریکات اوران کے نتائج کا مشاہدہ کرنے کے بعد اِس دبی راکھ میں نہ صرف چنگاریاں محسوس کرتا ہے بلکہ ان چنگاریوں کو شعلۂ جوالہ میں تبدیل کرنے کی آرزو رکھتا ہے مگر مروّجہ ترقی پسندی اورنعرہ بازی کی روایت سے ہٹ کر، اِس لحاظ سے وہ ترقی پسند ہو کر بھی ترقی پسند نہیں۔ان کا شعری لہجہ دوسرے ترقی پسند شاعروں کے برعکس تیز وتند، پُرجلالی اور آگ لگانے والا نہیں بلکہ اس میں ایک آہستہ خرامی ،دھیما پن، شدید داخلیت اوراحساس جمال کی تازہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔''دوب'' مجموعہ کی غزلوں کے یہ اشعار مذکورہ خصوصیات کی ترجمانی کرتے ہیں:۔

اُسکے ہاتھ میں تمغے ہیں،کل جو میداں میں
ہماری چھاؤں میں اپنا بچاؤ کرتا تھا

یہ سچ ہے رنگ بدلتا گیا وہ ہر لمحہ
مگر وہی تو بہت کامیاب چہرہ تھا

کسی حادثے کی علامت نہ ہوں
افق پر پرندے ہیں پھیلے ہوئے

نکل کر گھر سے وہ سہما ہوا تھا
اجالوں سے تعارف ہو گیا تھا

فقط اِس بات سے دنیا خفا تھی
وہ اپنے پاؤں سے چلنے لگا تھا

روٹی بن کر آ جاتا ہے چاند مرے چھپّر کے اوپر
لال پری مرے بچوں کو عنبر تھپکی دے جاتی ہے

مجھے اندھے کنویں میں پھینک میرے سگے بھائی
پلٹ کر پھر نہیں آئے ، یہی میری کمائی تھی

نہ جانے کون سی بے چینیاں بسنے نہیں دیتیں
کہ ہم گھر بار بھی رکھتے ہوئے بے گھر ابھی تک ہیں

زمیں کے زخم تو اس کی نظر سے دور ہیں لیکن
خلا کے سرد سناٹوں میں سیارے اُڑاتا ہے

ان کا یہ شعری لہجہ اُن کی دلکش و متوازن شخصیت کے طفیل وجود میں آیا ہے، وہ دیگر جدید فنکاروں کی طرح مذہب بیزار، روایت شکن اور تشکیک میں ڈوبے انسان نہیں اور نہ ہی اپنی شاعری میں کسی مخصوص نظریہ کی بالواسطہ یا بلاواسطہ وکالت کرتے نظر آتے ہیں ان کے شعری افکار میں ایسی دانشوری کا فقدان ہے جس کی حدیں مذہب بیزاری، قدیم اعلیٰ قدروں سے علاحدگی اور روایت سے انحراف پر ختم ہوتی ہوں ۔عنبر کے نظریۂ شاعری کی وضاحت میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ترقی پسندی و جدیدیت کے بارے میں یہ تجزیہ نہ صرف بدلتے ہوئے معیارِ نقد کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ اپنے تنقیدی و شعوری تناظر میں خود فنکار بھی اِس سے اتفاق کرتا نظر آتا ہے:

''اب اِس حقیقت سے قطعاً انکار ممکن نہیں کہ خطابت کے ہاتھوں تباہ ترقی پسندی نے روحانیت کو ظلمت پسندی قرار دیکر اپنی کلہاڑی سے خود اپنے اوپر وار کیا تھا اور جدیدیت کو شکستِ ذات نے تباہ کیا، کیونکہ ذات کے غار کی عمیق گہرائی میں اُترنے کے بعد روحانی ورثہ سے محرومی ہاتھ آئی۔''
(ماخذ ''راشٹریہ سہارا''، لکھنؤ، رپورٹ ۲۳؍فروری ۲۰۰۱ء)

یہ روحانی ورثہ عنبر کا قیمتی سرمایہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیں یہ اشعار جن میں وہ اپنے مالکِ

''اب اِس حقیقت سے قطعاً انکار ممکن نہیں کہ خطابت کے ہاتھوں تباہ ترقی پسندی نے روحانیت کو ظلمت پسندی قرار دیکر اپنی کلہاڑی سے خود اپنے اوپر وار کیا تھا اور جدیدیت کو شکستِ ذات نے تباہ کیا، کیونکہ ذات کے غار کی عمیق گہرائی میں اُترنے کے بعد روحانی ورثہ سے محرومی ہاتھ آئی۔''
(ماخذ ''راشٹریہ سہارا''، لکھنؤ، رپورٹ ۲۳؍فروری ۲۰۰۱ء)

حقیقی سے اس طرح ہم کلام ہیں:

اے خدا! جذبِ دروں ٹوٹے ہوؤں کو بخشدے
میرے حصے کا تبسم غم زدوں کو بخش دے

ہم نے تو صدیاں گزاریں دھول کی برسات میں
اب تو فصلِ گل ہمارے آنگنوں کو بخش دے

شعری مجموعہ ''دوب'' کے بعد وہ ''خالی سیپوں کا اضطراب'' لے کر ایوانِ غزل میں داخل ہوئے۔ ''دوب'' کی غزلوں سے ''خالی سیپوں کا اضطراب'' کی غزلوں تک عنبر نے جو تخلیقی سفر طے کیا ہے، اس کے واضح نقوش اس میں ظاہر ہوئے ہیں ۔فکر وخیال کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے اعتبار سے شاعر نے اس میں تخلیقی سطح پر تجربات کی مختلف قندیلیں روشن کی ہیں ۔ یہ مجموعۂ غزل دیگر مجموعہائے کلام سے اِس اعتبار سے بھی مختلف ہے کہ اس میں کوئی تقریظ، تعارفی مضمون، دیباچہ یا شاعر کے فکر وفن پر ادباء و ناقدین کی آراء کو شاملِ اشاعت نہیں کیا گیا ہے ۔ یہ نقطۂ نظر خود نمائی سے گریز کا حوالہ بھی ہوسکتا ہے اور ایک طرح کا معاصر تنقید پر احتجاج اور تخلیق کی برتری کا اصرار بھی۔

مجموعہ میں شامل غزلوں کے مطالعہ سے فکر واحساس ، زبان و بیان اور لہجہ وانداز کی سطح پر ایک عجیب طرح کی شادابی اور نیاپن کا احساس ہوتا ہے ۔ اِس میں دھرتی کی مہک ، موسم کی خوشبو اور لسانی تہذیب کی روشنی نظر آتی ہے ۔عنبر کی اِس دور میں غزلیں محدود نزاکت سے لامحدود حقیقت تک کا سفر طے کرتے ہوئے سامنے آتی ہیں ۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں نرم و نازک جذبات واحساسات کو ہندوستانی کلچر سے جڑے علاقائی بولیوں کے سُبک ،نرم وشیریں الفاظ سے اسطرح سجایا اور سنوارا ہے جو قاری کو بقول ''علی احمد فاطمی'' ایک نیا منظر نامہ دیتے ہیں ،ایک ایسا منظر نامہ جہاں آج کی شاعری جاتے ہوئے بلاوجہ اپنا دامن بچاتی ہے اور ایک بڑے سرمائے سے محروم رہتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں اس پس منظر میں یہ اشعار:

جنھیں میں راج محلوں کی چھتوں کا قرب دیتا ہوں
وہی فانوس اکثر میرے سر پر ٹوٹ جاتے ہیں

لدی ہوئی بیری پر ڈھیلے پھینک رہی ہے روپ کنور
اُسے خبر کیا اُس پر بھی کل پتھر کی بارش آئے گی

ہرے بھرے جنگل کٹ کر اب شہر ہوئے
بنجارے کی آنکھوں میں سناٹے ہیں

دودھ کی دھار بھی عقل والی ہوئی
دستِ شفقت میں چالاکیاں بھر گئیں

خودسری چھا گئی ہے نئی عمر پر
چاند نکلا مگر منھ چڑھاتا ہوا

کیا خوب طبیعت ہے میرے شیام سلونے
دہلیز پہ اربابِ سیاست کی پڑے ہو

شادابی کے جانے کتنے روپ دکھے
اُن گالوں پر اوس کے قطرے ٹھہرے تھے

ڈھک لیا چاند کے چہرے کو سیہ بادل نے
چاندنی تھی مرے آنگن میں اُترنے والی

منفرد اسلوب اور لہجہ کی تازگی کے ساتھ ساتھ اس دور کی غزلوں میں فکر وتخیل کی لالہ کاری وپُرکاری کا فنکارانہ اظہار ملتا ہے ان غزلوں میں تخلیقیت اور تجربہ متوازن صورت میں نظر آتا ہے ۔ ان میں شاعر کا تخلیقی رویہ ایسے ابہام اور پیچیدہ علامتوں سے دور رہتا ہے جو اُسے اپنے قارئین سے ذہنی طور پر منقطع کردے عنبرؔ کی غزلوں میں معنوی ترسیل کا المیہ کہیں نظر نہیں آتا۔فکری سطح پر وہ ایسی غزلیہ شاعری سے اجتناب کرتے ہیں جو پرستارانِ غزل کو نہ ہنساتی ہے نہ رُلاتی ہے ، نہ سوچنے سمجھنے کی ترغیب دیتی ہے اور نہ کسی عمل کی محرک ہوتی ہے ۔مجموعی طور پر عنبرؔ بہرائچی اپنی غزلوں میں زندگی کے مختلف مسائل وحقائق کی عکاسی خوبصورت تخلیقی زبان میں کرتے نظر آتے ہیں اِس سلسلے میں صاحبِ طرز ادیب و ناقد پروفیسر آل احمد سرورؔ کے تاثرات جو عنبرؔ کی شخصیت وشاعری اوران کی قدر ومنزلت کے سلسلے میں ایک مضمون سے ماخوذ ہیں ، پیش کرتا ہوں جو بے حد اہمیت کے حامل ہیں:

''ان کی شاعری میں فطرت کا حسن ہے ،مشرقی یوپی کی بوباس ہے ، پیڑوں ،پودوں ،دریاؤں ،جنگلوں ، کچے مکانوں ،تالابوں ،معصوم شریر امنگوں اورتلخ حقائق کی دھوپ چھاؤں ہے ، ترقی کے جنون میں فطرت کی پامالی کی دلدوز داستان ہے ،کبھی آدمی کے جانور بن جانے اور کبھی اُس کے فرشتہ نظر آنے کے مناظر بھی ہیں ۔اُن کی زبان میں ایک نیا ذائقہ ہے ، یہاں نعرہ بازی نہیں ، صرف تصویریں ہیں جو اپنی بات اشاروں میں کہہ دیتی ہیں ۔''

یہ اشعار سرورؔ صاحب کی تنقیدی بصیرت کو ہدیۂ سلام پیش کرتے ہیں۔آپ بھی اِن سے لطف اندوز ہوں:

مجھ کو شبوں سے برسرِ پیکار دیکھ کر
سورج مرے قریب کے گھر میں اُتر گیا

نہ جانے کیسی آہٹ تھی فضا میں
وہ دن ڈھلتے ہی اپنے گھر گیا تھا

ریگزاروں کو بہت خواب ستاتے ہیں مگر
سارے دریا چلے جاتے ہیں سمندر کی طرف

خطیبوں نے یہاں کل صدف گل افشانیاں کی تھیں
گلی کے موڑ پر خونریز سناٹا بچھا کیوں ہے

پھر گنہ کے بوجھ سے سہمی ہوئی ہے یہ زمیں
یاد قصے نوحؑ کے ہیں؟ اے سمندر کی ہوا

عجیب لوگ ہیں،سجدے میں روز جاتے ہیں
جہاں پناہ ، نگاہیں کہاں اُٹھاتا ہے

ہر سمت پڑے ہیں کئی خوش رنگ کھلونے
بچہ کسی دامن کی ہوا ڈھونڈ رہا ہے

فقط اس بات سے ظلِ الٰہی آج نالاں ہیں
کہ اُنکے در کا اک ادنیٰ سپاہی خوش قبا کیوں ہے

آندھی نے صرف مجھ کو مسخر نہیں کیا
اک دشتِ بے دلی بھی مرے نام کر گئی

آخر مٹی نے ان کو بھی ڈھانپ لیا
ہاتھوں پر آکاش لئے جو پھرتے تھے

سبز پریوں کی کہانی کیوں سناتے ہو انھیں
یہ تو ہیں مزدور بچے، عادتاً سو جائیں گے

☆☆☆☆

رضوان فاروقی
ایچ این ۱۱۰/۲۶۴ اے بلوچپورہ لکھنؤ
موبائل 8948594072

اپنے حصے کا کام کر گئے عنبرؔ بہرائچی

ہمارے دور کا المیہ یہ ہے کہ ہم نے خود کو مختلف چھوٹے بڑے دائروں میں مقید کر رکھا ہے۔ ہم فکر و نظر کی وسعت کی بات تو کرتے ہیں مگر مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ نشستوں کے شاعر مشاعروں کے شاعروں کے فنی عیوب گنا کر خوش ہو لیتے ہیں۔ مشاعروں کے شاعر نشستوں کے شعراء کو حقیر و کمتر تصور کرتے ہیں۔ ناقدین ادب عموماً تعلق اور قرب کی بنیاد پر قلم کو جنبش دیتے ہیں۔ بصورت دیگر پیمانہ لفافہ ہے۔ ایسے میں عموماً ایماندارانہ گفتگو نہیں ہوتی اور فنکار کے فن پر پڑی گرد نہیں ہٹ پاتی۔ محمد ادریس عنبرؔ بہرائچی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ انھوں نے ترنم کی نعمت کو کافی سمجھا نہ ہی عوامی مشاعروں کے اسٹیج سے ملنے والی واہ واہ اور شہرت کو۔ وہ پیہم سفر سے جو تجربات ہاتھ لگے انھیں سپرد قلم و کے لئے چھوٹے دائروں کو مٹاتے بنیاد سے دور کر دیا اور تمام تر کاوشوں و مقبولیت یا ہر دلعزیزی نہ حاصل کر سکے حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

> عنبرؔ صاحب نے غزل کی زلفوں میں الجھ کر عمر تمام کرنے کے بجائے سنسکرت شعریات کا مطالعہ کیا، تراجم کئے، زبانوں اور تہذیبوں کے فرق کو سمجھ کر سوچ سمجھ کر قلم چلایا۔ ہر موضوع پر لکھنا اور لکھتے رہنا اُن کا مشن نہ تھا۔ راہ بنانے اور علمی حلقے کو متاثر کرنے میں وہ کامیاب رہے۔ ''سوکھی ٹہنی پر ہریل'' نامی کتاب پر ۲۰۰۰ء میں انھیں ساہتیہ اکادمی نے اپنے گرانقدر ایوارڈ سے نوازا۔ سنسکرت شعریات پر ایک نہیں متعدد کتب ہیں۔ اردو کے ساتھ اودھی اور ہندی میں اُن کا کا قابل قدر اور لائق ذکر ۔

۲۰۱۲ء میں ''لکھنؤ کچھ ماضی کچھ ذکر ان الفاظ میں ہے۔ ''عنبر بہرائچی اچھے شاعر اور اچھے انسان ہیں۔ منصبی ملنے نہ دیا۔ مخصوصین کے محدود دائرے سنجیدگی سے علمی میدان سر کرتے ہوتا گیا..... مقام ذکر ہے کہ عنبرؔ نے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ دوسری کرتے رہے۔ مطالعے اور مشاہدے قرطاس کر دیا۔ بڑے دائرے بنانے گئے۔ شاید ان کی اسی روش نے انھیں کوششوں کے باوجود ویسی شہرت و جیسی کہ اُن سے کم اہلیت رکھنے والے

حال'' نامی کتاب کے صفحہ ۸۵/ پر اُن کا لکھنؤ میں طویل عرصہ سے مقیم ہیں۔ کرّ و فر نے انھیں عام لوگوں میں گھلنے سے وہ کبھی باہر ہی نہ نکل سکے، مگر رہے۔ قلم کی رفتار میں بتدریج اضافہ عام روش سے الگ ہٹ کر اچھوتے زبانوں میں دلچسپی لی، انھیں جانا، سمجھا اور اُن کے ادب پر سنجیدگی و انہماک سے تحقیقی کام کیا۔ نیز ان کی شاعری بھی مختلف ہے۔ نت نئے موضوعات اور ایجادات نے اُن کی شاعری کے کینوس کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ نمونتاً ایک شعر حاضر ہے:

کانچ کی چھت پر دہکتی دھوپ تھی بکھری ہوئی
تھی بہت فرصت مگر ہم چین سے سوئے کہاں

عنبرؔ صاحب نے غزل کی زلفوں میں الجھ کر عمر تمام کرنے کے بجائے سنسکرت شعریات کا مطالعہ کیا، تراجم کئے، زبانوں اور تہذیبوں کے

فرق کو سمجھ کر سوچ سمجھ کر قلم چلایا۔ ہر موضوع پر لکھنا اور لکھتے رہنا اُن کا مشن نہ تھا۔ راہ بنانے اور علمی حلقے کو متاثر کرنے میں وہ کامیاب رہے۔ ''سوکھی ٹہنی پر ہریل'' نامی کتاب پر ۲۰۰۰ء میں انھیں ساہتیہ اکادمی نے اپنے گرانقدر ایوارڈ سے نوازہ۔ سنسکرت شعر یات پر ایک نہیں متعدد کتب ہیں۔ اردو کے ساتھ اودھی اور ہندی میں اُن کا کام قابل قدر اور لائق ذکر ہے۔

''مہا بھنشکر من۔ سنسکرت بوطیقا۔ سنسکرت شعریات۔ آنند وردھن اور اُن کی شخصیت۔ روپ انوپ ۔ خالی سیپیوں کا اضطراب۔ دوب۔ گمنام جزیروں کی تمکنت۔ اقبال ایک ادھین۔'' جیسی کتب لکھ کر عنبر بہرائچی نے اردو والوں کو روایتی دائروں سے نکل کر دوسری زبانوں اور سمتوں میں کام کی ترغیب دی۔ عنبر چاہتے تو اپنے نعتیہ گیتوں، نظموں اور غزلوں کو مخصوص ترنم سے اسٹیج پر پیش کر کے عوامی شہرت بھی بٹور لیتے مگر اسٹیج کی چکا چوند انھیں ٹھوس علمی کام ہرگز نہ کرنے دیتی۔ اس لئے کمرے میں بیٹھ کر سنجیدگی اور یکسوئی سے ادب تخلیق کرنے کے عمل کو پوری طرح غلط نہیں کہا جا سکتا۔

حقیقت تو یہی ہے کہ عنبر بہرائچی کے کام پر کام کی ضرورت ہے، جس کا آغاز جتنی جلد ہو جائے بہتر ہے۔ کنول فام، گل اندام، لب بام، سبک گام، عبث رام، تہہ دام'' جیسے قوافی میں شاعر نے خوب خوب اشعار کہے ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

آج پھر دھوپ کی شدت نے بڑا کام کیا
ہم نے اس دشت کو لمحوں میں کنول فام کیا

میرے حجرے کو بھی تشہیر ملی اُس کے سبب
اور آندھی نے بھی اس بار بہت نام کیا

روز ہم جلتی ہوئی ریت پہ چلتے ہی نہ تھے
ہم نے سائے میں کھجوروں کے بھی آرام کیا

دل کی بانہوں میں سجاتے رہے آہوں کے دھنک
ذہن کو ہم نے رہ عشق میں گم نام کیا

شہر میں رہ کے بھی جنگل کی ادا بھول گئے
ہم نے ان شوخ غزالوں کو عبث رام کیا

اپنے پیروں میں بھی بجلی کی ادائیں تھیں مگر
دیکھ کر طور جہاں خود کو سبک گام کیا

شاہ راہوں پہ ہمیں تو نہیں مصلوب ہوئے
قتل مہتاب نے خود کو بھی لب بام کیا

جانے کیا سوچ کے پھر اُن کو رہائی دیدی
ہم نے اب کے بھی پرندوں کو تہہ دام کیا

ختم ہوگی یہ کڑی دھوپ بھی عنبر دیکھو
ایک کہسار کو موسم نے گل اندام کیا

مذکورہ غزل میں شاعر کی زندگی، اُس کا طور طریق، جدید راہوں کی تلاش میں اس کا ہمہ وقت سرگرداں رہنا، جلال و جمال، حالات کا تجزیہ، وقت کا المیہ، منظر و پس منظر سبھی کچھ تو ہے۔

عموماً ایک غزل میں ایک ہی دو شعر کام کے ہوتے ہیں جن پر ہر کوئی سر دھنتا ہے یا گفتگو کرتا ہے مگر غزل کا ہر شعر ایک دوسرے سے وابستہ ہو، کڑی سے کڑی جڑی ہو، ایسا نظم ہی میں ہوتا ہے مگر عنبر کی مذکورہ بالا غزل کا ہر شعر مربوط ہے اس لئے نہ چاہ کر بھی پوری غزل لکھنی پڑی۔ عنبر نے جس سنجیدگی، متانت اور وقار سے ادبی کام کئے اُسی سنجیدگی، متانت اور وقار سے اب اُن پر ادبی و تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔

علماء صلحا اور صوفیائے کرام کے مولد و مسکن بہرائچ سے نہ صرف اُن کے آباء کا تعلق تھا بلکہ اسی بہرائچ کے مشہور نعت گو جمیل احمد جمیل کے یہاں ۱۹۴۹ء کو محمد ادریس خاں نے روشنی کی پہلی کرن دیکھی اور ۷ رمئی ۲۰۲۱ء کو بڑی خاموشی سے فانی دنیا سے سارے رشتے ہمیشہ کے لئے ختم کر لئے۔ ادھر چند برسوں سے وہ مختلف امراض میں مبتلا تھے اور خود کو سمیٹ لیا تھا مگر حقیقت تو یہی ہے کہ انھوں نے اپنے حصہ کا کام مکمل کر لیا تھا۔ اہل علم اُن کی قدر کرتے تھے۔ ایک کامیاب انسان کو زندگی میں اور چاہئے بھی کیا۔

☆☆

رفعت عزمی
بی ۳۱۴، سول لائنس
جے۔این۔ایم۔پی۔جی۔کالج روڈ
بارہ بنکی

آہ: مولانا رئیس الشاکری

مولانا رئیس الشاکری (۱۹۴۳ء۔۲۰۲۱ء) ردولی میں کب وارد ہوئے مجھے معلوم نہیں، لیکن اتنا ضرور پتہ ہے کہ ابتداً وہ محلّہ خواجہ حال کے گھر میں مقیم ہوئے۔اس کی ایک تاریخی اہمیت تھی۔تاریخی اس اعتبار سے کہ وہ مشہور ادیب محمد عتیق صدیقی (مصنف: گلکرسٹ اور اس کا عہد) اور ان کے چھوٹے بھائی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے ترانے ''دیارِ شوق مرا، شہرِ آرزو میرا'' کے خالق، محمد خلیق صدیقی کا آبائی مکان تھا۔فی الوقت اس عمارت میں اسلامیہ انٹر کالج قائم ہے۔

جب میں کان پور سے گریجویشن کا امتحان (۱۹۷۰ء) دے کے وطن واپس ہوا تو اس دوران قصبے میں مولانا رئیس الشاکری کی شاعری کا خاصا چرچا تھا، میں نے تب تک باقاعدہ شاعری کا آغاز نہیں کیا تھا۔البتہ میرے بڑے بھائی نجمی ردولوی مقامی شعری نشستوں میں برابر شریک ہوتے رہتے تھے۔خیال ہوا کہ ان کے ساتھ کسی نشست میں شرکت کی جائے تو مولانا رئیس الشاکری سے تعارف ہونے کے علاوہ ان کی شاعری بھی سننے کو مل جائے گی، چنانچہ ایسا ہی کیا۔

پھر ایک شب شاہ مبین احمد منظر ردولوی کے گھر پر منعقد شعری نشست میں رئیس الشاکری سے ملاقات ہوئی، رفتہ رفتہ کاشانۂ رزم اور وسیم انصاری نیز چودھری محمود سہیل وغیرہ کے دولت کدوں پر شاعری کے حوالے سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ندوۃ العلماء لکھنؤ سے عالم کی سند یافتہ شاعر مولانا رئیس الشاکری کے پاس حمد، نعت اور منقبت یعنی مذہبی اثرات سے مملو شاعری کا جواز اور خزانہ موجود تھا۔اس وقت قصبہ ردولی استاد شاعروں اور عمدہ سامعین کے لحاظ سے قابلِ قدر سمجھا جاتا تھا۔۔۔مقامی طور پر جعفر مہدی، رزم ردولوی، حکیم محمد واصف ردولوی، محمد عمر اختر، وسیم انصاری ماتروت مشرکیف، واصفی ردولوی، شاہ مبین احمد منظر، اقبال ردولوی، تقی شبر نمار دولوی، (اس وقت تقی شبر ردولوی) اور خان عزمی ردولوی اور محمد اعظم کے ساتھ ساتھ ماہر عروض شمیم حیدر ردولوی کی موجودگی سے مولانا رئیس الشاکری نے بھرپور استفادہ کیا۔

یونانی دواؤں کے میڈیکل اسٹور سے معقول آمدنی نہ ہونے کے سبب مولانا رئیس الشاکری نے شاید کچھ عرصے تک درس وتدریس کی ذمہ داری بھی انجام دی، قصبے میں معاشی ذرائع کی کمی ہونے کی وجہ سے انہوں نے لکھنؤ کے مشہور کاتب الیاس کی سرپرستی میں کتابت کے میدان کا رخ کیا۔چودھری علی محمد زیدی کی تصانیف ''میری یادیں، ردولی کی باتیں اور بارہ بنکی کی کتابت'' سے اپنے سفر کو شروع کیا۔اس کے بعد عظیم مکے باز 'محمد علی' پر سعید مصطفیٰ علی کی تحریر کردہ سوانح عمری کی کتابت مکمل کی مگر اس کی اشاعت ممکن نہ ہوسکی، پھر تلاش معاش کے لئے مولانا کو لکھنؤ کا رخ اختیار کرنا پڑا، نسیم بک ڈپو سے اُن کی وابستگی بارآور ثابت ہوئی، نسیم انہونوی اردو کے ایک اہم پبلشر جو ماہنامہ 'حریم' کے مدیر بھی تھے، اس طرح رئیس الشاکری باضابطہ اس کے کاتب ہوگئے اور اس کے لئے انہوں نے 'ابوالفضل' کے قلمی نام کا انتخاب کیا، نسیم بکڈپو میں آتش زدگی سے ان کی زندگی پھر بحران کا شکار ہوگئی، لیکن وہ

ہمت نہیں ہارے ۔ بعد میں ان کا بیٹا سعودی عرب چلا گیا۔ مولانا رئیس الشاکری نے بعد میں اپنی مادرِ علمی 'ندوۃ العلماء' کو خدمات فراہم کرائیں اور اس طرح علمی تشنگی دور کرنے کا انہیں ایک اور موقع حاصل ہو گیا۔

مولانا رئیس الشاکری کا خمیر مذہبی عناصر سے اُٹھا تھا، اسلئے اُن کے ہاں اس کے اثرات واضح طور پر محسوس کئے جاسکتے ہیں یہ رباعی دیکھیں، جس میں وحدانیت اور رسالت کے عقیدہ کو کس خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے:

منزل کے اشاروں پہ نظر ہے کہ نہیں
دل بھی ترا مصروفِ سفر ہے کہ نہیں
ملنا ہے خدا سے تو مدینے جانا
کعبے کے مسافر یہ خبر ہے کہ نہیں

ایک رباعی قدرے مختلف رنگ کی حاضر ہے:

گھر بیٹھے کے منزل کی سعادت مل جائے
گھٹنوں بھی نہ چل پائیں قیادت مل جائے
میں شہر کے جاں بازوں سے واقف ہوں رئیسؔ
انگلی نہ کٹے اور شہادت مل جائے

ان کی ایک غزل کے دو شعر یوں ہیں:

سوکھے ہونٹوں کا تماشا کیوں ہوا
میں سمندر تھا تو پیاسا کیوں ہوا
میرے گھرنے مجھ کو پہچانا نہیں
سوچتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا ؟

مولانا رئیس الشاکری سے فون پر گفتگو ہوا کرتی تھی ، اکثر و بیشتر زبان و بیان اور شاعری ہی موضوع رہا کرتا تھا، کبھی کبھار روایتی امور پر بھی تبادلۂ خیالات کی نوبت آجاتی اور معاملہ پیچیدہ ہوتا تو وہ کہتے کہ آپ کے سوال کا میرے پاس کوئی معقول جواب اس وقت موجود نہیں ہے، معاف فرمائیے گا۔ دو تین سال سے تقریباً یہ معمول جاری تھا، کسی روز اگر رابطہ قائم نہ ہوتا تو شام کو ان کا فون آجاتا کہ بھئی کیا ناراضگی ہے؟ ان کی زندگی مجھ جیسے کم علم کیلئے اطمینان بخش تھی۔ زبان و بیان کی بات ہو یا عروضی مسئلہ بے فکری رہتی تھی۔

ایک بار میں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی معروف زمین میں غزل کہی اور مولانا صاحب کو بتایا، چونکتے ہوئے انھوں نے حیرت کا اظہار کیا، پھر میں نے انہیں پوری غزل سنائی ، تھوڑی دیر کے بعد انکا فون آیا کہ عزیؔمی کاش یہ غزل میں نے کہی ہوتی اور ساتھ ہی ڈھیر ساری دعائیں بھی دیں۔ اس غزل کا مطلع پیش کر رہا ہوں:

گھر سے نکلے تھے کہ گھر یاد آیا
ہم کو اک اور سفر یاد آیا

داغؔ دہلوی کے مشہور شعر کے اصل متن کا معاملہ ہو یا ناسخ کے شعر کی بات ، ندوۃ العلماء کے کتب خانے سے وہ قدیم ترین نسخہ تلاش کرا کے اس کی تصویر واٹس اپ پر ارسال کر دیا کرتے تھے۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

یا

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

اپریل ماہ کے آخر میں مولانا رئیس الشاکری کو کھانسی کی شکایت ہوئی ، لیکن گفتگو کا سلسلہ جاری رہا، ۲۹/اپریل کو ان سے بات نہ ہو سکی ، معلوم ہوا طبیعت زیادہ خراب ہے ، سانس لینے میں دقت محسوس کر رہے ہیں ، آکسیجن کے سہارے کام چل رہا ہے، اُسی روز انہوں نے واٹس ایپ پر اپنی ایک غزل مجھے بھیجی ، غالباً یہ ان کے آخری اشعار رہے ہوں گے۔ آپ بھی ملاحظہ کریں:

سیراب سخن ہوتے ہیں یارانِ قلم سے
لفظوں نے بڑے کھیل کئے عشق میں ہم سے
بس کارگہہ ہوش و خرد جھیل رہا ہوں
جی اوب گیا مجلسِ شوریٰ کے بھرم سے
قلعے بھی چلے جاتے ہیں خاشاک کی مانند
وہ آگ اُگلتی ہے زمیں نقشِ قدم سے
وہ روٹھ گئے شامتِ اعمال پہ روؤ
کیا ٹھیک جو آنسو انہیں راضی کریں ہم سے
محروم ہوئے روزوں کی لذت سے بھی ہائے
بے کیف تھے ہم ترکِ تراویح کے غم سے

۵/مئی کو خبر ملی کہ رات مولانا رئیس الشاکری دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ افسوس ہوا، ایک سہارا کم ہو گیا۔ میں اپنی علالت اور کورونا وبا کے خوف سے تدفین میں ردولی نہ جاسکتا، جس کا ہمیشہ ملال رہے گا، اس طرح قصبہ اپنے ایک اور شاعر سے محروم ہو گیا۔

خراجِ عقیدت کے طور پر اتنا ہی لکھنا میرے بس میں تھا، سو رقم کر دیا۔ اللہ تعالی مولانا صاحب کو جوارِ رحمت میں جگہ دے ۔ آمین۔ ویسے ماہِ رمضان میں ان کی رحلت سے رحمت کا ایک واضح اشارہ تو مل ہی جاتا ہے۔

مولانا رئیس الشاکری ایک قادر الکلام اور زود گو شاعر تھے، انہیں مختلف شعری اصنافِ سخن پر طبع آزمائی میں ملکہ حاصل تھا، ان کے شعری مجموعوں میں 'خیر الامم کی بارگاہ'، 'القا'، 'کوثر' اور 'پایاب' کے نام شامل ہیں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر عبدالحئی
شعبہ اردو، سی ایم کالج، دربھنگہ، بہار
Mob: 9899572095

راحت اندوری: ہم قلندر ہیں شہنشاہ لقب کرتے ہیں

گزشتہ ایک سال کے عرصے میں اگر مرنے والوں کا کوئی حساب کتاب ہو یا کوئی ایسا پیمانہ ہو جس سے یہ پتہ لگایا جا سکے کہ مرنے والوں کی وجہ سے ادب وثقافت کی دنیا کا کتنا نقصان ہوا ہے تو نتیجہ شاید یہی آئے گا کہ پچھلے 20، 30 برسوں میں زبان وادب کا اتنا نقصان نہیں ہوا ہے جتنا کورونا نے اس ایک سال میں کر دیا ہے اور ادب، فلم، آرٹ کی دنیا کے کیسے کیسے روشن ستارے غروب ہو گئے۔ یوں تو ہر شعبہ ہائے زندگی کا نقصان ہوا ہے لیکن اردو زبان وادب پر اللہ کا شاید کچھ خاص کرم رہا کہ شاعری ہو تنقید ہو، طنز ومزاح ہو کہ فکشن ہو، چن چن کر لوگوں کو اپنے پاس بلا لیا۔ گلزار دہلوی، مجتبیٰ حسین، شمس الرحمان فاروقی، شمیم حنفی، نصرت ظہیر، راحت اندوری، مناظر عاشق ہرگانوی، مشرف عالم ذوقی، مولا بخش، تبسم فاطمہ، انجم عثمانی، سلطان اختر، شوکت حیات، راحت اندوری اور نہ جانے کتنی ادب نواز شخصیات نے اس فانی دنیا کو الوداع کہہ دیا۔ یہ تو بس وہ نام ہیں جو ابھی میرے ذہن میں آ گئے۔ المختصر یہ کہ کورونا کی وبا نے سب سے زیادہ نقصان اردو شعر وادب کا کیا ہے۔ کچھ دنوں پہلے تک تو یہ عالم تھا کہ ہر دوسرے دن اردو زبان وادب کی خدمت کرنے والی کوئی نہ کوئی شخصیت ہمیں چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوتی جا رہی تھی۔ ان لوگوں کے جانے سے اردو زبان وادب کا پورا حلقہ سوگوار ہے۔ جانے والے تو چلے جاتے ہیں لیکن ان کی یادیں اور ان کی باتیں انھیں ہمیشہ زندہ رکھتی ہیں اور راحت تو ایسے شاعر ہیں جن کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ کسی بھی غیر اردو داں سے آپ اردو کے موجودہ 5 شاعروں کا نام پوچھیں گے تو ان میں ایک نام راحت کا ضرور ہوگا بلکہ یوں کہیں کہ پہلا نام راحت کا ہوگا۔ راحت اندوری جیسے شاعر پر مجھ جیسے طالب علم کے لیے لکھنا یوں بھی مشکل ہے کہ ان کی شاعری کی کئی جہتیں ہیں اور ان کی شاعری کے کس پہلو پر قلم اٹھایا جائے یہ بہت دقت طلب ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ بہت اچھا شاعر بہت زیادہ مقبول بھی ہو۔ راحت ایسے اکیلے شاعر تھے جنھیں نہ صرف غیر معمولی مقبولیت وشہرت نصیب ہوئی بلکہ ان کی شاعری اور ان کی غزلیں بھی بے حد معیاری ہیں۔ ان کی غزلیں آپ پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ ہر غزل پہلے والی غزل سے بہتر ہے اور اگر راحت کے دس بہترین اشعار منتخب کرنے ہوں گے تو اس میں بھی مسئلہ ہے کہ کون سے اشعار کو رکھا جائے اور کسے نہیں کیوں کہ زندگی اور اس کی بے ثباتی کا شاید ہی کوئی پہلو ہوگا جس پر راحت کی نظر نہ گئی ہو اور اسے اپنے منفرد انداز میں نہ باندھا ہو۔ راحت نے اپنی دنیا خود تیار کی ہے، خود ہی کنواں کھودا ہے اور خود ہی پانی نکالا ہے۔ راحت نے کسی ادبی نشست میں جو سب سے پہلی غزل سنائی تھی اس کا مطلع دیکھیں۔

مقابل آئینہ ہے اور تری گل کاریاں جیسے　　سپاہی کر رہا ہو جنگ کی تیاریاں جیسے

بہت گہری سوجھ بوجھ رکھنے والے شاعر تھے۔ انھیں زندگی جینے اور زندگی کو برتنے کا بہت اچھا تجربہ تھا اور ان تجربوں اور اپنے تخیل کو جب وہ باہم ایک کرتے ہیں تو ان کی شاعری ہر انسان کے دل کی آواز بن جاتی ہے۔ راحت اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور انھیں ہندوستانی تاریخ وتمدن، فلسفہ، سماجیات، جغرافیہ، اسلامی تاریخ اور ثقافت کا بھی تھوڑا بہت علم تھا اور سب سے بڑھ کر موجودہ حالات وواقعات پر ان کی گہری نظر رہتی تھی۔ اچھی شاعری وہی کہلاتی ہے جو عام فہم ہو اور سننے یا پڑھنے والے کے دل کی آواز معلوم ہو۔ راحت انسانی عادت اور فطرت کے نباض تھے۔ انھیں یہ بخوبی علم تھا کہ کون سی شاعری ابھی لوگ پسند کریں گے۔ اس بات سے ہم سب واقف ہیں کہ آزادی کی لڑائی میں اردو شاعری نے اہم رول ادا کیا ہے اور اقبال، حسرت، جوش، چکبست، فراق، ظفر علی خاں، مخدوم، تلوک چند محروم، سرور جہاں آبادی، بسمل عظیم آبادی جیسے اردو شاعروں نے ملک کی عوام میں جذبہ حب الوطنی جگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آزادی کے بعد ملک کے حالات بدلے اور ان حالات کی ترجمانی بھی شاعروں نے اپنے اپنے طور پر کی۔ آزادی کے بعد بے روزگاری، غریبی، عورتوں پر مظالم جیسے مسائل کے ساتھ ساتھ فرقہ واریت ایک بڑا اہم موضوع بن کر شاعری اور فکشن میں سامنے آیا اور ابھی بھی یہ موضوع ادب کا حصہ بنا ہوا ہے۔ راحت کی شاعری بھی ایسے ہی دنوں کی ہے جب ملک میں فرقہ وارانہ فسادات عام ہوگئے تھے اور ہر طرف لڑائی جھگڑوں، دنگا فساد کی خبریں گونجتی رہتی تھیں۔ راحت نے اخباری سرخیوں کو اپنے اشعار کا حصہ بنایا اور اپنے منفرد انداز شاعری سے لوگوں کے دلوں پر ایک طویل عرصے تک راج کرتے رہے۔ کچھ اشعار دیکھیں:

جنگل سر پہ رکھ کے سارا دن بھٹکے
رات ہوئی تو راج سنگھاسن یاد آیا

جن حضرات نے مشاعرے کو اپنے عہد کے احساس سے جوڑنے کی بہترین سعی کی ہے اور تفریح وتفنن کے قصد سے پرے ہوکر اپنی گفتار میں کچھ کڑواہٹیں بھی سموئی ہیں ان میں راحت اندوری کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔

بیٹھے ہوئے ہیں قیمتی صوفے پہ بھیڑیے
جنگل کے لوگ شہر میں آباد ہوگئے

ہم نے اپنی کئی صدیاں یہیں دفنائی ہیں
ہم زمینوں کی کھدائی میں دکھائی دیں گے

مجھے خبر ہے کہ میں سلطنت کا مالک ہوں
مگر بدن پہ ہیں کپڑے بھکاریوں والے

ہم پہ حاکم کا کوئی حکم نہیں چلتا ہے
ہم قلندر ہیں شہنشاہ لقب کرتے ہیں

بتوں سے مجھ کو اجازت اگر کبھی مل جائے
تو شہر بھر کے خداؤں کو بے نقاب کروں

راحت کی شاعری اپنے گردوپیش سے مواد لیتی ہے۔ راحت کی شاعری میں موجودہ عہد آپ کو سانسیں لیتا ہوا نظر آئے گا۔ راحت کسی حادثے یا واقعے کو بڑی خوبصورتی اور چابکدستی سے اپنے اشعار کا حصہ بنالیتے ہیں اور یہ شاعرانہ احساس ملک کی دبی کچلی عوام کے دل کی آواز بن جاتا ہے۔ راحت کا یہ احتجاجی انداز ملک کے کروڑوں لوگوں کو بھاجاتا ہے اور سیاست داں وعوام راحت کے اشعار کو اپنی آواز بنا کر پیش کرتے ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ نے راحت کی اسی خوبی کی جانب اشارہ کیا ہے۔

جن حضرات نے مشاعرے کو اپنے عہد کے احساس سے جوڑنے کی بہترین سعی کی ہے اور تفریح وتفنن کے قصد سے پرے ہوکر اپنی گفتار میں کچھ کڑواہٹیں بھی سموئی ہیں ان میں راحت اندوری کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ (بحوالہ مضمون، راحت اندوری کا تخلیقی وجدان، مشمولہ رسالہ لمحے لمحے بدایوں، راحت اندوری شخص اور شاعر، الف پبلی کیشنز، اندور)

زمانے کی کڑواہٹیں، ناانصافیاں، محرومیاں، الزام تراشیاں، حق تلفی اور فرقہ پرستی جیسی عصری صداقتیں جب اشعار کا لبادہ اوڑھتی ہیں تو انھیں راحت اندوری جیسا

شاعر ہی بہتر ڈھنگ سے برت سکتا ہے اور یہی راحت نے کیا ہے۔راحت اردو شاعری کی ایک ایسی آواز بن کر ابھرے جس کا اب تک کوئی ثانی نہیں ہے۔وہ بطور شاعر جس قدر بے باکی سے اپنی رائے دیتے تھے اسی طرح شاعری سے الگ بھی ان کا وہی رویہ تھا۔مجھے ویسے تو ان کے کئی مشاعروں میں جانے کا اتفاق ہوا لیکن دو تین واقعات ایسے ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کولکاتا میں کچھ برسوں قبل ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا تھا جس میں ایک مقبول شاعر کے بہت دیر تک کلام پڑھنے کے بعد راحت اندوری صاحب کو مائیک پر بلایا گیا تو انھوں نے جس انداز اور جس لہجے میں اس شاعر کی خبر لی تھی یہ صرف راحت ہی کر سکتے تھے۔ راحت نے ہزاروں لوگوں کے مجمعے میں کہا کہ شاعری سننی ہے تو مجھ سے سنو۔میرا ایک شعر بھی اگر شعری پیمانے پر کھرا نہیں اترے تو میں شاعری کرنا چھوڑ دوں گا۔اس کے بعد وہ مائیک سے دو تین اشعار پڑھ کر ہٹ گئے کہ مشاعرے کے لیے دیا گیا وقت ختم ہو چکا ہے کیوں کہ مجھ سے پہلے پڑھنے والے شاعر نے ایک گھنٹے تک اشعار سنائے ہیں لیکن منتظمین نے کسی طرح منت سماجت کر کے انھیں دوبارہ مائیک پر آنے کی دعوت دی اور پھر راحت نے اپنے رنگ میں شاعری کی۔اسی طرح بہار کے شہر گیا میں ایک خصوصی شعری نشست میں پروفیسر وسیم بریلوی اور راحت اندوری کو مدعو کیا گیا تھا۔اس نشست میں بھی راحت نے خوب داد وصول کی اور لوگوں نے جب راحت سے دوبارہ مائیک پر آنے کی فرمائش کی تو راحت اندوری نے پہلے وسیم بریلوی صاحب سے اجازت طلب کی اور ان کی اجازت کے بعد ہی مائیک پر آئے۔ مشاعرے کے بعد جب وسیم بریلوی صاحب سے میں گفتگو کرنے لگا اور وسیم صاحب نے میرا ان سے تعارف کرایا کہ یہ قومی اردو کونسل کے رسالوں کی ادارت کرتے ہیں تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو بہت کم عمر کے ہیں،ساتھ ہی انھوں

جب وہ اشعار پڑھتے تھے تو سامعین اور ناظرین جیسے مسحور ہو جاتے تھے۔یہ باتیں زبیر صاحب نے مزاح کے لہجے میں کہی تھیں لیکن حقیقت ہے کہ جب مشاعروں میں کامیابی کی ضمانت پری رو چہروں والی شاعرات بن جائیں ایسے میں راحت اکیلے ہی سب پر بھاری تھے

نے مجھے دعائیں بھی دیں اور کہا کہ خوب ترقی کرو۔ایک اور واقعہ یاد آرہا ہے جب دو برس پہلے دہلی کے ایک مشاعرے میں ایک مشہور شاعر نے سامعین سے کہا کہ آپ میرے اشعار پر تالی بھی بجا سکتے ہیں اور سیٹی بھی۔ راحت صاحب کو یہ بے حد ناگوار گذرا کیوں کہ یہ مشاعروں کی تہذیب کے خلاف ہے۔ جیسے ہی وہ شاعر مائیک سے ہٹے راحت صاحب نے انھیں سمجھایا کہ آپ نے سیٹی اور تالی والی بات کیوں کی۔ یہ سراسر غلط بات ہے۔ مشاعروں میں ان باتوں کی گنجائش نہیں۔داد دینے کا مہذب انداز ہوتا ہے اور مشاعرے اسی تہذیب اور شائستگی کے لیے جانے جاتے ہیں۔یہ باتیں انھوں نے مائیک پر بھی آکر کی تھیں۔ راحت صاحب سے وابستہ یہ باتیں لکھتے ہوئے ان کا چہرہ آنکھوں کے سامنے ہے اور مجھے زبیر رضوی کی کہی ایک بات یاد آرہی ہے کہ پریم چند نے حسن کا معیار بدلنے کی بات کہی تھی اور مجھے یہ بات راحت کو دیکھ کر سمجھ آئی۔راحت کی شاعری ہی ان کا حسن تھی۔ جب وہ اشعار پڑھتے تھے تو سامعین اور ناظرین جیسے مسحور ہو جاتے تھے۔یہ باتیں زبیر صاحب نے مزاح کے لہجے میں کہی تھیں لیکن حقیقت ہے کہ جب مشاعروں میں کامیابی کی ضمانت پری رو چہروں والی شاعرات بن جائیں ایسے میں راحت اکیلے ہی سب پر بھاری تھے اور ان کے شاعرانہ حسن کے آگے سارے رنگ پھیکے پڑ جاتے تھے۔

ان کی شعری خوبیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف شاعر انور جلالپوری نے لکھا تھا۔

''راحت کو یہ معلوم ہے کہ ہجرت کا اصل تصور کیا ہے اور اس کے مفہوم کی روح کیا ہے۔اسے ان لوگوں سے سخت الجھن ہوتی ہے جو فرار کو ہجرت سمجھتے ہیں۔تقسیم ملک کے وقت کے بے معنی و مفہوم ہجرت کے مسائل اس کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انتہائی ناسازگار حالات کے باوجود بھی وہ

دوسری ہجرت کے لیے نہ تو آمادہ ہے نہ کسی کو مشورہ دے رہا ہے۔ وہ موت و حیات کے سارے فیصلوں کے لیے اسی خاک وطن کو میدان عمل بنانا چاہتا ہے۔ اس کے یہاں رزم گاہ کو بزم گاہ بنانے کی پاکیزہ خواہش ہے۔ وہ خاک وطن کی خوشبو کا عاشق ہے۔ یہ مٹی اس کی آنکھوں کا سرمہ اور اس کے ماتھے کا چندن ہے۔ راحت کو اسلاف کی کھوئی ہوئی جاگیروں کے غم کا احساس ہے مگر وہ اس غم کو مستقل بنانا نہیں چاہتا۔ وہ ماضی کو ماضی ہی رہنے دینا چاہتا ہے۔ اس کی پرچھائیوں سے حال کو محفوظ رکھنا اس کی خواہش ہے۔ (مضمون تعارف سے تعلق تک، مشمولہ، لمحے لمحے بدایوں، راحت اندوری شخص اور شاعر، الف پبلی کیشنز، اندور)

انور جلالپوری کی مذکورہ باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ راحت کی شاعری میں ہندوستان سانسیں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ملک سے بے انتہا محبت کرتے ہیں اور یہاں کی زمین اور یہاں کی مٹی سے انھیں والہانہ عشق ہے۔ وہ اسی مٹی میں پیدا ہوئے اور اسی میں دفن ہونا چاہتے ہیں۔ وہ زمین یا ملک کو دھوکا دینے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ ملک انھیں جان سے زیادہ عزیز ہے جس سے دور جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انھیں کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ کیا یہ زمین اور یہ مٹی بھی ہم سے الگ ہوجائے گی اور کیا ہمیں اس بھی بے دخل کردیا جائے گا۔ انھیں اپنے کھوئے ہوئے وقار کا اندازہ ہے اور قوم کے عروج و زوال پر ان کی گہری نگاہ ہے، انھیں اپنے شاندار ماضی کا بہت زیادہ احساس ہے اور یہی احساس ان سے ایسے شہرہ آفاق اشعار کہلواتا ہے۔

یہی پرانے کھنڈر ہیں ہماری تہذیبیں
یہیں پہ بوڑھے کبوتر ہیں اور یہیں شہباز

یہ مٹی مٹیوں سے کچھ الگ ہے
کسی ٹوٹے ہوئے مینار کی ہے

یہ بوڑھی قبریں تمہیں کچھ نہیں بتائیں گی
مجھے تلاش کرو دوستو یہیں ہوں میں

> انور جلالپوری کی مذکورہ باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ راحت کی شاعری میں ہندوستان سانسیں لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ ملک سے بے انتہا محبت کرتے ہیں اور یہاں کی زمین اور یہاں کی مٹی سے انھیں والہانہ عشق ہے۔

ہمارا نام لکھا ہے پرانے قلعوں پر
مگر ہمارا مقدر خراب ہے بیٹا

یہ ضروری تھا کہ ہم دیکھتے قلعوں کا جلال
عمر بھر ہم نے مزاروں کی زیارت کی ہے

بے حسی، مردہ دلی، رقص، شرابیں، نغمے بس
انھیں راہوں سے قوموں پہ زوال آتے ہیں

میری خواہش ہے کہ آنگن میں نہ دیوار اٹھے
میرے بھائی مرے حصے کی زمیں تو رکھ لے

راحت کی شاعری میں حب الوطنی کے عناصر بھی قدم قدم پر بکھرے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں وطن سے محبت، زمین سے الفت اور مٹی سے لگاؤ صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ راحت کی شاعری میں حب الوطنی کی بات ہوگی تو یہ شعر ہی ان کی وطن سے محبت کا گواہ بن جائے گا۔

ہوں لاکھ ظلم مگر بد دعا نہیں دیں گے
زمین ماں ہے زمیں کو دغا نہیں دیں گے

راحت کی شاعری اور راحت کا انداز سخن ہمیشہ یاد رکھا جائے اور راحت ہم سب کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کے کچھ اشعار پڑھیں اور محسوس کریں کہ راحت نے کیسے نایاب خیالات کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔

اب کے بارش میں نہانے کا مزہ آئے گا
بے لباسی کی طرح گھر کی کھلی چھت ہوگی

طاق میں بیٹھا ہوا بوڑھا کبوتر رو دیا
جس میں ڈیرا تھا اسی مسجد میں تالے پڑ گئے

ہم ایسے پھول کہاں روز روز کھلتے ہیں
سیہ گلاب بڑی مشکلوں سے ملتے ہیں

برچھی لے کر چاند نکلنے والا ہے
گھر چلیے اب سورج ڈھلنے والا ہے

میں مرجاؤں تو میری ایک الگ پہچان لکھ دینا
لہو سے میری پیشانی پہ ہندوستان لکھ دینا

☆☆☆

ڈاکٹر نگار عظیم
ایچ۔۳ باٹلا ہاؤس
مرادی روڈ، اوکھلا۔نئی دہلی
Mob: 9968097929

تبسم فاطمہ اور شمشاد جلیل الوداع

کرونا کی دوسری لہر نے ستم ظریفی کی انتہا کو چھوا تو ادبی دنیا کی بھی بیشتر ہستیاں تہ خاک ہوگئیں۔اللہ رب العزت کے حکم کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔موت برحق ہے اور ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔گزرے ادیبوں کی طویل فہرست میں ایک نام معروف فکشن نگار تبسم فاطمہ کا بھی شامل ہے جو اپنے شوہر مشرف عالم ذوقی کے انتقال سے دوسرے روز ہی مالک حقیقی سے جاملیں۔ذوقی کرونا کے شکار ہوئے جبکہ تبسم کئی برس سے لیور کے کینسر میں مبتلا تھیں۔ہر سانس اللہ کے حکم کی تابع ہے اللہ کو یہ منظور نہ تھا کہ تبسم اپنے شوہر کی جدائی کے غم میں گزاریں۔لہذا ۱۹/اپریل کو مشرف عالم ذوقی اور ۲۰/اپریل کو تبسم فاطمہ اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔جبکہ ۱۸اپریل تک وہ واٹس اپ پر میرے رابطے میں رہیں اور آخری خبر انھوں نے ذوقی صاحب کے کرونا نیگیٹو ہونے کی دی تھی اور ان کے لیے دعاؤں کی درخواست کی تھی۔یقین نہیں آتا کہ اگلے دو دن میں یہ سب کیسے ہوگیا۔

تبسم ۱۹۷۲ میں آرہ بہار میں پیدا ہوئی تھیں۔شادی کرکے اپنے شوہر کے ساتھ دہلی میں آباد ہوئیں اور یہیں زندگی کے اتار چڑھاؤ دیکھے۔چونکہ دونوں کے شوق یکساں تھے لہذا جدوجہد کے ساتھ ترقی کی منزلیں بھی ساتھ طے کیں۔تبسم نے افسانہ نگاری بھی کی اور شاعری بھی وہ کالمنسٹ بھی تھیں اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھتی تھیں۔

شوہر کے ساتھ پروڈکشن کا کام بھی سنبھالا اور دونوں نے مل کر کئی سیریل بھی بنائے۔افسانہ نگاری میں ان کا رجحان صاف اور بے باک تھا۔مرد اساس معاشرے میں مرد ذات سے زخمی رہتی عورت تبسم فاطمہ کے افسانوں کا مرکزی کردار ہے۔سماجی سیاسی نااعتدالیاں، رشتوں کا بکھراؤ، عورت کی بے حرمتی، اس کی پہچان، جنسی استیصال ان کے افسانوں میں بغاوت کی آواز بن کر ابھرتی ہے۔وہ عورت کو ہاری ہوئی دیکھنا نہیں چاہتیں۔فسادات اور دوسرے موضوعاف پر بھی انھوں نے افسانے لکھے۔ان کا افسانوی مجموعہ 'لیکن جزیرہ نہیں' اردو میں اور 'جرم اور انیہ کہانیاں' ہندی میں شائع ہو چکی ہیں۔تبسم شاعری بھی کرتی تھیں خاص طور پر وہ نظم کی شاعرہ تھیں، نسائی لہجے کی ایک معتبر آواز بن کر ابھری تھیں۔ان کا شعری مجموعہ 'تمھارے خیال کی آخری دھوپ' مقبول عام ہو چکا ہے۔تبسم صاحبہ کے تنقیدی مضامین بھی بہت بصیرت افروز ہوتے تھے۔بین الاقوامی نسائی ادبی تنظیم 'بنات' کی اہم رکن تھیں۔ابھی وہ اپنے تخلیقی کاموں میں بہت تندہی سے مصروف تھیں کہ صحت نے ساتھ چھوڑ دیا۔ان کا ایک بیٹا ساشا ہے وہ بھی پروڈکشن سے جڑا ہوا ہے۔تبسم بہت ملنسار اور نرم دل خاتون تھیں۔ان کے چلے جانے سے ادب کا بڑا نقصان ہوا ہے۔اپنی تحریروں میں انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔اس مختصر سے مضمون میں سن کے ادب کا جائزہ لینا ممکن نہیں ایک آخری نظم جو انھوں نے ۲۲/مارچ ۲۰۲۱ کو شوہر مشرف عالم کے یوم پیدائش کی خوشی میں فیس بک پر شیئر کی تھی۔کسی کو کیا خود انھیں بھی معلوم نہ تھا کہ ان کی زندگی اتنی مختصر ہے، نظم کچھ اس طرح ہے ''مشرف کی سالگرہ کے موقع پر''

بیتے دن کو پھر سے نکالا
اس میں رکھا روئی کا گالا
شبنم کے قطرے چن چن کر

ایک بنایا نور کا ہالہ
موسم گل سے آنکھ بنائی
دل کی کلی سے ہونٹ تراشے
بادصبا سے خوشبو لے کر
ساون رت کو ناز سے پالا
خواب بدن سے خواہش لے کر
ایک نئے چہرے کو تراشا
عضو کے درپن میں جب دیکھا
تم تھے یارا
شوخ کلی بے پردہ سی تھی
لہروں میں بھی آگ بھری تھی
روشن دان سے دھوپ کا ٹکڑا
تم تھے یارا تم تھے یارا
نور میں جل تھل ایک تم تھے
عشق میں جل تھل اک میں تھی
میری دعا کا چہرہ تم تھے
تیری دعا کی چٹھی میں تھی
وصل کی رت تھی
نور میں ڈھل کر
ایک رب تم تھے
اک شب میں تھی!!

اس ایک شب میں زندگی کی رمق کا پیغام تھا احساس کی شوخ اور روپہلی کرنوں سے عشق کے موسم آباد کئے تھے زندگی کو جیا تھا لیکن اب تار ٹوٹ رہے تھے۔ ریشم کی ڈور پھسل رہی تھی تبسم کا عشق ان کی معراج تھا شاید اللہ نے ان کے دل کا حال جان لیا تھا۔ محبت کی یہ بے مثال جوڑی ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ الوداع تبسم ذوقی الوداع۔

'بنات کی دوسری معروف ادیبہ شاعرہ شمشاد جلیل تاکیدار کا بھی ۹ ا/اپریل کو پونا میں کرونا سے انتقال ہوا۔ ان کا وطن احمد نگر تھا لہٰذا ان کی تدفین احمد نگر میں ہوئی۔ شمشاد جلیل 'اسباق' کی معاون مدیرہ تھیں۔ آپ نے شاعری بھی کی اور افسانے بھی لکھے۔ آپ غزل کی شاعرہ تھیں لیکن نعتیہ کلام اور نظمیں اور ماہیے بھی لکھے۔ بہت خوش مزاج، ملنسار اور محبت والی خاتون تھیں۔ ادب کے تئیں انتہائی سنجیدہ تقریبا 20 برس سے شاعری کر رہی تھیں۔ لیکن نام نمود کی رتی بھر خواہش نہیں کی۔ بنات کیلئے بہت خوبصورت ترانہ شمشاد نے لکھا جو ہمیشہ بنات کے ادبی ذخیرہ میں شامل رہے گا۔ شمشاد بے لوث ادبی اور سماجی خدمات میں پیش پیش رہتی تھیں۔ 2 اپریل کو واٹس اپ پر شمشاد سے بات ہوئی تو انہوں نے بتایا'' آٹھ دن سے وینٹی لیٹر پر ہوں کورونا نے بری طرح جکڑ لیا ہے۔ سانس کھینچنے میں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ تھک جاتی ہوں سانس کھینچنے میں اس خطرناک بیماری سے خدا ہم سب کو بچائے۔ دعا کریں آپا پلیز دعا کریں میرے لئے، زندگی جینے کے لئے تکلیف اٹھا رہی ہوں۔ اللہ حافظ'' ہماری دعائیں اللہ کے حضور بار آور نہیں ہو سکیں ان کے یہ جملے پڑھتے ہوئے میرے دل کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ پسماندگان میں شوہر بیٹا اور بیٹی ہیں شمشاد کی ادبی کائنات میں ان کا شعری مجموعہ 'پہلی دھوپ کا سایہ' افسانوی مجموعہ 'کیسر کی مہک' اور نعتیہ ماہیے، 'شہر سخن کا مسافر نظیر فتح پوری، نظیر فتح پوری رو برو اور امریکہ میں اردو شکاگو کے حوالے سے ان کی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

نسائی لب ولہجہ کی منفرد شاعرہ کی آخری نظم جو انہوں نے نئے سال کی آمد پر بنات فورم پر پیش کی تھیں ملاحظہ فرمائیں۔

''نیا سال 2021''

کھٹی میٹھی یادیں دے کر
بیت گیا پچھلا سال
جیسے بیتا بیت گیا
اس بارے میں اب نہ سوچو
وہ دیکھو!!
سورج کی کرنیں
ساتھ میں اپنے لیکر آئی
نئے سال کی پہلی صبح
آو ہنستے مسکراتے
الفت کے موتی لٹاتے
اس استقبال کرو
کیا کہتا ہے وہ ہم سے
کچھ اس کی سن لو
کچھ اپنی باتیں منوالو
اس سے کہہ دو
اے نئے سال
کام تو میرا اتنا کرنا
نفرت کے سب بیج جلا کر
پیار کے باغوں سے پھولوں کی
بھینی بھینی خوشبو لیکر
دیش کا کونا کونا بھرنا
میں تو یہ بھی چاہوں تجھ سے
میرے گھر میں جیسے ہم سب
روکھی سوکھی روٹی کو بھی بانٹ کے کھاتے ہیں
چین سکوں کی چادر اوڑھے
راتوں میں ہم سو جاتے ہیں
اے نئے سال
بس ایسا ہی چین وسکوں
تو میرے سب دیش میں بھر دے
اور پھر میرے دیش کو بھی
میرے گھر کے جیسا کر دے!!!

اور شمشاد جلیل سب تمناؤں کے ساتھ اپنے پیارے ملک کی مٹی میں دفن ہوگئی۔ بنات کی بہنیں سوگوار ہیں۔ دعائے مغفرت کے ساتھ فاطمہ شمشاد جلیل کے تئیں خراج عقیدت پیش کرتی ہیں۔ ☆☆

ڈاکٹر انوار الحق
صدر، دی ونکس فاونڈیشن، نئی دہلی۔۲۵

’لے سانس بھی آہستہ۔۔۔‘ ایک تجزیہ

کوئی بھی عقلِ سلیم رکھنے والا یہ بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ کہانی کی زبان دلچسپی سے خالی نہیں ہوا کرتی اور کہانی یا ناول کا وجود بغیر کہانی پن کے ممکن نہیں۔ ناول یا کہانی کے جو طے شدہ اجزائے ترکیبی ہیں ان میں کمی کسی کو بھی برداشت نہیں ہوتی نہ فن کار کو نہ ناقد کو اور نہ قاری کو اب اگر کہانی کی زبان کچھ ایسی ہو کہ پڑھنے والے کو یہ سمجھنے میں مشقت کرنی پڑے کہ پتہ نہیں تخلیق کار کہنا کیا چاہتا ہے یا پھر قاری کچھ کا کچھ سمجھ بیٹھے اور پھر ایک ناقد اٹھ کھڑا ہو اور قاری کی انگلی تھام کر یہ کہے کہ دراصل اس طوطا مینا کی کہانی میں جو طوطا ہے وہ طوطا نہیں بلکہ کُتا ہے اور جو مینا ہے وہ مینا نہیں بلکہ کتیا ہے اور ابھی قاری اپنا دماغ لگا کر اس کو سمجھنے کی سعی کرنا ہی چاہتا ہی ہو کہ اچانک دوسرا ناقد کھڑا ہو اور پہلے ناقد کو کم عقل کہہ کر اس کے ہاتھ سے قاری کی انگلی چھڑا دے اور یہ کہے کہ دراصل وہ طوطا جبریلؑ ہیں اور یہ مینا مخلوقاتِ خدا وندی کا استعارہ ہے پہلے والا ناقد دراصل کم عقل تھا اس لیے اس اسلوب میں پوشیدہ حقائق وہ نہیں سمجھ سکا اور بے چارہ قاری۔۔۔

’’کھوپڑی چٹخا دینے والی کہانی‘‘ قاری کو نہیں چاہیے قاری تو بس طوطا مینا کی کہانی پڑھ کر خوش ہونا چاہتا ہے اور ہاں اگر کہانی ایسے موڑ پر ختم ہوئی ہو کہ طوطا کا کیا ہوا یا مینا کا کیا ہوا یہ قاری سوتے وقت سوچنے لگے اور طوطا مینا کی کہانی میں وہ خود کی اور اپنے محبوب کی تصویر دیکھنے لگے اور ساتھ ساتھ دنیا والوں کو کوسنے لگے تو یہ اور بات ہے۔ دراصل فکشن پہلے تو فکشن ہی ہونا چاہیے اور جب ایک ناول نگار یہ کہے کہ ایک طوطا ہے تو پہلے تو وہ ایک طوطا ہونا چاہیے اور جب وہ مینا کہے تو وہ گوشت پوشت کی پیاری سی مینا ہی ہونی چاہیے بعد میں اس کے پیچھے آپ معنی کے قافلے بھلے ہی چھوڑ دیں۔

ناول کی تاریخ پر اگر ہم غور کریں تو یہ باور ہوگا کہ اس صنف کا وجود ہی روایت سے انحراف اور نثر میں کچھ نیا کرنے کی غرض سے ہوا۔ سولہویں صدی سے اب تک ناول میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ناول کی تعریف بحیثیت صنف اولین دور میں جو طے ہوئی وہ آج بھی مسلم رہے، یہ تو ممکن ہے مگر اس کے تقاضے آج بھی وہی رہیں یہ قطعاً ممکن نہیں۔ جوں جوں وقت اور حالات کے مطابق انسان ترقی کی سیڑھیاں چڑھتا گیا اور ہمہ جہت ترقی اس کا مقدر ہوئی تقاضائے فطرتِ انسانی بھی تبدیل ہوئی۔ آج اکیسویں صدی میں جب انسانی زندگی ایک نئی راہ پر گامزن ہے، اور انسان اس دور میں جی رہا ہے جہاں حقیقتیں اخلاقیات کے ستر پردوں کے پیچھے نہیں رکھی جاتیں۔ فطرت کی حقیقتوں سے آنکھیں ملانے کی جرأت رکھنے والی اس نئی نسل کی کہانی سنانے کے لیے وہی فرسودہ اخلاقی ضابطوں کا اگر استعمال کیا جائے تو یہ ادب کے ساتھ انصاف نہیں ہوسکتا۔ ہاں یہ بھی کہاں کی عقل مندی ہوگی کہ ہم اخلاق کے معیار کو ملحوظ نہ رکھیں اور اپنی تہذیب سے رشتہ منقطع کر کہ نام نہاد ترقی یافتہ بن کر اپنی جڑوں سے کٹ جائیں۔ اب سوال یہ ہے کہ آج وہ کون سا ادب لکھا جائے جہاں زندگی کی عریاں حقیقت سے ہم آنکھیں بھی ملا سکیں اور اخلاقی قدروں کو بھی ملحوظ رکھیں۔

دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یہ نہیں کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ بلکہ دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ایک حقیقت کس زاویہ سے صحیح اور کس زاویہ سے غلط ہے آیا یہ زاویہ کسی طے شدہ نظریہ سے پاک بھی ہے یا نہیں۔ اور صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنے سے پہلے حقیقت کا کون کون سا رخ ملحوظِ خاطر رکھا جانا چاہیے۔ ڈرامہ انارکلی میں اکبر

نے جب انارکلی کو زندہ دیوار میں چنوا دینے کا حکم دیا تو اکبر بحیثیت بادشاہ اپنے فیصلہ میں درست، مگر ایک لڑکی کو محض اس جرم میں سزائے موت دینا کہ اس سے کسی شہنشاہ کا بیٹا محبت کرتا ہے غلط فیصلہ ہے۔ ایسے میں صحیح کیا ہے اس کا فیصلہ کرنے کے لیے بادشاہ کے نظریہ کو تسلیم کیا جائے یا شہزادہ کے زاویہ کو درست قرار دیا جائے؟

کسی بھی امر کے صحیح یا غلط ہونے میں زاویہ نظر کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ زاویے اور نظریہ کی ان کارفرمائیوں پر لے سانس بھی آہستہ۔۔۔ کا یہ بیانیہ ایک بڑے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

''۔۔۔تمہارے ہی سوال سے شروع کرتے ہیں۔تم چھت پر گئی اور ممی چھت پر آ گئیں۔رائٹ۔۔۔'

'ہاں۔۔۔'

'ممی کیوں آئیں۔۔۔؟'

'شک۔۔۔کہ میں کسی سے بات تو نہیں کر رہی۔کسی سے کچھ چل تو نہیں رہا۔۔۔یعنی۔۔۔'

'ال لیگل ۔۔۔ میں مسکرایا_____ لیکن ممی آ سکتی ہیں۔ کپڑے پسارنے یا کسی بھی کام سے۔۔۔لیگل_ _ _ _ _ _ کوئی شک نہیں_ _ _ _ _ کسی شک کی گنجائش نہیں۔۔۔'

ہاں۔۔۔۔

تمہارا موبائل پر بات کرنا۔۔۔؟

سارہ زور سے ہنسی میرے لیے آب ویسلی ال لیگل۔

'ممی کے لیے لیگل_ _ _اب آگے ۔۔۔۔ایسے کچھ اور پوائینٹس سوچو۔۔۔'

سارہ کی آنکھیں چمک رہی تھیں اسے جانے انجانے ایک دلچسپ کھیل مل گیا تھا_____

(لے سانس بھی آہستہ۔۔۔صفحہ ۱۸)

صحیح اور غلط ، لیگل اور ال لیگل ، ترقی اور اخلاقیات کے گرد گردش کرتی 'لے سانس بھی آہستہ۔۔۔' کی کہانی یونانی دیو مالا کے کردار ابراکس کے بنائے نظامِ حیات اور اصول زندگی پر کھری اترتی ہے۔ فلسفہ حیات کے متعلق ابراکس کے اقوال ناول کے شروع میں درج ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس سے اگر ہم جائز اور ناجائز، غلط اور صحیح کے اصول مرتب کریں تو بہت سی دقتیں پیش آئینگی۔ اصول متعین کرنا یا پھر انسانی آزادی کی باتیں کرنا بہت آسان ہے۔ در اصل یہ لفظ آزادی بھی زاویہ نظر پر منحصر ہے۔ مثال کے طور پر جب یہ لڑکی خود ماں بنیگی تو ایک ماں کے ان اصولوں اور زاویوں کو کیا خود پر نافذ نہیں کریگی؟ اور پھر تب وہ اپنی بیٹی کو ایک ماں کے نظریہ سے لیگل اور ال لیگل، صحیح اور غلط کی تعریف متعین کریگی؟ اقتباسِ بالا پر اگر غور کریں تو دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک ہی چیز بیک وقت کسی کے لیے غلط اور کسی کے لیے صحیح ہوسکتی ہے۔ دوسری یہ کہ نئی نسل اخلاقیات کے دائرہ میں رہ کر اپنی بات رکھنے کا ہنر جانتی ہے۔ یعنی پرانی نسل میں جو عام روایت تھی وہ یہ کہ لوگ اور اپنی پوری زندگی محض اخلاقیات کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے برباد کر لیتے تھے یا اخلاقی حدود ملحوظ رہیں اس لیے اپنی بات دنیا کے سامنے رکھ ہی نہیں پاتے تھے۔ سماجی نظامِ حیاتِ انسانی بھی کچھ اس طرح کا تھا کہ اگر کوئی ان حدود کی پروا کیے بغیر اپنی بات دنیا کے سامنے رکھتا تو اس کو آج کی طرح فرینک اور بولڈ کے بجائے بدتمیز اور بے تہذیب کے القاب سے نوازا جاتا۔ آج وہ سارے حدود انسانی ترقی کی راہ میں حائل نہیں بلکہ یہ اخلاقی حدود ذیلی حیثیت رکھتے ہیں اگر یہ انسانی ترقی میں معاون نہیں تو ان کا لحاظ بیوقوفی سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھا جاتا۔

اخلاقیات کے تقاضے اپنی جگہ اور قدرت کے تقاضے جن کے ہاتھوں زندگی مجبور ہوتی ہے وہ دوسری طرف، سماجی اخلاقیات کا معیار ایک الگ اصول۔ ان مختلف اصولوں اور سماجی، معاشرتی، مذہبی، سیاسی یا اخلاقی اصول یا دائرے جن کو ہم نے خود پر تنگ کر لیے ہیں، کب تک ہم ان دائروں میں زندگی گذار پائیں گے؟ اور کیا ہوگا اگر ہم نے ان دائروں سے باہر کسی مجبوری کی وجہ کر قدم رکھا تو؟ جائز یا ناجائز؟ پھر ایک اور دائرہ اور اس میں ہاتھ پیر مارتا انسان۔ مشرف عالم ذوقی نے اپنے اس ناول میں اسی طرح کے کچھ سوالوں کا جواب تلاشنے کی کوشش کی ہے۔ بحیثیت ایک ناول نگار سماجی مسائل کا حل پیش کرنا ناول نگار کا کام نہیں ہوتا۔ اس ناول میں اخلاقیات کی کیا حد ہونی چاہیے اس پر سیدھے سیدھے بات کرنے کے بجائے فنی محاسن کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے سماج کی ایک دکھتی رگ پر انگلی رکھنے کی سعی کی

حالات کا کچھ اس طرح سے جائزہ لیا ہے کہ کرداروں کی مدد سے واقعہ کا ارتقا لامحالہ ہر صفحہ پر قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ آخر قصور کس کا ہے؟ اگر کسی نے کسی اخلاقی گناہ کا ارتکاب کیا تو یہ بہت آسان ہے کہ اس پر یہ فتویٰ لگا دیا جائے کہ وہ گنہگار ہے ۔مگر یہ انصاف نہیں ہوگا۔ کیونکہ جب اسی قاری کو یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے گناہ کس مجبوری کی حالت میں کیا تو اس کے سوچنے کی سمت بدل جاتی ہے۔اسی تکنیک پر اس ناول کا تانا بانا بنا گیا ہے۔فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو فکری اساس کو بحسن وخوبی پیش کرنے میں ذوقی کامیاب ہیں۔ ان کا فکری محور اخلاقیاتِ انسانی ہے۔ انسان کی نفسیات سے متعلق ایک انوکھے مسئلہ کو اس ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔

اس ناول کی سب سے بڑی خوبی جزیات کا دلچسپ ہونا ہے۔ کلی طور پر اس کا پلاٹ کافی گٹھا ہوا ہے اور کہانی کی بساط بہت پہلے سے اور بڑی دور تک بچھائی گئی ہے۔ ناول کہیں پر بھی بور نہیں کرتا ہے اور وجہ اس کی مجھے یہ لگتی ہے کہ پورا کا پورا ناول مصنف کے ذہن میں پہلے سے تیار ہے اور قلم کی باگ کو مصنف مضبوطی سے لے کر چلتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر ہم یہ کہیں کہ قلم مصنف کی رہنمائی نہیں کرتا بلکہ مصنف قلم پر پوری طرح حاوی ہے اس لیے قلم کہانی کو اسی سمت لے چلتا ہے جس سمت مصنف لے جانا چاہتا ہے۔شطرنج کی طرح اس نے بساط پہلے سے تیار کر رکھی ہے اور اس کے سارے موہرے اس کے اشارہ کے انتظار میں دست بستہ کھڑے ہیں۔

اسلوب بہت حد تک قرۃ العین حیدر سے قریب ہے۔قرۃ العین حیدر کے یہاں زیریں لہر کی کار فرمائی زیادہ ہوتی ہے جب کہ ذوقی کے یہاں اس پر زورِ قلم صرف نہیں کیا گیا ہے۔

جو پیغام مصنف دینا چاہتا ہے اسی کے پیغامبر سارے کردار معلوم ہوتے ہیں اور مصنف سے بغاوت کرنے کی ہمت ذوقی کے اس ناول کے کسی کردار میں نہیں۔کہانی کا کلائمکس پہلے سے طے شدہ ہے اور اس کا ارتقا مرحلہ وار بھی پوری طرح مصنف کی گرفت میں ہے۔

تخلیق کے بہاو میں ناول نگار نہیں چل رہا ہے ایسا نہیں ہے کہ وہ لکھتے کچھ اور بیٹھا اور ذہن منتشر ہوا اور وہ شعور کی رو میں کچھ کا کچھ کہتا چلا گیا۔ یہاں بھی وہی معاملہ ہے کہ یہ آج کا مصنف ہے اس نے اسٹریٹجی پہلے سے طے کر رکھی ہے۔قلم کو جس طرف موڑنا چاہتا قلم کو اسی طرف مڑنا پڑتا ہے وہ قلم کے بہکاوے میں نہیں آتا۔اس نسل کی لائف اسٹائل منظّم اور اسٹریٹجک ہوگئی ہے تو ظاہر ہے کہ فن کار بھی اس سے متاثر ہوگا۔ اور اس کے فنی لوازم بھی منظّم اور اسٹریٹجک ہونگے۔

ایسے میں ناول نگار کے لیے جو چیز سب سے زیادہ اہم ہوجاتی ہے وہ ہے انسانی سوچ پر گرفت جو بدلتے وقت، نظریہ، اور ترقیاتِ زمانہ کے لحاظ سے تیزی سے تبدیل ہوتی ہے۔ انسان کی سائیکی پر گرفت کے بغیر فکشن نگار ایک اچھا فکشن قطعی تخلیق نہیں کر سکتا۔نفسیات اور انسان کی سماجی روابط کے انداز میں گہرا رشتہ ہوتا ہے۔نفسیات کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے Ross Macleay اپنی کتاب The Philosophy of Fiction میں لکھا ہے:

Psychology is not to be forgotten, avoided or dismissed absolutely, or quarantined from philosophy, on the basis of any piecemeal or provisional scientific status

(Page 39)

راس میکلی کے اس بیان کے مطابق نفسیات کو بھلایا، یا نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یا سرے سے اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا یا اسے فلسفہ سے محض اس وجہ سے الگ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ عارضی طور پر سائنس کا درجہ رکھتی ہے۔ علمِ نفسیات پر عبور یا کم از کم واقفیت ایک فنکار کو اچھا فن پارہ تخلیق کرنے میں معاونت کرتا ہے۔

لے سانس بھی آہستہ۔۔۔کی کہانی بھی بڑی انوکھی ہے یہ ایک باپ کی کہانی ہے۔ایک ایسی بیٹی کا باپ جو ایک عجیب سے نفسیاتی مرض میں مبتلا ہے۔قاری جب اس باپ کی روداد پڑھتا ہے تو روئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ایک ایسی نفسیاتی مرض میں مبتلا بیٹی کا باپ اپنی روداد سناتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ملاحظہ فرمائیے یہ اقتباس:

''کبھی کبھی بے شرم بن کر خود کو سمجھنا پڑتا ہے کہ میں اس کا باپ ہوں۔۔۔۔ مجھے اس کے کچھے دھونے پڑتے ہیں۔ پیشاب اور پاخانے سے لتھ پتھ اس کی چادر دھونی پڑتی ہے۔۔۔کئی بار۔۔۔اس کی آنکھوں میں خوف کی آمیزش تھی۔۔۔وہ سارے کپڑے اتار کر ننگی ہو جاتی ہے۔اسکی طرف پلٹ کر دیکھنا اللہ کا بھیجا ہوا عذاب لگتا ہے۔مگر کیا کروں۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔اس کی گندگی صاف کرنا۔۔ نہانے کے لیے لے جانا۔۔۔باتھروم میں بھی وہ سارے کپڑے پھینک دیتی ہے۔اسکے جسم پر آنکھیں موند کر صابن لگانا۔۔۔آپ ایک مجبور باپ کی کیفیات کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔۔''

(لے سانس بھی آہستہ۔۔صفحہ ۳۴۷)

موضوع کے اعتبار سے، سماجی نظام کے اعتبار سے، نفسیاتی اعتبار سے بیان کرنے کی تکنیک کے اعتبار سے ہر لحاظ سے یہ کہانی ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ ایک ایسی نفسیاتی کیفیت کا بیان کے پڑھتے وقت قاری کی آنکھیں بڑی بڑی ہو جاتی ہیں اور وہ خود کو ایک حیرت انگیز دنیا میں موجود محسوس کرتا ہے۔نفسیات پر پکڑ اور علمِ نفسیات کے مطالعے کے بغیر اس طرح کے مکالمے تخلیق کرنا ناممکن ہے۔

ذوقی نے اس کہانی کا پتہ ساڑھے تین سو صفحات تک نہیں کھولا ہے۔ اور جب اس کہانی کے سارے پتے کھل جاتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ شروع کے مکالمے یونہی لفظی بازیگری نہیں تھے بلکہ ان کا نفسیاتی، معنیاتی، اور ساختیاتی تعلق پلاٹ کے اس کلائمکس سے ہے جس کا انکشاف اخیر میں ہوتا ہے اور تب قاری اس ناول کو دوبارہ پڑھنا چاہتا ہے۔ اور جب دوبارہ پڑھتا ہے تو کہانی پورے آب وتاب سے اس کا استقبال کرتی ہے۔اور اب چونکہ پتے کھل چکے ہوتے ہیں تو ہر لفظ کے پیچھے کھڑے معنی کے قافلے تک رسائی ہو جانے کی وجہ کر ہر مکالمہ اور ہر جملہ کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ اس ناول میں زبردست readability ہے۔ بلا کی complexity اور ساتھ ساتھ اسلوبیاتی اعتبار سے simplicity بھی ہے۔ لے سانس بھی آہستہ۔۔ کچھ اس طرح کی کتاب ہے کہ اس کو تھوڑا تھوڑا جزیات کے مزے لے لے کر پڑھا جائے اگر ایک ساتھ پوری کتاب سرسری پڑھ لیں تو اس کی مثال یوں ہوگی کہ کوئی شخص بغیر چبائے گوشت کے نوالے نگلتا چلا جائے۔ وہ اس کے مزے سے بھی محروم رہ جائیگا اور اس کا پیٹ بھی خراب ہو جائے گا یعنی صحت کے لیے یہ اچھا نہیں۔ ایک جرمن مقولے کے مطابق کتاب پڑھنے کی بھی کچھ یہی صورت ہوتی ہے۔مقولہ ہے:

It is not healthy to swallow books without chewing

تکنیک کے اعتبار سے فلیش بیک کا استعمال اس ناول کی کامیابی میں بڑا اہم رول ادا کرتا ہے۔اگر یہ ناول فلیش بیک میں نہ لکھا گیا ہوتا تو شاید اتنا پر اثر بھی نہیں ہو پاتا۔

تہذیب ایک ایسا موضوع ہے تبدیلی جس کا مقدر ہے۔ پریم چند نے اس تہذیب پر قلم اٹھایا جو ہندوستان کا اصلی چہرہ تھا دیہی زندگی کی عکاسی۔ آگے بڑھیں قرۃ العین حیدر کے یہاں حویلیوں کے ٹوٹتے کھمبے تلے دم توڑتی تہذیب اور اس کی جگہ لیتی نو دولتیوں کی بے ہنگم بغیر رکھ رکھاؤ والی تہذیب کی داستان اور اس کے بعد ایک خلا۔تہذیب کے موضوع پر ایک بڑا خلا پھر آج کا لکھنے والا قلم سنبھالتا ہے۔مشرف عالم ذوقی نے لے سانس بھی آہستہ میں آج کی تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ جس طرح برسوں پہلے حویلیوں کی تہذیب کے پرزے اڑے تھے آج بھی تاریخ خود کو دہرا رہی ہے۔ وہ نئی تہذیب جس کو ہم تصنع سے پاک سمجھتے تھے جس میں وہ نقلی رکھ رکھاؤ نہیں تھا جو حویلیوں اور فیوڈل نظام سے ہمیں وراثت میں ملی تھی۔مگر اب اس تہذیب کی بھی قلعی کھلنے لگی۔ پتہ یہ چلا کہ جب ہم نے اپنی پرانی تہذیب کو رد کر کہ نئی تہذیب کی نقاب کشائی کی تھی تو ہم تو بڑے نازاں ہوئے تھے کہ ہم اس تہذیب کی بنیاد ڈال رہے ہیں جس میں اخلاقی رکھ رکھاؤ اور بوجھل حفظ مراتب نہیں بلکہ سچائی کو بے نقاب کرنے اس سے بے خوف ہو کر نظریں ملانے سے اب ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔اب زمانے نے ایک دفعہ پھر کروٹ لی اور نئی نسل نے محسوس کیا کہ یہ نام نہاد نئی تہذیب بھی دراصل اخلاق کا پاجامہ پہنے ہوئے ہے۔سچائی کا سامنا کرتے وقت یہ تہذیب بھی اخلاقی بندھنوں کی وجہ کر لڑکھڑا جاتی ہے اس لیے ہم خود کو ان بندوں سے آزاد کر لینا چاہتے ہیں۔ تہذیب کی اس اتھل پتھل نے نام نہاد نئی تہذیب کے علم برداروں کو سکتے میں ڈال دیا

ہے۔اور وہ اپنا سر دھنتے نظر آ رہے ہیں کہ ہائے ہمارے بچوں کو کیا ہوا یہ کس منزل کی طرف جا رہے ہیں؟ مگر یاد کرو وہ دن جب تمہارے اباو اجداد نے تمہیں اخلاقیات کا سبق پڑھایا تھا اور تمہیں حفظ مراتب، رکھ رکھاؤ سکھانے کی کوشش کی تھی تو تم نے کیا کیا تھا؟ آج کی نسل جب اسی روایت کو آگے بڑھا رہی ہے تو اتنی تکلیف کیوں ہوتی ہے۔ اور اگر ہوتی ہے تو یاد کرو وہ دن جب تم نے اپنی نئی تہذیب کا پرچم لہرایا تھا تو اس وقت کی تہذیب کے علم برداروں پر کیا گذری ہوگی۔ اب تمہاری باری ہے۔

ایک اچھی کتاب کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہونا چاہیے کہ وہ ایک ایسی دنیا میں ہے جو اس دنیا کے مدمقابل تیار کی گئی ہے۔ اور وہ اس دنیا سے بے خبر ہو جائے۔ ذوقی کے اسلوب میں وہ ندرت ہے کہ پڑھنے والے کو اس طرح کی ایک الگ دنیا میں ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ تہذیب کے اتھل پتھل ہونے کی کہانی جو آپ نے مندرجہ بالا سطور میں سنی یہ دراصل خارجی دنیا اور اجتماعی سماج کی داستان ہے۔ اسی ناول میں ایک اور دنیا ہے، داخلی دنیا اور انفرادی کشمکش۔ آپ ذرا اس کہانی کے نفسیاتی پہلو پر غور فرمائیے۔

ایک باپ ہے، اس کی ایک بیٹی ہے۔ وہ بیٹی ایک نفسیاتی مرض کی شکار ہے ایسی مریضہ جس کو ہمارے سماج میں پاگل کہا جاتا ہے۔ وہ کبھی کبھی اپنے سارے کپڑے اتار کر پھینک دیتی ہے۔ اور بستر پر ہی اضابت کر ڈالتی ہے۔ وہ باپ اس لڑکی کو پالتا ہے۔ بیٹی دھیرے دھیرے جوان ہوتی ہے۔ وہ باپ ایک باپ تو ہے مگر ایک مرد بھی ہے۔ وہ لڑکی بیٹی تو ہے مگر ایک عورت بھی ہے۔ ایسے میں ایک باپ کے لیے اس بیٹی کو نہلانا اس کے کپڑے دھونا۔ اس کو باتھ روم لے جانے یہاں تک کہ اس کے جسم میں صابن تک لگانے کی ذمہ داری اس کو نبھانی ہوتی ہے۔ ایسے میں جب اس لڑکی کو سیکس کی طلب ہوتی ہے تو وہ اپنے باپ کو ایک باپ نہیں سمجھتی کیونکہ یہ تو عقل والے لوگ سمجھا کرتے ہیں وہ اس باپ کو ایک مرد سمجھتی ہے اور اپنی طلب کو پورا کرنا چاہتی ہے۔ ایسے میں ایک باپ کے لیے کتنی بڑی آزمائش ہوگی۔ اس کی نفسیاتی کیفیت کیا ہوگی۔ اس کا تو صرف اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اور ایسے میں جب وہ باپ ایک دن بیٹی کی ضد کے آگے جھک جاتا ہے اور اس کی طلب پوری کر دیتا ہے تو ایسے میں اس کی داخلی کیفیت کے بارے میں ایک عام انسان تو سوچ بھی نہیں سکتا۔

اب آپ یہ کہینگے کہ بھلا ایسا ہوتا ہے کیا؟ یہ تو اس دنیا کی کہانی نہیں لگتی۔ دراصل اسی دنیا میں اس طرح کی کہانیاں بھری پڑی ہیں ذوقی نے تو ایک مجبور باپ کا المیہ پیش کیا ہے ورنہ یہ دنیا تو اتنی غلیظ بھی ہے کہ ایک باپ اپنی بیٹی کو اپنی ہوس کا شکار بناتے وقت ایک دفعہ بھی یہ نہیں سوچتا کہ وہ یہ کیا کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر آج (19 june 2012) دل دہلا دینے والی خبر میں نے پڑھی آپ بھی پڑھیے:

June 19 (IANS) Bangalore Police early Tuesday arrested French diplomat Pascal Muzurier on the charge of sexually abusing his minor daughter.

"We have arrested Mazurier and taken him into custody from his residence in the early hours...We will produce him in the court later in the day after medical examination," Bangalore Additional Police Commissioner (Law & Order) T. Sunil Kumar told IANS here.

Mazurier is the deputy chancery in head of the French consulate here.

اس طرح کی دلدوز خبریں ہر روز اخباروں میں شائع ہوتی ہیں۔ تو یہ کسی ایسی دنیا کی کہانی نہیں جو ایک فکشن نگار کے خیالوں ہی میں زندگی کرتا ہو۔ ایک ایسی نری سچائی بھی ہے جس پر بات کرنے کے لیے بھی بہت ہمت چاہیے اور ایسے میں اس طرح کے موضوع پر ناول لکھنا تو دل

گردے کی بات ہے۔

اس ناول میں ذوقی نے جس باپ کے کردار کو پیش کیا ہے وہ تو ایک خاص حالات میں وہ گناہ کرتا ہے جس کی سزا ایسی ہے کہ وہ زندگی کا ہر لمحہ گھٹ گھٹ کر جیتا ہے کیونکہ اس کے اندر ایک احساس جرم پل رہا ہوتا ہے۔ اسی نفسیات پر یہ ناول ارتقائی مراحل طے کرتا ہے۔ ذرا غور کریں کہ اگر یہ احساسِ جرم بھی نہ ہوتا تو؟؟؟ شاید اس طرح کی کہانی لکھنے کی ہمت ذوقی بھی نہیں کر پاتے۔

جب ذوقی نے اس موضوع پر ناول تخلیق کرنے کا فیصلہ کیا ہوگا تو اس وقت ان کی داخلی کیفیت کیسی رہی ہوگی وہ کس طرح کی نفسیاتی کشمکش میں مبتلا رہے ہونگے۔ ممکن ہے کہ وہ باپ کہ اس کردار پر پھوٹ پھوٹ کر روئے ہوں۔ اور کئی دفعہ ایسا بھی ہوا ہوگا کہ انہوں نے ان مکالموں کے لیے ہمت کی کمی محسوس کی ہو جس میں طلب پوری کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ اور پھر اپنی پوری ہمت یکجا کر وہ بات کہی ہو جو اس دنیا کی تلخ حقیقت ہے۔

اس ناول میں نادرہ کا کردار بہت اہم ہے۔ جب سے وہ پیدا ہوئی تب سے شادی تک وہ مصیبت میں مبتلا رہی۔ نادرہ عبدالرحمٰن سے محبت کرتی ہے مگر نور محمد کی ماں کے انتقال کے بعد نادرہ نور محمد کے قریب آنے لگتی ہے اور نادرہ کے والد کی دوسری شادی کی وجہ سے نادرہ کے ذہن پر نفسیاتی دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ حالات کچھ اس طرح پیدا ہوتے ہیں کہ نادرہ کی شادی نور محمد سے ہو جاتی ہے۔ یہ سارے واقعات کہیں نہ کہیں تہذیب کی اخلاقی بندشوں کی وجہ کر عمل میں آتے ہیں۔

دوسری طرف نور محمد عبدالرحمٰن کو اپنا ہمدرد سمجھتا ہے اور اس سے اپنے دل کی ہر بات بتاتا ہے۔ شادی کے بعد نادرہ پر ذہنی اور نفسیاتی دباؤ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ نادرہ کو دورے پڑنے لگتے ہیں۔ وہ ایک عجیب سی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتی ہے۔ اور پھر اس کو ایک بیٹی پیدا ہوتی ہے جو نگار ہے اور یہ وہی لڑکی ہے جس کی بیماری کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا جا چکا۔

وہ لڑکی نگار آخر اس نفسیاتی بیماری کا شکار کیوں ہوئی؟ اس طرف کسی کی توجہ نہیں جاتی۔ در اصل اس کا تعلق بھی تہذیب کی قید و بند سے بہت گہرا ہے۔ وہی اخلاقی بندشیں اور ان بندشوں میں گھٹتی زندگی۔ اب کی نسل ان اخلاقی بندشوں میں گھٹنے کی روادار نہیں۔ وہ ساری بندشیں توڑ دینا چاہتی ہے۔ تو ایک وہ نسل جو خود کی مرضی پر اخلاقیات کو فوقیت دیتی تھی اور دوسری طرف وہ نسل جو اس کے نتیجے بغیر اف کیے برداشت کرتی رہی۔ آخر عبدالرحمٰن نے نادرہ سے شادی کیوں نہیں کی؟ یا پھر نور محمد سے شادی کرتے وقت نادرہ نے یہ صاف صاف کیوں نہیں کہا کہ وہ عبدالرحمٰن سے محبت کرتی ہے۔ اور جب ان سب کے نتیجہ میں نگار پیدا ہوئی تو ایک باپ کی حیثیت سے اپنی پوری ذمہ داری بغیر اف کیے نور محمد کیوں نبھاتا رہا ان سب سوالوں کے جواب کی کڑی تہذیب کی تبدیلی سے مل جاتی اور ان مختلف تہذیبوں کے مطابق پھر وہی ابرا کس کا فلسفہ کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔

اس ناول کے شروع میں جب قاری کو اس پورے واقعے کی کوئی خبر نہیں عبدالرحمٰن اور اس کی پوتی سارہ کا ردار کے بیچ مکالمے میں سارہ کا یعنی نئی نسل کی خود اعتمادی صاف ظاہر ہے۔ نسلوں کے فرق میں آپ اور تم کا بھی فرق مٹ چکا ہے۔ سارہ کی خود اعتمادی اس بات کا اشارہ ہے کہ نئی نسل کس قدر فریک ہے وہ اپنی بات بے حد خوبصورتی سے رکھنا جانتی۔ وہ Art of expression سے واقف ہے، وہ گھٹ گھٹ کر جینے میں یقین نہیں رکھتی۔ وہ اپنی زندگی بڑی آزادانہ طور پر جینا چاہتی ہے اور اس کے لیے اس کے اندر ہمت بھی ہے اور جذبہ بھی۔

اس پورے ناول میں کردار نگاری کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس جائزہ میں سب سے زیادہ معاون ساختیاتی طریق تنقید ہوگا کیونکہ ہر کردار ایک خاص ماحول کی پیداوار ہے۔ اس ناول کے کرداروں کے بننے بگڑنے اور عمل پیرا ہونے میں ان کرداروں کے پس منظر کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر نگار ایک مریضہ ہے تو اس کے پیچھے اس کی ماں اور اس کے باپ کے ذہنوں پر پڑنے والا stress کارفرما نظر آتا ہے۔ اسی طرح عبد الرحمٰن اور نور محمد کے کرداروں میں ان کی رقابت کو دخل ہے اور ساتھ ساتھ تقسیمِ ملک اور اس کے بعد کا یہ عہد ایک طرف ان پر اثر انداز ہوتا ہے تو دوسری طرف حویلیوں کی تہذیب میں ان کی پرورش آخر میں حویلی بیچ دینا در اصل پرانی تہذیب سے ان کے دست بردار ہونے کا استعارہ ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ اس ناول میں مکالموں پر بیانیہ بھاری ہے اور یہ اس کا عیب نہیں کیونکہ جہاں بھی مکالمے ہیں بلا کی اثر انگیزی رکھتے ہیں۔ چونکہ بیانیہ اس ناول میں زیادہ اہم ہے اس لیے

بقول گوپی چند نارنگ:

''ساختیاتی طریقہ کار بیانیہ (Narrative) کے مطالعے کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔اس کی اطلاقی سرگرمی سب سے زیادہ اسی میدان میں ملتی ہے۔بیانیہ کا ایک سرا متھ، اساطیر دیو مالا، کتھا کہانی وغیرہ لوک روایتوں (Folklore) سے جڑا ہوا ہے تو دوسرا ایپک، ڈرامے، ناول اور افسانے سے جڑا ہوا ہے۔ موخر الذکر اصناف طوالت، پیچیدگی اور فنی تراش خراش میں بیانیہ کے اولین تاریخی نمونوں سے خاصی مختلف ہیں۔تاہم بیانیہ کی طویل تاریخ میں بعض ساختیاتی عناصر مشترک بھی ہیں، مثلاً پلاٹ، منظر نگاری، کردار، مکالمہ انجام وغیرہ۔ساختیاتی فکر چونکہ نظروں سے اوجھل داخلی ساخت اور کلی تجریدی نظام پر زور دیتی ہے۔ بیانیہ کی مختلف اقسام کا مطالعہ ساختیات کے لیے خاص کشش رکھتا ہے۔اور ساختیاتی مفکرین نے اس چیلنج کو بخوبی قبول کیا ہے۔''

(فکشن شعریات تشکیل وتنقید، گوپی چند نارنگ صفحہ ۳۲۱)

اس ناول میں بھی نظروں سے اوجھل داخلی ساخت اور کلی تجریدی نظام پر مصنف کا زور زیادہ ہے اس لیے اگر ہم اس ناول میں موجود کرداروں کے داخلی جذبات کا تجزیہ کریں اور ان کی داخلی کشمکش پر بات کریں تو ہم اس ناول کا مقام زیادہ پر اثر طریقہ سے متعین کر پائینگے۔ چونکہ اس ناول میں خارجی پہلو کم اور داخلی احساسات ومحرکات زیادہ ہیں اس لیے ان کی ساختیات کا مطالعہ اس ناول کے مطالعہ میں زیادہ معاون ہوگا۔

اب اس ناول کے ہر کردار اور اس کے وجود میں آنے کے محرکات اور اس کی زندگی کے حادثات وواقعات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس ناول میں ایک نیا ڈائمنشن ابھر کر سامنے آئیگا اور وہ ہے ایک عورت کا المیہ۔ ایک عورت اس ناول میں نادرہ ہے جو پوری زندگی سکون سے نہیں رہتی اور ہمیشہ ہر طرح کے تغیر وتبدل کا نشانہ بن جاتی ہے۔ نگار کا المیہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اس کا قصور وار کبھی مردوں کو نہیں ٹھہرایا جا سکے گا۔ غلطیاں چاہے کوئی بھی کرے حالات چاہے موافق ہوں یا مخالف حالات، تہذیب اور اخلاقی بندشوں کا شکار سماج میں عورت ہی ہوتی ہے۔ وہ چاہے نادرہ ہو یا نگار یا پھر سارہ کاردار۔ ہمارا سماج بھی عجیب ہے عورت اگر کوئی بھی بڑا کارنامہ انجام دے تو اس کا سارا کریڈٹ مرد کو دے دیا جاتا ہے اور اگر وہ کہیں پر بھی ہلکی سی چوک کر بیٹھے تو سارے الزام کی سزا وار عورت ہوتی ہے۔ اس سماج میں ساری قربانیاں عورتوں ہی سے مانگی گئی ہیں۔ عبدالرحمٰن اور نور محمد نے اپنی محبت کے لیے کوئی قربانی نہیں دی البتہ فرض کی قربان گاہ پر نادرہ کو ہی قربانی دینی پڑی اور اس کا نتیجہ بھی نگار کو بھگتنا پڑا۔ کیا ہوتا اگر نادرہ نے ایک لڑکی کے بجائے ایک بیٹا جنا ہوتا؟ کچھ نہیں ہوتا پھر تو نہ کوئی گناہ ہوتا اور نہ کوئی احساسِ جرم۔ سب کی زندگی مزے میں کٹی ہوتی تب بھی تکلیف اور کرب میں مبتلا اس کی ماں ہی ہوتی۔یعنی ایک عورت۔

تہذیبوں کے تصادم اور ٹوٹنے بننے کی بحث کے دوران شعور کی رو میں مصنف نے ماحولیات سے متعلق انسان پر جو طنز کیا ہے وہ قابلِ غور ہے یعنی شعور کی رو کا استعمال بھی اس ناول میں جا بجا ہوا ہے اس کی ایک مثال مندرجہ بالا سطور بھی ہیں۔ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ مصنف نے کسی خاص اسلوب کا استعمال کسی خاص ماحول، یا خاص وقوعہ کے لیے کیا ہے۔ اس ناول کی بہت بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ایک well-planned ناول ہے۔لیکن planning کی اس خصوصیت کا دائرہ صرف پلاٹ تک ہی محدود ہے۔طرزِ نگارش طے شدہ معلوم نہیں ہوتا۔

'لے سانس بھی آہستہ۔۔۔' اکیسویں صدی کے اوائل میں منظرِ عام پر آنے والے اردو ناولوں میں یقیناً ایک بڑا اہم نام ثابت ہوگا۔ یا یوں کہیے کہ اردو ادب کی تاریخ میں اکیسویں صدی کے اوائل میں وجود میں آنے والا یہ ناول تاریخی اعتبار سے، تکنیکی اعتبار سے، اسلوب کے اعتبار سے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔

☆☆☆☆



ڈاکٹر عشرت ناہید
مانو لکھنو کیمپس، لکھنو
Mub: 9598987727

ترنم کی ریاضت اور معرفت : ابابیلیں لوٹ آئیں گی

اردو فکشن جو کہ بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی میں پوری طرح خواتین کے قلم کی گرفت میں نمو پا رہا ہے۔ان خواتین قلم کاروں میں ترنم ریاض ایک ایسا نام رہا ہے جس نے تخلیق کی مختلف جہات کو اپنی مخروطی انگلیوں کی جنبش سے خوبصورتی ہی نہیں عطا کی
بلکہ سخت اور تلخ حقائق کو بھی تحریر کر کے اپنے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے عورت کے بدلتے روپ کی عکاسی کی ہے کہ وہ صرف حسن و عشق کا مجسمہ نہیں جیتی جاگتی زندگی ہے جس پر حالات جب اثر انداز ہوتے ہیں تو وہ انہیں ضبط نہیں کرتی بلکہ ان آنسوؤں کو حروف کی شکل میں دنیا کو سونپ دینے کی جسارت بھی رکھتی ہے۔

'ابابیلیں لوٹ آئیں گی' ترنم ریاض کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جو کہ سن دو ہزار میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعے کا عنوان ہی بہت معنی خیز ہے ،ذہن کے دریچوں کو وا کرنے والا ہے،سوالات کا م کرتا نظر آتا ہے نیز قاری کو تاریخ کے اوراق پلٹنے کی دعوت دیتا ہے کہ
ابابیلوں کا تعلق تو خدا کے گھر سے رہا ہے ابرہہ نے جب خدا کے گھر کو ڈھانے کا ارادہ کیا تو حضرت عبدالمطلب نے خدا سے عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی بے بسی بیان کر دی تھی کہ میں اور میرے ساتھی تیرے گھر کی حفاظت کرنے کے اہل نہیں ہیں۔یہ تیرا گھر ہے تیرے حوالے۔اب تو خود اس کی حفاظت فرما۔تب خدا نے ابابیلوں کو بھیج کر ابرہہ کے ناپاک ارادوں کو مسمار کر دیا تھا۔

ترنم ریاض کے افسانوی مجموعے 'ابابیلیں لوٹ آئیں گی' میں شامل افسانے انسانیت کے سبق کو بھلا دینے والے انسانوں کی داستانیں معلوم ہوتے ہیں اور انسان کے انسان پر کیے جانے والے ظلم و جبر اس کے استحصال کے خونچکاں واقعات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔تو کیا ترنم ریاض انسان کی انسانیت سوز حرکات کی وجہ سے خدا کی مخلوق سے ہی مایوس ہو چکی ہیں؟ خدا کی تخلیق جسے اس نے خود اشرف المخلوقات کا تاج پہنایا کیا وہ تاج بے نور ہو چکا ؟ کیا وہ اپنی عظمت کھو چکا؟ کیا انسانیت کی حفاظت کے لیے ایک بار پھر ابابیلوں کی شکل میں خدائی امداد کی ضرورت ہے کہ وہ آئے اور خدا کی اس مخلوق جسے انسان کہتے ہیں اس کی انسانیت کی انسان دشمن طاقتوں سے حفاظت کریں کیونکہ اب اس روئے زمین پر مظالم کے بال و پر اتنے بڑھ چکے ہیں کہ انہیں تراشنے کے لیے خدائی طاقت درکار ہے۔

ترنم ریاض اس مجموعے کو یہ عنوان دے کر ہمارے ذہن کو ایک امید اور حوصلہ بھی دینا چاہتی ہیں کہ ظلم جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو اس کے نیست و نابود ہونے کا وقت بھی قریب آ جاتا ہے،ہمیں پر امید رہنا چاہیے کہ ابابیلیں ایک بار پھر آئیں گی اور ظالموں کا خاتمہ کر دیں گیں۔

ایک اور بات جو کہ قابل غور ہے اس عنوان کے تحت ابھرتی ہے کہ ابابیل مونث ہے، کیا یہ استعارہ ہے عورت کا؟ کہ اس کائنات میں ہر ظلم

اسی پر سے گزر کر اپنی انتہا پر پہنچتا ہے تو کیا وہی اس ظلم کو ختم کرنے کی وجہ بنے گی؟ شاید کہ ایسا ہی ہو۔ وہ ناتواں کیا ایسی کوئی توانائی پا جائے گی کہ ظالم کا وجود ہی مٹا ڈالے گی؟ کیونکہ تمام کائنات کو ہلا ڈالنے والی توانائی تو اسی کے پاس ہے، اسی کی تڑپ تو زمین کا کلیجہ چیر ڈالتی ہے اور زمین لق و دق صحرا میں پانی اگل دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

جب ہم اس مجموعے کے اندرونی صفحات کی طرف بڑھتے ہیں تو عنوان ہی کی طرح ترنم ریاض ایک بار پھر چونکا دیتی ہیں وہ قرآن کی آیت اور اس کا ترجمہ پیش کرتی ہیں جس میں غور و فکر کی دعوت ہے کہ اس خالق نے انسان کو ماں کے پیٹ سے پیدا کرا سے سماعتیں اور بصارتیں عطا کی ہیں جس کا احسان مانتے ہوئے اسے رب کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ اس مجموعے کو انہوں نے اپنے محبوب شوہر ریاض پنجابی کو معنون کیا ہے۔ ریاض پنجابی جوان کا عشق ہیں ۔

اس کے بعد کے صفحے پر وہ صوفی شاعر بلھے شاہ کا کلام پیش کر دیتی ہیں کہ عشق حقیقی اور مجازی کے مابین جو باریک سا رمز پنہاں ہے اس تک کوئی صاحب بصیرت ہی رسائی پا سکتا ہے۔ جس طرح ہیر اور رانجھا میں من و تو کا فرق مٹ گیا تھا دونوں ایک دوسرے کی ذات میں موجود دوئی کو بھول چکے تھے، وہ یکتائی وہ محبت کی انتہا اور اس عشق کی تپش کو سمجھ لینا آسان نہیں بلکہ یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات بھی نہیں ۔ یہ صوفیانہ انداز دریائے چناب کی یہ عشقیہ داستان اور پھر بلھے شاہ کا عارفانہ کلام قاری کے دل پر دستک دیتا ہے۔ یہ مجموعہ مطالعے سے پہلے ہی یہ احساس کروا دیتا ہے کہ افسانہ نگار وقت کی نباض ہی نہیں صوفیانہ سوچ کی حامل بھی ہیں۔

ترنم ریاض کے افسانوں میں یہ صوفیانہ انداز ان کے قلم سے نکلے حروف کو جاودانی عطا کرتا ہے۔ آگے کے صفحے پر وہ للاہ جو کہ کشمیر کی پہلی خاتون صوفی شاعرہ ہیں جنہیں وہاں کی ثقافت نے اپنی تہذیب سے وابستہ کر لل دید کے نام سے پکارا ہے اور

> لل دید کہتی ہیں (اردو ترجمہ) ''پڑھتے پڑھتے میری زبان اور تالو گھس گئے مگر میں تمہارے میعار کے مطابق کام نہ کر سکی تسبیح پڑھتے پڑھتے میری زبان اور انگلی گھس گئی من کا میل نہ دھل پایا ''

جنہیں للاہ عارفہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ چودھویں صدی یعنی اسلام کے آغاز کے دور کی شاعرہ ہیں جنہوں نے اپنی شاعری میں عشق حقیقی کی رسائی کی راہگزر کو بڑے پرسوز انداز میں پیش کیا ہے ۔

لل دید کہتی ہیں (اردو ترجمہ)'' پڑھتے پڑھتے میری زبان اور تالو گھس گئے مگر میں تمہارے میعار کے مطابق کام نہ کر سکی، تسبیح پڑھتے پڑھتے میری زبان اور انگلی گھس گئی من کا میل نہ دھل پایا ''

ترنم ریاض ان کے اشعار کو پیش کر کے قاری کو تصوف کی ایک نئی دنیا کا باسی بناتی ہوئی چلتی ہیں ان کی یہ فضا بندی متاثر کن ہے۔ وہ تخلیق کار ہیں لیکن اپنے خالق کے سامنے اپنی کم حیثیتی کا اعتراف بڑے عاجزانہ انداز میں کرتی ہیں جبکہ وہ جانتی ہیں کہ ان کے اور اصل تخلیق کار کے درمیان کا رشتہ کتنا مضبوط ہے۔ وہ معاون خلق کے طور پر دنیا میں لائی گئی ہیں۔ صناع کار کوئی اور ہے لیکن دنیا میں تخلیق کا وسیلہ (عورت) تو وہ ہیں ۔ ذہن کو روشن تو اس کا نور کر رہا لیکن صفحہ قرطاس پر حروف شکل تو ان کا قلم دے رہا ۔ حروف ساز انہیں جاودانی دینے کے لیے ان کی انگلیوں کی جنبش کا متقاضی ہے۔ حقیقت جاننے کے باوجود بھی تشنگی انہیں معرفت کی راہ پر گامزن کرتی نظر آتی ہے ۔ ترنم ریاض تخلیق کے مراحل سے گزرتے ہوئے معرفت کے نجانے کتنے انجان راستوں کی مسافر بنتی ہیں ۔ یہ راز انہی کی ذات کا خاصہ بن کر رہ گیا۔ لل دید کے اشعار اور ان کا اردو ترجمہ ان کے آگہی کے روزن تک ہمیں پہنچا دیتا ہے۔

اشعار کی یہ پیش کش ترنم ریاض کی ریاضت اور معرفت مزاجی دونوں کے امتزاج کی گواہی دیتے ہیں ۔ ان منازل کا پتہ دیتے ہیں جہاں کا سفر انہیں مقصود تھا ۔ وہ ہر کہانی لکھنے کے بعد بھی اس کے نامکمل ہونے کے احساس سے نبرد آزما ہوتی نظر آتی ہیں ۔ اور یہ سلسلہ کبھی پورا نہیں ہوتا کیونکہ دنیا میں کبھی کوئی کہانی مکمل ہی نہیں ہوئی ہے ۔

ترنم ریاض کے افسانوں کو پڑھنے

پر علم ہوتا ہے کہ ان کے موضوعات آس پاس بکھری زندگی کی چھوٹی بڑی کہانیاں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ موضوعاتی تنوع نظر آتا ہے۔کہیں وہ عورت کے جنسی استحصال کو موضوع بناتی ہیں تو کہیں بزرگوں کو نظر انداز کرتے معاشرے کو، کہیں نچلے دبے کچلے طبقے کے حالات قلم بند کرتی ہیں تو کہیں نوجوانوں کی نفسیات کو، گھر کی چہار دیواری سے باہر کی خوبصورتی کے ساتھ سماج کے تمامتر بدصورت مناظر بھی ان کے یہاں جا بجا نظر آتے ہیں جو کہ بدنما داغوں کے سوا کچھ نہیں ہوتے ۔کہیں شہری زندگی کی گہما گہمی میں تنہائی کا عالم چبھن پیدا کرتا نظر آتا ہے تو کہیں گاؤں کے دلفریب مناظر لبھاتے ہیں لیکن ساتھ ہی ظلم و جبر کی داستانیں بھی سنائی دیتی ہیں ۔کہیں رشتوں کا تقدس پامال ہوتا دکھائی دیتا ہے تو کہیں انجانے رشتوں کی پاکیزگی دل کو چھو لیتی ہے ۔کہیں کرداروں کی ظاہری اور باطنی خوبیاں مرعوب کرتی ہیں تو کبھی ان کے کریہہ اور مکروہ کارنامے انسانیت کو شرمسار کرتے ملتے ہیں ۔غرض سماج کا شیرازہ کس طرح بکھر رہا ہے اس کا درد ان کے افسانوں میں ہر روپ میں نظر آتا ہے ۔ترنم ریاض مقامی حالات پر کہانیاں لکھ کر اپنی مٹی کا قرض اور اپنا فرض بھی ادا کرتی ہیں ۔ ان تمام موضوعات کو دیکھتے ہوئے جب ان کے افسانوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو نسائی آواز ہی بلند نظر آتی ہے ۔عورت ایک مستقل موضوع کے طور پر موجود ہے جسے وہ پوری جمالیات اور حقیقت کے ساتھ پیش کرتی ہیں ۔ وجود زن سے کائنات کو رنگین کرنے کے لیے ان کے یہاں رومانی فضا بھی ملتی ہے اور سچائیاں بھی کہ دونوں روپ کا امتزاج ہی اصل زندگی ہے۔

اس مجموعے میں شامل ان کا افسانہ ''باپ'' ایک ایسے موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے جو قاری کو اندر تک جھنجھوڑ دیتا ہے اور سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ انسانیت کا لبادہ اوڑھ کر تو باہری دنیا کے لوگ گھنونے کھیل کھیلتے ہیں لیکن اس افسانے میں تو باپ ہی حیوان بنا ہوا ہے ۔وہ باپ جس کے ساتھ

اس افسانے باپ ایک شرابی اور ظالم انسان ہے جس نے اپنی بیوی پر زندگی بھر ظلم کیا اور ایک دن اتنا زدوکوب کیا کہ وہ غریب صاحب فراش ہو کر رہ گئی ۔اب اس کی نظر اپنی بیٹیوں پر ہے ماں بے بسی کی مورت بنی سب کچھ دیکھنے پر مجبور ہے۔

بیٹیوں کا شفقت ،محبت اور محافظ کا رشتہ ہے وہی بھیڑیا بن گیا ہے ،ایسے میں سوال اٹھتا ہے کہ آخر بیٹیاں کہاں جائیں ؟ کہاں اپنے آپ کو محفوظ سمجھیں کوئی پناہ گاہ نہیں؟ ایسے ماحول میں ایک بیٹی اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل پیرا ہو جاتی ہے۔

اس افسانے باپ ایک شرابی اور ظالم انسان ہے جس نے اپنی بیوی پر زندگی بھر ظلم کیا اور ایک دن اتنا زدوکوب کیا کہ وہ غریب صاحب فراش ہو کر رہ گئی ۔اب اس کی نظر اپنی بیٹیوں پر ہے ماں بے بسی کی مورت بنی سب کچھ دیکھنے پر مجبور ہے ۔وہ صرف زبان سے ہی اپنے درد کا اظہار کر پاتی ہے اس کی یہ بے چارگی قاری کو اس کی نفسیات سے واقف ہی نہیں کرواتی بلکہ اس کے درد میں شریک کر لیتی ہے ۔جب وہ بڑی بیٹی کا استحصال کرتا ہے وہ تڑپ اٹھتی ہے اور چیخ پڑتی ہے:

''مر کر بھی تمہیں چین سے بیٹھنے نہیں دوں گی ----

سانپ----اپنے ہی بچوں کو کھاتے ہو ---شیطان ،درندے ---کلیوں کو ------میری بچیوں پر---- میری ----میری---امی کی سانسیں بے ترتیب ہوگئی تھیں ان پر غشی سی طاری ہونے لگی۔

کاش ---کاش---میں تمہیں ----میں تمہیں کوئی -----سنگسار کیوں نہیں کر دیتا ------''

امی کی آواز ڈوب گئی ''(ابابیلیں لوٹ آئیں گی:ص:۴۷)

ماں اور بیٹیوں کی اس بے بسی کا حل ان کے پاس نہیں ہے ۔کوئی راہ کوئی روزن نہیں ایسے میں منجھلی بیٹی ساحرہ جو آٹھویں درجہ کی طالبہ ہے، دھن کی پکی ذہین اور محنتی بھی ہے، باپ کی مذموم حرکتوں پر اس کا خون کھولتا ہے، اس جبر کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

'' میرے ---کپڑے دو-----حرا---''وہ غصے سے بھناتا ہوا کھڑا ہو کر ناظمہ سے مخاطب ہوا اور وہ تھر تھراتی ہوئی باپ کے پیچھے چلنے لگی۔

ساحرہ نے دیکھا طاقچے کے اکھڑے ہوئے

ہوئے حصے کی اینٹ بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی ،اس کے زرا سا ہلانے سے اس کے ہاتھ میں آ گئی تو اس نے اینٹ پر اپنے دونوں ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی ۔باپ باورچی خانے سے گزرنے والا تھا'' (ابابیلیں لوٹ آئیں گی:ص:۴۷)

طاقچے کی اینٹ کا ساحرہ کے ہاتھ میں آ جانا اور اس پر اس کے ہاتھوں کی گرفت کا مضبوط ہو جانا اس بات کی علامت بن جاتا ہے کہ انہیں اپنے مسائل کا حل مل گیا ہے اور یہ بھی کہ عورت کو اپنے مسائل کا حل خود ڈھونڈنا ہوگا، اسے خود ابابیل بن جانا ہوگا ورنہ وہ اپنے دشمنوں سے پسپا ہوتی رہے گی۔

اس طرح اس افسانے میں جہاں ایک طرف بے بسی ہے ناظمہ کی شکل میں تو وہیں عورت کی طاقت اور قوت ساحرہ کے کردار میں نظر آتی ہے جو عورت کے بدلتے روپ کی غماز بھی ہے۔

''بابل'' بے میل شادی اور لڑکیوں کے ان کہے دکھوں کو بیان کرتا درد بھرا افسانہ ہے جس کا اختتام دھیرے سے قاری کے من میں سوال پیدا کرتا ہے کہ ایسی شادیاں لڑکیوں کے خوابوں کو توڑ دیتی ہوں گی ،وہ کیسے اس طرح کے رشتوں کو نبھاتی ہوں گی ؟انجان رشتوں کی ڈور کیسے ایک دوسرے کے ساتھ بندھتی ہے ،کیسی مضبوط ہوتی ہے اسے بیان کرتے ہوئے دو افسانے اماں اور پھول ہیں ۔ان افسانوں کے موضوعات تو الگ ہیں لیکن پھر بھی ایک مماثلت ہے وہ ہے ہمدردی اور ممتا کے جذبے کی ۔افسانہ 'اماں' آج کے بدلتے معاشرے میں بزرگوں کے لیے احترام و محبت کے مفقود ہوتے جذبے کی کہانی ہے کہ کس طرح آج بزرگوں کو خاندان میں غیر اہم کردار کے طور پر رکھا جاتا ہے ۔ان کا گھر میں ہونا یا نہ ہونا گھر کے افراد کے لیے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔اماں جن کا ایک بھرا پرا خاندان ہے لیکن وہ تنہا ہیں ۔کسی کو ان کے کہیں چلے جانے اور دیر رات تک گھر لوٹ کر نہ آنے پر بھی کوئی تشویش نہیں ہوتی ۔ادسانہ نگار افسانے کے آخر میں ان کے درد کو یوں

ترنم ریاض کا تعلق سرزمین کشمیر سے ہے کشمیر کا ذکر آتے ہی فردوس بریں روئے زمیں است کا تصور ذہن میں آتا ہے لیکن دوسرے ہی پل اس وادی کے چناروں سے اٹھتے شعلے دل کو اداس کر دیتے ہیں۔

بیان کرتی ہیں:

'' اندر اماں چپ چاپ سوئی تھیں ۔نرم گرم قالین پر ۔باہر بارش تیزی سے برستی جا رہی تھی ۔اماں کو لینے کوئی بھی نہیں آیا تھا شاید اس لیے کہ اگر کسی کو آنا ہوتا تو وہ گھر سے نکلا ہی کیوں کرتیں؟''

(ابابیلیں لوٹ آئیں گی:ص: ۷۲)

اختتامیہ جملہ قاری کے سامنے پوری صورتحال واضح کر دیتا ہے۔

ترنم ریاض کا تعلق سرزمین کشمیر سے ہے کشمیر کا ذکر آتے ہی فردوس بریں روئے زمیں است کا تصور ذہن میں آتا ہے لیکن دوسرے ہی پل اس وادی کے چناروں سے اٹھتے شعلے دل کو اداس کر دیتے ہیں۔ایسے میں اس خطے سے تعلق رکھنے والی ادیبہ وہاں کے درد سے کیسے بے نیاز ہو سکتی ہے۔ترنم ریاض نے بھی اپنے افسانوں میں وہاں کی خوبصورتی کو اور وہاں کے لوگوں کی زندگی کی تلخ سچائیوں کو پوری حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔کشمیر کے جلتے سلگتے حالات کو موضوع بناتے وقت ان کا قلم وہاں کے تلخ اور ناقابل برداشت دلسوز واقعات کو بیان کرتے ہوئے سفاک سا ہو جاتا ہے جو کہ ایک فطری عمل ہے جس کا تقاضا وہاں کی سرزمین ہر فنکار سے کرتی ہے۔ترنم ریاض پوری ایمانداری کے ساتھ اس واجب قرض کو ادا کرتی ہیں۔'مٹی' افسانہ جس میں وہ وہاں کے سیاسی ،سماجی ماحول ہی کی عکاسی نہیں کرتیں بلکہ روح کو لرزا دینے واقعات و حالات بھی بڑی جرات کے ساتھ لکھ ڈالتی ہیں ۔کشمیر جہاں نامساعد حالات کے باوجود نوجوان ایک خواب جنوں لے کر چلتے ہیں لیکن حالات ان کے خوابوں کو چکنا چور کر دیتے ہیں اور انہیں لق و دق صحرا میں بھٹکنے میں مجبور کر دیتے ہیں ۔وہاں کے لوگ کس طرح کی اذیتناک زندگی جی رہے ہیں اس افسانے میں حقیقت نگاری عروج پر ہے اس لیے یہ افسانہ قاری کو کردار کے ساتھ درد کے صحرا میں لے جاتا ہے ۔مرکزی کردار ہلال احمد ایک ہونہار ذہین طالبعلم ہے جو کالج میں انجینیرنگ کی پڑھائی

کر رہا ہے، پورے خاندان کی امیدوں کا مرکز ہے۔ایک دن کالج سے لوٹنے کے کچھ دیر بعد ہی تلاشی کے لیے اعلان ہونے لگتا ہے تمام لوگ جس حالت میں ہوتے ہیں فوراً باہر نکل کر میدان میں جمع ہو جاتے ہیں ۔ وردی پوش ایک کے بعد ایک گھر میں گھس کر تلاشی کے نام پر لوٹ مار کرتے ہیں۔

''اندر گھروں کی تلاشی ہو رہی تھی ،تلاشیاں لینے والے ایک گھر کبھی دوسرے گھر میں آجا رہے تھے۔ایک وردی پوش جب ایک گھر سے نکل کر دوسرے گھر میں جانے والا تھا تو اس کی پتلون کی پچھلی جیب میں سونے کی چین جھانک رہی تھی وہ جلدی میں شاید اسے اچھی طرح ٹھونس نہیں پایا تھا۔

میری ۔۔۔۔میری ۔۔۔بچی کی ہے ۔۔۔اس کی شادی کے لیے ۔'' ہلال احمد کا ہمسایہ غلام حسن زور سے بولا اور بھاگ کر وردی پوش کے پاس پہنچ گیا۔لڑکی باپ کے پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی آئی اور کچھ دوری پر رک گئی۔

''خاموش بڈھے ۔۔۔دیش دروہی ۔'' طاقت نے بوڑھی ک،زور ٹانگوں پر تندرست لات مای بوڑھا لڑکھڑایا،گرا اور اس کا پاؤں پکڑ لیا۔

خدا کے لیے میری۔۔۔

'چھوڑ حرام خور ۔۔مفت کا کھا کھا کر طاقت آ گئی ہے ۔راشن پر سبسڈی ملتی ہے ہم کو ہی آنکھ دکھاتا ہے۔،،

مجمع میں سے ہلال احمد کا باپ اس ظلم کے خلاف بول پڑتا ہے نتیجتاً اسی وقت اس کی آواز ہمیشہ کے لیے بند کر دی جاتی ہے۔ظلم کی روح کو لرزا دینے والی یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔

'' کہتے ہیں کہ اس رات وردی والے آدھی رات کو پھر آئے تھے۔۔۔۔غلام حسن اس دن سے خون تھوکتا ہے اور اس کی بیٹی اس رات سے بول نہیں سکتی ،جب بھی نظر آتی ہے کسی کونے میں دبکی یا دیوار سے چپکی ہوئی ۔کسی کے بلانے پر ایسے چونکتی ہے جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔'' ص:۷۸)

یہ واقعات ہلال احمد کی زندگی بدل کر رکھ دیتے ہیں اور اسے ایک اندھیری دنیا کا واسی بنا دیتے ہیں ۔

''وہ ماں کی باہوں کا حلقہ توڑ کر نکل آیا کچھ قدم چل کر ٹھہر گیا۔دروازے کے قریب پہنچ کر کچھ لمحوں کے لیے پتھر کے بت کی طرح جامد و ساکت آنکھیں پھیلائے ماں کو دیکھتا رہا پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔جانے اسے کدھر جانا تھا۔'' (ابابیلیں لوٹ آئیں گی:ص: ۷۸)

وادی کے ایسے ہی سلگتے موضوع پر لکھا افسانہ' برف گرنے والی ہے' جس میں بھی نوجوان غربت سے تنگ آ کر اندھیری گلیوں کا راستہ

ان جملوں میں مصنفہ نے وادی کے کرب کو جس دلدوز انداز میں پیش کر دیا ہے وہ قاری کے دل کو تڑپا کر رکھ دیتا ہے ۔وہ نہ صرف وہاں کی غربت کو بتاتی ہیں بلکہ نوجوانوں کے لیے ان سخت ترین حالات میں کونسا راستہ ہے وہ بھی واضح کر دیتی ہیں۔

ہی منتخب کرتا ہے ۔یہ راستہ اختیار کرنا ان کی کیسی مجبوری ہے وہ ان چند جملوں سے واضح ہو جاتی ہے۔

''جب تک جان ہے تب تک بھوک لگے گی نا ماں ۔تمہیں لگی ہے نا ؟ مجھے بھی لگی ہے ۔میں جلدی آؤں گا ۔تم فکر مت کرنا ۔جب میں آؤں گا تو گھر کا سارا سامان لے کر آؤں گا ،اور مجھے آنے میں دیر ہوئی تو تم گھبرا مت جانا ۔اچھا بابا ۔۔خدا حافظ'' جاوید احمد نے تیزی سے باہر نکل کر کواڑ بند کر دیئے اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا بائیں جانب کی گلی میں مڑ گیا۔

''ارے بیٹا سنو تو ۔'' حاجرہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی مگر شدید دھند میں جاوید احمد کا ہیولہ تک دکھائی نہ دیا البتہ کہرے سے نم راستے پر پھٹے تلے والے جوتوں کے گھسیٹے جانے کی سماعت سے دور ہوتی ہوئی غیر متوازن چاپ سنائی دے رہی تھی ۔''(ابابیلیں لوٹ آئیں گی :ص: ۱۸۵)

ان جملوں میں مصنفہ نے وادی کے کرب کو جس دلدوز انداز میں پیش کر دیا ہے وہ قاری کے دل کو تڑپا کر رکھ دیتا ہے۔وہ نہ صرف وہاں کی غربت کو بتاتی ہیں بلکہ نوجوانوں کے لیے ان سخت ترین حالات میں کونسا راستہ بچا ہے وہ بھی واضح کر دیتی ہیں ۔ایک دھند ہے جس میں کچھ بھی صاف نہیں ہے، مستقبل کے نشان نہیں ۔ایک راستہ ہے جہاں سے غربت سفر کرتی ہے وہ ٹیڑھا میڑھا ہے جس پر قدم غیر متوازن ہیں۔

وادی کے نوجوانوں کی زندگیوں کا یوں برباد ہو

جانے پر ایسا لگتا ہے جیسے یہ دلفریب قدرتی مناظر ،وادئی جنت نشاں چنار کے یہ درخت سب بدل گئے ہیں۔وادی کی جنت کے معنی اب جنت کے نہیں رہے سکون و راحت نہیں ،چنار کے درخت اب شعلہ نشان بن چکے ہیں،نسلوں کو جلانے لگے ہیں برف پوش پہاڑوں نے وادی کو سیراب کرنے کے بجائے برف کے تودوں میں اپنے ہی لوگوں کو دفن کرنے کا کام شروع کر دیا ہے ۔ترنم ریاض کے یہ افسانے بھی مجموعے کے عنوان سے مطابقت رکھتے ہیں اور ابابیلوں کی آمد کے شدت سے منتظر نظر آتے ہیں۔

افسانہ 'کیا اچھی صورت بھی' معصوم بچوں کو اغوا کرا پاپج بنا کر بھیک منگوانے والے گروہ کا پردہ فاش کرتی ہے۔مظلوم راہل کی یہ کہانی بڑی دردانگیز ہے جس کے پیر میں زخم ہے اور زہر جسم میں پھیل گیا ہے اسے ایک سوشل ورکر کے ذریعے رہائی تو مل جاتی ہے لیکن ماں سے ملنے سے پہلے ہی اس کا دم بھی آخر ہو چکا ہوتا ہے۔

''شیرنی'' ایک ایسی لڑکی کا افسانہ ہے جو بہت بہادر ہے کسی جانور سے نہیں ڈرتی بلکہ بہادری سے ان پر وار کر کے ختم کر دیتی ہے، وہ اپنے مویشیوں کی حفاظت کے لیے راتوں میں درندوں کو تلاش کر مار دیتی ہے لیکن وہ ایک دن بہت بری طرح ڈر جاتی ہے وہ کس چیز سے ڈر گئی کا تجسس قاری کے ذہن میں افسانے کے ابتدائی جملوں سے پیدا ہوتا ہے جو افسانے کے اختتام پر ختم ہوتا ہے۔

''میں ڈر گئی ۔۔۔بی بی ۔۔۔۔جی ۔۔۔'' نجمہ نے گھبراتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔اس کا **چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا ۔سانس پھولا ہوا تھا اور خوف زدہ پھٹی آنکھوں ناک کچھ اس طرح سکڑی ہوئی تھی کہ ناک سے ملی ہوئی ایک لکیر سیدھی پیشانی کے درمیان تک جا رہی تھی ۔'' (افسانہ کی ابتدا ص:۱۸۶)**

ادھر اوپر ایک پاؤں ادھر کو لٹکائے ایک مونچھ والا لڑکا بیٹھا تھا جی ۔۔۔میرے کمرے کے دروازے کے بالکل قریب ۔۔۔دیوار پر چڑھا ہوا۔۔۔۔۔میں ڈر گئی ۔۔۔(افسانہ کا اختتام ص:۱۹۱)

> ترنم ریاض کے ذہن و دل کو ارد گرد اور دور و پاس رونما ہونے والے مسائل و واقعات جھنجھورتے ہیں وہ نہ صرف انہیں دیکھتی سنتی اور مشاہدہ کرتی ہیں بلکہ ان میں ڈوب جاتی ہیں ۔کرداروں میں اتر جاتی ہیں۔

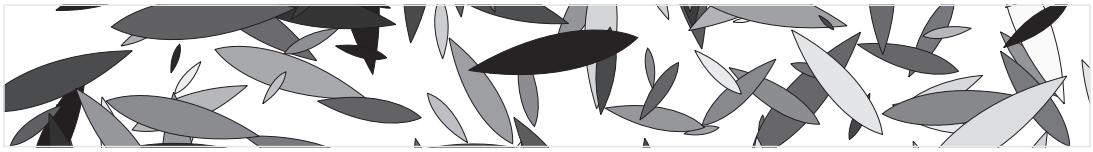
یہ افسانہ قاری کو سوال بنا دیتا ہے جس کا جواب آخری سطروں میں ملتا تو ہے لیکن سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ اس دور میں درندوں سے نہ ڈرنے والی لڑکی انسان سے ڈر گئی یعنی انسان درندوں سے بھی بڑا درندہ۔

' شہر' افسانہ ان کا نمائندہ افسانہ ہے جس میں شہری زندگی کی چکا چوند کے پردے میں چھپی تنہائی کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے ۔خاص طور سے فلیٹ کلچر میں لوگ کس طرح ایک دوسرے سے لاتعلق رہتے ہیں چاہے ان کے درمیان صرف ایک اینٹ کی دیوار ہو لیکن وہ سیمنٹ ریت اور اینٹ سے بنی ہونے کے باوجود آہنی دیوار ثابت ہوتی ہے جس میں کسی قسم کے روزن کی گنجائش نہیں ہوتی ۔اس کے پار دیکھنا کسی کو گوارا نہیں ہوتا ایسے میں ایک عورت کا اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ وہاں رہنا اور پھر مر جانا ،بچوں کا دروازے کی چٹخنی تک ہاتھ بھی نہ پہنچ پانا ، بڑے ہی دلدوز انداز میں لکھا گیا افسانہ ہے جو گاؤں کے خلوص اور شہر کی بے مہر زندگی کو ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

ترنم ریاض کے کے اس مجموعے میں شامل دیگر افسانے ،ایجاد کی ماں، پھول، متاع گم گشتہ ،آبلوں پر حنا، برآمدہ وغیرہ ان کی بہترین پلاٹ سازی، جذبات نگاری بطور خاص جزئیات نگاری کی وجہ سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

ترنم ریاض کے ذہن و دل کو ارد گرد اور دور و پاس رونما ہونے والے مسائل و واقعات جھنجھورتے ہیں وہ نہ صرف انہیں دیکھتی سنتی اور مشاہدہ کرتی ہیں بلکہ ان میں ڈوب جاتی ہیں۔کرداروں میں اتر جاتی ہیں۔ وہ دریائے جہلم کے کنارے سے ہی اس کی گہرائی ناپ لینے کی قائل نہیں بلکہ اس گہرائی میں اتر کر کردار کے الم کو محسوس کرتی ہیں پھر الفاظ کا پیرہن عطا کر اسے کائناتی غم بنا دیتی ہیں ۔واقعات کو آفاقیت عطا کرنا ان کا ہنر خاص ہے اور یہی ہنر انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔

☆☆☆☆



ڈاکٹر صالحہ صدیقی
محلّہ نوادا، الٰہ آباد
Mob: 9899972265

شوکت حیات اردو کا درۂ نایاب فکشن نگار

کرونا کا سیکنڈ ویو ہندوستان کے لیے بہت غمناک رہا خصوصا اردو ادب کی مایہ ناز شخصیتیں ہم سے جدا ہو گئیں۔ ان میں ایک نام شوکت حیات صاحب کا بھی شامل ہے پاٹلی پتر میں ان کی رہاش گاہ پر ان کا انتقال ہوا۔ اپنے افسانوں کے ذریعہ لوگوں کے دلوں میں چھاپ چھوڑنے والے شوکت حیات دسمبر 1950ء میں پیدا ہوئے۔ شوکت حیات 70ء کی دہائی میں افسانہ نگاری کے میدان میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں سماج کی تلخ حقیقتیں اور سچائیاں ہوتی ہیں۔ انہوں اپنے افسانے کے ذریعہ سماج کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'گنبد کے کبوتر' شہرہ آفاق حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے بھی نوازا تھا اور ساتھ ہی ان کو قومی کتھا ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ان کے انتقال پر بہار نے ایک بہترین اور سماج کو آئینہ دکھانے والے افسانہ نگار کو کھو دیا ہے۔ مشہور افسانہ نگار اور بہار اردو اکیڈمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری نے شوکت حیات کے انتقال پر رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''اردو فکشن کی شوکت، شوکت حیات سن ستر سے افسانہ نگاروں کی امامت کرنے والا 'گنبد کے کبوتر' کا خالق اور انامیت کا اسیر، فکشن کی آبرو کہلانے والا فکشن کا جادوگر ہمارے درمیان سے خاموشی سے چلا گیا۔ وہ ایک عرصے سے بیمار تھے، محفلوں سے دور ہوتے جا رہے تھے اور لکھنا پڑھنا بھی بند تھا۔ اپنے آپ میں گم رہنے لگے تھے لیکن اس کے قہقہے میں اب بھی جان تھی۔ کسے معلوم تھا کہ قہقہہ بکھیرنے والا اپنے دوستوں کو سسکیوں کے حوالے کر جائے گا۔''

معروف نقاد اور صاحب طرز ادیب حقانی القاسمی نے بھی شوکت حیات کے انتقال کو فکشن کا ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ شوکت حیات کے انتقال پر اظہار تعزیت کرنے والوں میں شموئل احمد، ڈاکٹر اسلم جاوداں، ڈاکٹر انوار الہدیٰ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اپنی ابتدائی زندگی، بچپن کی زندگی عہد و ماحول اور والدین کی تربیت کو یاد کرتے ہوئے اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

''میری پیدائش یکم دسمبر ۱۹۵۰ء کو صدر گلی، پٹنہ سٹی میں ہوئی۔ میں نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں، اُس گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ میرے دادا مناظر احسن گیلانی پڑھے لکھے اور قابل آدمی تھے۔ اُن کی علمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان کے Constitution بناتے ہوئے اُن کو بھی مدعو کیا تھا۔ دادا کے علاوہ والد صاحب کو بھی کتابیں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ اُن کی ایک ذاتی لائبریری بھی تھی جس میں کتابوں کی بھرمار تھی۔ والد صاحب اپنے ساتھ بچوں کے ذوق کا بھی خیال رکھتے اور اُن کے لیے کہانیوں کی کتابیں اور ماہ نامے پابندی سے منگواتے۔ نیرنگِ خیال، عالم گیر، کھلونا، شمع، بیس ویں صدی، ماہِ نو اور آج کل وغیرہ وہ رسائل ہیں جو والد صاحب کی لائبریری کی زینت تھیں۔ والد صاحب کی اُس منی لائبریری سے مجھے بھی مستفید ہونے کا موقع ملا۔ پڑھائی کی جانب اور بہ طورِ خاص اردو ادب سے رغبت پیدا ہوئی اور لکھنے کی طرف میرا رجحان یوں ہوا کہ پٹنہ سے دلی کے سفر کے دوران والد صاحب نے ایک ڈائری دی اور پورے سفر کی روداد لکھنے کو کہا جسے لکھنے کے بعد میرے اندر

کہانیاں لکھنے کا شوق جاگا، سو مَیں نے افسانہ نگاری کی ابتدا کر دی۔ ایک خاص بات اور یہ ہے کہ جب والد صاحب کا تبادلہ دوسرے شہر میں ہوا تو ایک پریشانی یہ آن پڑی کہ لائبریری کو کس طرح منتقل کیا جائے۔ آخر یہ طے ہوا کہ والدہ کے نام ایک لائبریری قایم کی جائے لہٰذا والد صاحب نے ''قمر النسا لائبریری'' کے نام سے ایک کتب خانہ قایم کیا اور تمام کتابیں وہیں منتقل کر دیں تا کہ اردو ادب کا فروغ ہو سکے اور نوجوان، بچے اور عورتیں اُن کتابوں سے مستفید ہو سکیں۔

اسی طرح اپنے تخلیقی سفر پر شوکت حیات 2010 میں دیئے گئے اپنے انٹرویوں میں کہا تھا 'حیات۔۔۔ میرے والد ''سید محفوظ الحق'' کا انتقال میرے بچپن میں ہی ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے ایک خلا کا احساس ہوتا تھا اور ایک عجیب سی اداسی میرے ارد گرد چھائی رہتی تھی۔ دِن میں تو اِس طرح کی بے چینی کم ہوتی لیکن جوں ہی آفتاب غروب ہونے کو ہوتا مَیں ڈپریشن کا شکار ہونے لگتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ میری زندگی کا تانا بانا بس یوں ہی چلتا رہے گا۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر میں نے آپ بیتی لکھنا شروع کیا جس سے افسانہ نگاری کی جانب راغب ہو۔ میں نے ابتدا میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں لیکن کچھ بزرگ افسانہ نگاروں نے یہ مشورہ دیا کہ ''تمہارے اندر وہ خوبی موجود ہے جو ایک افسانہ نگار میں ہوتی ہے''۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ ''تمہاری کہانیاں انا بچوں کے معیار سے بالاتر ہیں''۔ اُن بزرگ ادیبوں میں ظفر اوگانوی، سلطان اختر، ظہیر صدیقی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔۔۔۔۔ جیسا کہ میں نے کہا ڈائری لکھنے سے میرے اندر حرکت پیدا ہوئی اور مجھے طمانیت کا احساس ہونے لگا۔ پھر میں نے سوچا کہ اگر انہی اوراق میں کچھ ترمیم کی گئی تو اس کی شکل افسانے کی سی ہو جائے گی، سو میں محنت و لگن سے افسانے لکھنے لگا۔ میرا پہلا افسانہ ''بکسوں سے دبا آدمی''، ''کتاب'' (لکھنؤ) سے ۱۹۷۰ء میں شایع ہوا تو اگلے تین شمارے تک اس کی تعریف ہوتی رہی۔ کسی معیاری رسالے میں پہلی کہانی کا چھپنا میرے لیے مسرت کی بات تھی۔ شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، وہاب اشرفی، فضیل جعفری، مہدی جعفر اور نظام صدیقی وغیرہ نے مفید مشوروں سے نوازا۔''

شوکت حیات کو افسانے سے شغف کا اندازہ ان کے انٹرویوں کے اس حصے سے تفصیلی طور پر ہو جاتا ہے۔ ان کو مطالعہ کا بہت شوق تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ دنیا بھر کے افسانہ نگاروں کا مطالعہ کرتے تھے اور ان سے متاثر بھی تھے۔ عالمی ادب میں کافکا، کامیو، چیخوف، موپاساں، ٹالسٹائی، دوستو فسکی اور خلیل جبران وغیرہ ایسے فن کار ہیں جن کی کہانیاں انھوں نے پڑھیں اس کے علاوہ کچھ کے تراجم سے بھی استفادہ کیا تھا۔ جس کے سبب انھیں عالمی ادب کے رجحانات سے واقفیت ہوئی اور اس کا اثر ان کے تخلیقی وجدان پر بھی پڑا۔ ان کے افسانوں کی تکنیک پر بھی اس کا اثر صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ اردو ادب میں منٹو اور بلراج سے وہ بہت متاثّر تھے۔ ان تمام فکشن نگاروں سے متاثر ہونے کے باجود ان کا اپنا رنگ تھا۔ ان کا ماننا بھی تھا کہ انسان کی اپنی شناخت خود سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اِن فن کاروں سے لکھنے کی ترغیب تو لیتے تھے لیکن ان سے مرعوب کبھی نہیں ہوئے۔

ستّر کی دہائی میں جن افسانہ نگاروں نے اپنی شناخت قائم کی اور افسانے میں بیش بہا اضافے کیے اُن میں شوکت حیات کا نام نمایاں ہے۔ آپ نے کئی لا زوال افسانے تخلیق کیے جن میں بکسوں سے دبا آدمی، گھونسلا، گنبد کے کبوتر، سرخ اپارٹمنٹ، رانی باغ، پاؤں، ڈھلان پر رُکے ہوے قدم، چیخیں وغیرہ کے نام خصوصی طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ آپ نے ہم عصر افسانہ نگاروں کے حوالے سے کئی اچھے مضامین بھی تحریر کیے۔ مثلاً سَن ستری اور نامیاتی افسانے: انحراف و تسلسل، نامیاتیت اور نامیاتی افسانے، امکانیت پسندی وغیرہ اسی ضمن کے مضامین ہیں۔ ان مضامین میں انہوں نے ہم عصر افسانہ نگاروں کے حوالے سے اس بات پر اصرار کیا کہ:

''میں اور میرے ہم عصر افسانہ نگار

میت پسند ہیں اور وہی افسانہ عصری و آفاقی ہے جو عصریت و آفاقیت کے امتزاج، انجذاب اور وفاق سے سرشار ہو کر افسانے کی توانائی میں افسانے کا سبب بنتے ہیں''۔

شوکت حیات کا فکشن متنوع موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ بے خوف فکشن نگار تھے۔ وہ بابانگ دہل اپنی بات افسانوں میں کہنا جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو تنقید کا بھی نشانہ بنایا گیا۔ ان کی ایسی کہانیاں بھی ہیں جن میں ترقی پسندی کے ساتھ ساتھ تقسیم کا موضوع بھی اپنے عروج پر ہے۔ یہ کہانیاں تقسیم کے بطن سے جنمی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شوکت حیات نے جب سے ہوش سنبھالا تب سے وہ ہر بوڑھے بزرگ سے غلامی، آزادی اور تقسیم کی داستان سن رہے تھے۔ حساس طبیعت ہونے کی وجہ سے غلامی کا تصور بھی ان کے لئے اذیت ناک تھا، اور آزادی کے بعد سے ہونے والے دنگے اور فسادات نے ان کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور ان کا یہی احساس اور درد ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ ایسی ہی کہانیوں کا ذکر کرتے ہوئے شوکت حیات صاحب کہتے ہیں:

''1975ء میں ایک کہانی ''بانگ'' کے عنوان سے لکھی تھی جو ایمرجنسی اور فاشزم کے خلاف احتجاجی کہانی تھی۔ چوں کہ میری کہانیاں ''شب خون'' میں چھپتی تھیں لیکن جب میں نے یہ کہانی فاروقی صاحب کو بھیجی تو انہوں نے مصلحت کی بنا پر کہانی معذرت کے ساتھ واپس کر دی۔ اس کے بعد یہ کہانی ''تناظر'' دہلی میں شائع ہوئی۔ کہانی شائع ہونے کے بعد مخالفت کی بھی شروعات ہوئی۔ اسی مخالفت نے شہرت کی بھی کھڑکی وا کر دی۔ اس کہانی کو کافی پسند کیا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس میں کہانی پن بھرپور موجود تھی جو کہ ستر کی دہائی میں تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اس کہانی کے متعلق مہدی جعفر نے اس بات کا اظہار کیا کہ ''بانگ'' کہانی پن کی واپسی کا پیش خیمہ ہے۔''

شوکت حیات کا افسانہ ''بھائی'' فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں لکھا گیا ایک اہم افسانہ ہے۔ اس میں انھوں نے انسانی نفسیات کی خوب صورت عکاسی کی ہے۔ جب ماحول بگڑتا ہے تو کس طرح ایک فرقے کا دوسرے پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے، لوگ ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں کہ فریق مخالف کا ہر عمل اور ہر حرکت خوفزدہ کرتی رہتی ہے کہ وہ اس پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ تذبذب کی اس فضا میں ہر منزل، گرد و پیش کا ہر منظر، غرض کہ زمین اور آسمان نادیدہ اور نامعلوم خطروں سے بھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ خوف و ہراس کا عالم چہار سو چھا جاتا ہے، ایسے ہی ماحول کی عکاسی ان کے افسانے کے اس اقتباس سے لگائی جا سکتی ہیں:

''اس تندرست آدمی سے محتاط رہنا ضروری ہے..... اس نے سوچا اسے بے حد افسوس ہوا کہ آج اس کی جیب میں وہ کی رِنگ بھی نہیں تھی جس میں پھل کاٹنے والا ایک ننھا سا چاقو ہوتا تھا۔ اس کے حملہ آور ہونے کی صورت میں کچھ تو اپنا بچاؤ کر سکتا تھا۔ لیکن وہ تو نہتا تھا۔ اس تنومند آدمی کی جیب میں نہ جانے کون سا ہتھیار ہوگا۔ نہ بھی ہوا تو کیا اس کا مضبوط جسم ہی اسے زیر کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اس نے غور کیا کہ تنومند آدمی مستقل اپنا ہاتھ جیب میں ڈالے ہوئے تھا'' (بھائی)

شوکت حیات اپنے انداز کے سب سے توانا اور منفرد فکشن رائٹر تھے۔ وہ روایتی انداز میں بنی گئی کہانیوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ایک طرف جہاں وہ اپنے افسانوں میں علامتوں کا استعمال کرتے ہیں وہی دوسری طرف اس میں خوبصورت بیانیہ اور فنٹسی کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ ایک طرف جہاں ان کے افسانوں میں سماجی اور سیاسی شعور کی جھلک دکھائی دیتی ہے وہی ان میں تاریخ کی گونج کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ جو دھیرے دھیرے ان کے ناولوں میں اپنی جگہ متعین کرتی ہیں۔ یہی وہ اندازِ بیان ہے جو برصغیر میں بہت کم افسانہ نگاروں یا ناول نگاروں کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے اور یہی اندازِ بیان اور مخصوص اسلوب شوکت صاحب کو دوسروں سے منفرد بناتا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ نئی

چیزوں کو اپنایا حتیٰ کہ شوکت صاحب اپنی کہانیوں کے اسلوب اور تکنیک بھی بدلتے رہتے تھے۔جس کو عوام بھی خوب پسند کرتی تھی۔ان کی ہر کہانی قاری کو بے چین کرتی ہے اور ذہن میں کئی سوالات کو اُٹھاتی ہے۔نئی نسلوں میں در آئی تبدیلیاں جو اضطرابی کیفیات پیدا کرتی ہے وہ ہمیں اپنی با وقار تاریخ،تبدیلی اور روایت کی طرف پھر سے غور وفکر کرنے پر مجبور کرتی ہے۔آج کا ادب عصری زندگی کے شعور سے پیدا ہوتا ہے اور شوکت حیات زندگی کو فکشن میں لکھنے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔وہ اپنے افسانوی انداز پر کہتے تھے:

''میں نے ترقی پسندی اور جدیدیت کی ملی جلی تھیوری کو اختیار کیا۔کسی ایک تھیوری کے افسانے نہیں لکھے۔ایک فن کار کو ان تمام چیزوں سے ماورا ہو کر لکھنا چاہیے۔سو میں نے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر نئے انداز کی کہانیاں لکھیں تو تھیوری کی سطح پر اس بات کا اعلان کیا کہ مَیں اور میری نسل جینیس افسانہ نگار نہ تو ترقی پسند ہیں اور نہ جدید۔وہ مابعد اور ہیئت وفکر کی سطح پر اِن دونوں سے الگ ہیں۔لہذا اُن کی الگ شناخت ہونی چاہیے۔اس شناخت کو میں نے ''انام نسل'' اور ''انامیت'' کا نام دیا۔ناقدوں اور دیگر حضرات سے مضمون لکھ کر گزارش کی کہ ہمیں ترقی پسند یا جدید افسانہ نگار کی حیثیت سے برانڈ نہ کریں بل کہ ہمیں نئی نسل کا فرد سمجھتے ہوئے نئی شناخت کو تسلیم کریں۔''

حقیقت نگاری شوکت حیات کا خاص وصف رہا ہے۔وہ بنا کسی خوف کے اپنی بات رکھنا جانتے تھے۔شوکت حیات موجودہ عہد کے ایک جنوین اور سچے فنکار بھی تھے جو کسی تمنا اور صلے کی پروا کئے بغیر صرف اپنے فکر وفن سے مطلب رکھتے تھے۔انہوں نے مختلف تحریکوں اور رجحانوں کو دیکھا اور ان پر اپنی رائے بھی قائم کی مگر کبھی کسی تحریک ور جحان کے زیر اثر نہیں رہے اس لئے ان کی افسانہ نگاری کو کسی دبستانی فکر وسیاست سے وابستہ کرنا نا انصافی ہوگی۔ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نام نہاد اصولوں نے ان کے فن پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ وہ ہر محفل میں آزادی سے اپنی بات کہتے ہیں اور ہر افسانے میں اپنا فنی اصول قائم رکھتے ہیں۔آج ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے یا جو کچھ آگے ہونے کے آثار نظر آ رہے ہیں شوکت صاحب نے انھیں اچھی طرح پہچان لیا تھا۔یہی وجہ بھی تھی کی ان کے ہر افسانہ، اور کہانیوں میں درد اور کڑوی سچائی نظر آتی ہے۔ان کی تحریروں کی انھیں خوبیوں کے سبب ان کے لکھنے کے انداز سے ان کے قارئین اور چاہنے والوں کا ایک بڑا حلقہ بن گیا ہے جو ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے ہیں۔

شوکت صاحب نے اپنے گرد وپیش کی محرومیوں ،ناکامیوں ظلم و زیادتیوں ،نا انصافیوں کو ہر پل محسوس کیا۔انھوں نے جس دور اور جس سماج میں آنکھ کھولی، وہاں دنگے، فساد اور نسلی امتیاز سے قدم قدم پر سامنا ہوتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ایک گہرا دکھ اور المیہ سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔ کہیں کہیں تو شوکت صاحب کا قلم قاتل کی سمت اشارہ ہی نہیں کرتا اس کی مکمل نشاندہی بھی کر دیتا ہے۔وہ پوری تاریخ کو اشاروں میں بیان کر دیتے ہیں جہاں سوچتا ذہن با آسانی رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

بہر حال ان کی فکشن کی دنیا کے بے شمار قصے فکر وفن کی بے شمار باتیں ہیں کس کا ذکر کریں کس کا نہیں سمجھ نہیں آتا،ان کا ایک مختصر مضمون میں تمام باتوں کا احاطہ کرنا بھی ناممکن ہے۔القصہ مختصر یہ کہ ان کا جانا یقیناً اردو فکشن کے لئے بہت بڑا نقصان ہے۔وہ بہت سارے موضوعات پر لکھ رہے تھے۔لیکن ان کو اردو والوں سے ایک شکایت تا عمر رہی کہ ان کی حوصلہ افزائی ،عزت افزائی اس طرح نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے ،ان کی اچانک موت نے ان کی قلم پر پاور بریک لگا دیا۔لیکن جو کچھ وہ لکھ گئے اردو کی خدمات کر گئے وہ اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا ۔یقیناً اردو فکشن کی تاریخ ان کے نام کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

☆☆☆☆

ممتاز عالم رضوی
دریا گنج، نئی دہلی
Mob: 9899775906

مشرف عالم ذوقی کی ناول مردہ خانہ میں عورت

فلسفہ موت وحیات کی داستان

بحران میں بڑے اور بنیادی کام ہو جاتے ہیں اس کا مشاہدہ اس وقت ہوا جب کورونا جیسی وبا کے سبب ہندوستان میں بھی مکمل طور پر لاک ڈاؤن کیا گیا۔ ۲۵/ مارچ ۲۰۲۰ کو جب لاک ڈاؤن کیا گیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے زندگی تھم گئی۔ قومی شاہراہیں ہوں یا محلات کی گلیاں سب سونی پڑ گئی تھیں۔ پٹریوں پر ٹرینیں نہیں، آسمان میں طیارے نہیں، سڑکوں پر گاڑیاں نہیں، گلیوں میں رکشا نہیں۔ دکانوں اور بازاروں پر انسان نہیں۔ گو کہ ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا ایک مردہ خانہ میں تبدیل ہوگئی تھی۔ جب چین سے لاک ڈاؤن کی پہلی تصویر ہندوستان پہنچی تھی تو ہم سب حیران تھے۔ یقین نہیں ہو رہا تھا کہ کیا کبھی ایسا ہندوستان میں بھی ہوگا؟ ہر چیز لایعنی معلوم ہو رہی تھی۔ غیر حقیقی، یقین نہ آنے والی بات لیکن جب ۲۲/ مارچ ۲۰۲۰ کو جنتا کرفیو لگایا گیا تو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے اور اس کے بعد جب ۲۵/ مارچ ۲۰۲۰ کو مکمل طور پر لاک ڈاؤن کیا گیا تو اب چین کی تصویریں حقیقی معلوم ہو رہی تھیں۔ ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ میں یہاں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا لیکن یہ ذکر ضرور کرتا چلوں کہ سی اے اے کی پوری تحریک، شمال مشرقی دہلی میں ہوئے فرقہ وارانہ فسادات اور اس کے بعد لاک ڈاؤن پر قریب ۱۲۰۰/ صفحات پر ایک دستاویزی کتاب قلم بند کی ہے جو جلد منظر عام پر آئے گی۔ مقصد یہ ہے کہ جب دنیا یہ سمجھ رہی تھی کہ زندگی ٹھہر گئی ہے، زندگی ساکت و جامد ہوگئی ہے تو ہماری غلط فہمی تھی کیونکہ زندگی ٹھہر نہیں سکتی، زندگی رک نہیں سکتی چنانچہ زندگی نے ایک نیا راستہ تلاش کر لیا تھا۔

لاک ڈاؤن کے دوران ادیبوں، دانشوروں، قلمکاروں کی زندگی میں بھی ایک انقلاب سا برپا ہوگیا۔ میں ان لوگوں کی بات نہیں کر رہا ہوں کہ جن کے یہاں زندگی نہیں تھی یعنی میں مردوں کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں ان کی بات کر رہا ہوں کہ جو زندہ تھے اور زندگی کو ایک لمحہ کے لیے بھی رکنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ نتیجہ میں جہاں ایک طرف کتابیں خوب پڑھی گئیں وہیں دوسری طرف کتابیں خوب لکھی بھی گئیں۔ کئی اہم کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور ابھی نہ جانے کتنی کتابیں منظر عام پر آئیں گی جو ہمیں جھنجھوڑیں گی نیز مستقبل کی سمت و رفتار طے کرنے میں ہماری معاونت کریں گی۔ ایسا راقم الحروف کا یقین ہے۔ استاد محترم اور معروف افسانہ نگار پروفیسر ابن کنول نے درجنوں خاکے اور انشائیے قلم بند کیے۔ خاکوں کا مجموعہ منظر عام پر آچکا ہے اور جلد ہی انشائیے کا مجموعہ بھی منظر عام پر آنے والا ہے۔ اسی طرح معروف ترقی پسند ادیب و ناقد استاد محترم پروفیسر علی احمد فاطمی کی دو اہم کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ ایک کا تعلق پروفیسر سید محمد عقیل اور دوسرے کا تعلق پروفیسر قمر رئیس کی تنقیدی خدمات سے ہے۔ ممتاز ترقی پسند ناقد پروفیسر سید احتشام حسین پر ڈاکٹر فخر الکریم کی کتاب منظر عام پر آئی۔۔۔۔ ایک طویل فہرست ہے۔

اس لاک ڈاؤن کے دوران راقم الحروف نے بھی کچھ اہم کتابوں کا مطالعہ کیا اور دو ناول قلم بند کیے۔ ان میں ایک تعاقب منظر عام پر آچکا ہے جبکہ لکیر در لکیر زیر طبع ہے۔ لاک ڈاؤن کے بعد تیسرا ناول ''ٹرین کی ایک رات'' بھی مکمل ہو چکا ہے اور چوتھا ناول ''خدائے گنج'' زیر قلم ہے۔ لاک

ڈاؤن کے دوران راقم نے پہلا ناول ''مرغ انبوہ'' کا مطالعہ کیا۔ممتاز فکشن نگار مشرف عالم ذوقی کا یہ یہ ناول لاک ڈاؤن سے پہلے قلم بند کیا گیا تھا۔ راقم نے اس کا مطالعہ بھی لاک ڈاؤن سے پہلے شروع کر دیا تھا لیکن مکمل یہ لاک ڈاؤن کے دوران ہوا کیونکہ ناول ۴۵۰؍ صفحافت پر مشتمل ہے۔اس میں راقم نے ۴۴؍ صفحات پر مشتمل ایک مقالہ بھی قلم بند کیا جو کئی ادبی رسالوں میں شائع بھی ہو چکا ہے۔اس دوران مشرف عالم ذوقی کا دوسرا ناول ''مردہ خانہ میں عورت'' بھی منظر عام پر آ گیا جو کہ لاک ڈاؤن کے دوران ہی قلم بند کیا گیا جس کا اشارتاً ذکر بھی کیا گیا ہے ۔ اس ناول کے مطالعہ سے قبل راقم نے معروف فکشن نگار محسن خاں کا ناول ''اللہ میاں کا کارخانہ'' پڑھا۔اس پر بھی راقم نے ایک ۸؍صفحات پر مشتمل مضمون قلم بند کیا ہے ۔ یہ مضمون بھی جلد کچھ ادبی رسالوں میں شائع ہو کر منظر عام پر آ جائے گا۔ اب ناول پر تیسرا مضمون آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

'مردہ خانہ میں عورت' مشرف عالم ذوقی کے ناول ''مرگ انبوہ'' کی دوسری قسط ہے ۔ اس کی تیسری قسط ''صحرائے لایعنی '' اور چوتھی و آخری قسط ''ہائیوے پر کھڑا آدمی'' ہے حالانکہ یہ بالکل بھی ضروری نہیں ہے کہ اس ناول کو سمجھنے کے لیے پہلا ناول پڑھا جائے لیکن اگر کوئی ملک کی موجودہ سیاست کو سمجھنا چاہتا ہے ۔ وہ یہ سمجھنا چاہتا ہے کہ ملک کی موجودہ سیاسی سمت و رفتار کیا ہے؟ ملک کس طرف جا رہا ہے اور مستقبل میں کس قسم کے چیلنجز پیدا ہونے والے ہیں تو یقیناً وہ مرگ انبوہ کا بھی مطالعہ کرے گا۔ان دو ناولوں سے قبل ذوقی کے تقریباً سبھی ناولوں کا مطالعہ کر چکا ہوں اور وہ کتاب بھی جلد منظر عام پر آنے والی ہے۔راقم کا خیال ہے کہ ذوقی کے زیادہ تر ناول کہیں نہ کہیں ملک کے عصری مسائل کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں ،وہ مسائل کا پیچھے کرتے ہیں اور آخری حد تک جاتے ہیں۔اگر

> 'مردہ خانہ میں عورت' مشرف عالم ذوقی کے ناول ''مرگ انبوہ'' کی دوسری قسط ہے ۔اس کی تیسری قسط ''صحرائے لایعنی '' اور چوتھی و آخری قسط ''ہائیوے پر کھڑا آدمی '' ہے حالانکہ یہ بالکل بھی ضروری نہیں ہے کہ اس ناول کو سمجھنے کے لیے پہلا ناول پڑھا جائے لیکن اگر کوئی ملک کی موجودہ سیاست کو سمجھنا چاہتا ہے۔ وہ یہ سمجھنا چاہتا ہے کہ ملک کی موجودہ سیاسی سمت و رفتار کیا ہے؟

ایک جملے میں یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ذوقی کے سارے ناول کسی نہ کسی صورت ایک دوسرے کی کڑی معلوم ہوتے ہیں۔

راقم یہاں پوری ایمانداری سے یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ 'مردہ خانہ میں عورت' قطعی طور پر عام قاری کے لیے نہیں ہے اور یہ ناول ان کے لیے بھی نہیں ہے کہ جو ملک کے موجودہ نظام سے اس طرح چشم پوشی کر رہے ہیں کہ جیسے شتر مرغ ریت میں اپنا سر چھپا لیتا ہے اور سمجھتا کہ اس کو کوئی نہیں دیکھ رہا ہے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس ناول میں کوئی ایسا قصہ نہیں ہے کہ ایک تھا راجا اور ایک تھی رانی، دونوں مر گئے ختم کہانی بلکہ قصہ کی شکل میں موجودہ عہد کی عنوان حقیقتوں کو برہنہ کیا گیا ہے کہ جن کے سلسلہ میں ہم سب جانتے تو ہیں لیکن جانتے ہوئے بھی انجان بنتے ہیں۔جس طرح یہ جانتے ہیں کہ موت برحق ہے لیکن زندگی میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ موت یاد نہیں رہ جاتی ۔انسان کو پل کی خبر نہیں ہے لیکن سامان سفر صدیوں کا ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار ''سپرا'' ہے جو راوی کے ساتھ ساتھ اپنے مضبوط قدم آگے بڑھاتا ہے۔سپرا حال کے ساتھ ماضی اور مستقبل پر اپنی نظریں مرکوز کیے ہوئے ہے۔اس کے لیے جس قدر ماضی اہم ہے اس سے کہیں زیادہ مستقبل عزیز ہے۔مردہ خانہ اس کا حال ہے، پرانی عمارت اس کا ماضی ہے اور مردہ خانہ میں روشنی کی آمد اس کا روشن مستقبل ہے۔سپرا جو خود کو مردہ تصور کرتا ہے اور اس کو اپنے جیسے نہ جانے کتنے لوگ مردہ نظر آتے ہیں لیکن جب ۵۴۳؍صفحات پر مشتمل یہ ناول جب اختتام کو پہنچتا ہے تو ایک نامکمل سی تصویر ابھرتی ہے لیکن درمیان میں ایسے کئی مواقع آتے ہیں جہاں زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔مردہ خانہ میں بھی زندگی کا احساس پیدا ہوتا ہے جس کا ذکر بعد میں اسی مضمون میں کروں گا۔سپرا کے ساتھ پرانی عمارت کا قصہ، گل بانو، نور جہاں اور نظیرے کا قصہ ناول کو

بڑی عمدگی کے ساتھ آگے بڑھاتا ہے ۔ طوائف اور چکلا خانہ کی زندگی ابھرتی ہے لیکن اس میں جو انقلاب آتا ہے وہ معنی خیز ہے اور موت میں زندگی کی روح پھونک جاتا ہے ۔ سپرا جس کی اہلیہ ریحانہ کی موت ہو جاتی ہے ۔ جس کے خواب چکنا چور ہو جاتے ہیں ۔ وہ اپنے گھر کو مردہ خانہ میں تبدیل کر لیتا ہے ۔ گھر کے باہر نیم پلیٹ پر مردہ خانہ لکھواتا ہے ۔ گھر میں اندھیرا کر لیتا ہے ۔ خود کفن پہن لیتا ہے ۔ وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی خود کو مردہ بنا لیتا ہے ۔ سپرا جب خود کو مردہ خانہ میں قید کر لیتا ہے اور اس مردہ خانہ میں جب راٹھور کا قتل کر کے گل بانو پہنچتی ہے تو یہاں سے باقاعدہ قصہ شروع ہوتا ہے اور قاری ایک عجیب وغریب دنیا کی سیر کرنے لگتا ہے ۔ گل بانو زندگی کی اور سپرا موت کی علامت بن کر ابھرتے ہیں ۔ قاری اس تجسس کے ساتھ آگے بڑھتا ہے کہ ان میں سے کون کامیاب ہوتا ہے ، موت یا حیات ۔ سپرا یا گلبانو ۔ فرقہ پرست شیطانی طاقتیں یا فرشتہ صفت انسان اور اس کی انسانیت ۔ ناول جب ختم ہوتا ہے تو اس کا جواب نہیں مل پاتا کیونکہ سپرا خود ابھی حالات سے مطمئن نہیں ہے ۔ سپرا جو گل بانو کی وجہ سے گل بانو کے ساتھ ہی قید کر لیا جاتا ہے ۔ اس کے خلاف مقدمہ چلتا ہے لیکن اس بنیاد پر وہ دونوں رہا کر دیے جاتے ہیں کہ مردوں کو سزا کیسے دی جائے ؟ اب سپرا رہا تو ہو جاتا ہے ۔ وہ اپنے مردہ خانہ لوٹ آتا ہے لیکن ابھی وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتا ہے کہ کیا کیا جائے ؟ وہ مردہ خانہ کی کھڑکیوں اور پردوں کو ہٹائے یا نہیں ؟ دراصل یہ کشمکش اور تجسس کے سبب دو ناول مزید اس سے برآمد ہوئے ہیں ۔

ناول ''مردہ خانہ میں عورت'' کے موضوع پر اگر گفتگو کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں آج کی موجودہ سیاسی صورت حال کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے ۔ یہ ناول ایک بہت بڑے جملے کے ساتھ آگے بڑھتا ہے جو ہمارے لیے چیلنج بھی ہے اور سوال بھی

> قاری اس تجسس کے ساتھ آگے بڑھتا ہے کہ ان میں سے کون کامیاب ہوتا ہے ، موت یا حیات ۔ سپرا یا گلبانو ۔ فرقہ پرست شیطانی طاقتیں یا فرشتہ صفت انسان اور اس کی انسانیت ۔ ناول جب ختم ہوتا ہے تو اس کا جواب نہیں مل پاتا کیونکہ سپرا خود ابھی حالات سے مطمئن نہیں ہے ۔ سپرا جو گل بانو کی وجہ سے گل بانو کے ساتھ ہی قید کر لیا جاتا ہے ۔

''موت ہر حال میں زندگی سے بہتر ہے ۔'' یہ وہ جملہ ہے جو سوال قائم کرتا ہے ۔ یقیناً اسلامی نقطہ نظر سے دیکھیں تو حضور اکرم حضرت محمدؐ کی حدیث ہے کہ ''ذکر موت ایمان کی نشانی ہے ۔'' قرآن مجید کی آیت ہے کہ ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے ۔'' لیکن موت کی بھی اپنی قسمیں ہیں ۔ فطری موت ۔ حادثاتی موت ، ناگہانی موت اور خودکشی ۔ اگر کوئی زندہ انسان خود کو مردہ تصور کر لے اور اپنے کو مردہ خانہ میں بند کر لے تو اس کو موت کے کس زمرہ میں رکھا جائے گا ؟ میرے نزدیک یہ خود کے مترادف ہے ۔

موضوع کا احاطہ کرنے کے لیے ناول نگار نے ناول کو ۶ / حصوں میں تقسیم کیا ہے ۔ پہلا باب ''اندھیرا ، موت اور مسیح سپرا'' ہے ۔ اس باب کو بھی کئی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ کچھ کے عنوان ہیں اور کچھ بلا عنوان ہیں ۔ اس کا مقصد ناول نگار کے نزدیک یہی ہوگا کہ قاری کو مطالعہ میں آسانی اور وہ موضوع کی گرفت کر سکے ۔ ناول نگار کی مقصدیت کے لمس کو محسوس کر سکے ۔ پہلے باب میں دو حصے بلا عنوان ہے لیکن اس کے تیسرے حصہ کا عنوان ''خانہ بدوشوں کا مقدمہ'' قائم کیا گیا ہے ۔ چوتھے حصہ کا عنوان ''۱۹۹۲ / '' رکھا گیا ہے اور اس عنوان سے ہی ظاہر ہوتا جاتا ہے کہ اس کا موضوع کیا ہوگا ؟ پانچویں حصہ کا عنوان ''قدیم شہر : زندگی یا ملبہ'' دیا گیا ہے ۔ اس سے بھی بہت کچھ واضح ہو جاتا ہے ۔ چھٹا اور ساتواں حصہ بلا عنوان ہے جبکہ آٹھویں حصہ کا ''پھر وہی خانہ بدوش'' عنوان دیا گیا ہے ۔

دوسرے باب کا عنوان ''نئی دنیا ، پرانی عمارت اور مردہ گھر'' دیا گیا ہے ۔ اس کے تین حصے بلا عنوان ہیں جبکہ چوتھے حصہ کا ''۲۰۲۰ / جنوری'' عنوان دیا گیا ہے ۔ ناول ۱۳۴ / صفحات پر پہنچتے پہنچتے قریب ۲۸ / سال کا سفر طے کرتا ہے ۔ ۱۹۹۲ / سے ناول کا آغاز ہوتا ہے اور جنوری ۲۰۲۰ / تک آ پہنچتا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ناول نگار نے عصر حاضر کے

مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ دوسرے باب کا پانچواں اور چھٹا حصہ بھی بلاعنوان ہے۔

تیسرا باب ''گل بانو، صندوق اور قتل'' کے عنوان سے سامنے آتا ہے۔ اس باب کے پہلے حصہ کا ''کے بی روڈ'' عنوان دیا گیا ہے ۔ دوسرا، تیسرا اور چوتھا حصہ بلاعنوان ہے جبکہ اس کے پانچویں حصہ کا ''نئے حالات اور گل بانو'' عنوان دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ۶/ سے ۱۰/ حصہ تک کوئی عنوان نہیں ہے یعنی یہ سارے حصے بلاعنوان ہیں۔

ناول کا چوتھا باب ''مردہ خانہ میں عورت'' ہے جو اس ناول کا ٹائٹل بھی ہے۔ اس عنوان سے ایسا لگ سکتا ہے کہ شاید اصل ناول یہیں سے شروع ہو رہا ہے لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ عنوان نہ بھی دیا جاتا تب بھی ناول قاری کو اپنی گرفت میں ہی رکھتا۔ حقیقت یہ ہے راقم نے اس ناول کا مطالعہ عنوان کے سہارے نہیں بلکہ کرداروں اور بیانیہ کے سہارے کیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ بلا عنوان ہے جبکہ دوسرا حصہ ''صبح گیارہ بجے'' عنوان کے ساتھ ہے۔ تیسرا حصہ ''گیلی گولیاں اور ناراض دیوتا'' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔ چوتھا حصہ بلاعنوان اور پانچوں حصہ ''دوسرے دن'' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔ اس کا چھٹا اور ساتواں حصہ بلا عنوان ہے جبکہ آٹھواں حصہ ''بلیک آؤٹ میں زندگی'' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔ نواں حصہ پھر بلا عنوان شامل ہے۔

ناول کا پانچوں باب ''دشت لایعنیت'' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔ اس کے دو حصے بلاعنوان ہیں لیکن تیسرا حصہ ''مردہ گھر تیار تھا'' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔ یہ حصہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

چھٹا اور آخری باب ''مردے کا مقدمہ'' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ ''مسیح سپرا کی ڈائری سے'' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔ اس کا دوسرا حصہ بلاعنوان ہے جبکہ چوتھا حصہ ''دوسری پیشی'' کے عنوان سے

> عبدالصمد، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی، سید محمد اشرف، پیغام آفاقی، سلام بن رزاق، طارق چھتاری، شوکت حیات، ابن کنول، الیاس احمد گدی، غضنفر اور اس قبیل کے دوسرے افسانہ اور ناول نگاروں نے اپنی نئی شناخت قائم کی اور یہیں سے افسانوں اور ناولوں میں کردار اور قصہ کی واپسی ہوتی ہے۔ بیانیہ اپنے نئے اسلوب اور نئے انداز کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔

شامل ہے۔ چوتھا حصہ ''تیسری پیشی'' کے عنوان سے ہے۔ پانچویں حصہ کا عنوان ''ہائی کورٹ'' ہے۔ اسی میں ایک ساتواں باب ہے جس کا عنوان ''فیصلہ'' رکھا گیا ہے لیکن ناول نگار نے اس کی نمبر سازی نہیں کی۔ آٹھویں باب کی شکل میں ''سپرا کی ڈائری سے'' ایک حصہ رقم کیا گیا۔ اس طرح یہ ناول اختتام کو پہنچتا ہے۔

کردار کے بغیر کیا کسی ناول، کسی افسانہ، کسی ڈرامہ، کسی قصہ یا کہانی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ لیکن ایک وقت فکشن پر یہ بھی گزرا جب ادب میں یہ کہا جانے لگا تھا کہ قصوں سے کردار کھو گئے۔ ۱۹۶۰/ کے بعد جب ہندوستانی ادب پر جدیدیت کا قبضہ ہو گیا۔ علامتوں اور استعاروں میں باتیں کرنا فیشن ہو گیا تھا۔ سید محمد عقیل رضوی جیسا ترقی پسند ناقد بھی نئی علامت نگاری جیسی کتاب قلم بند کرنے پر مجبور ہوا۔ یہی نہیں بلکہ ''جدید ناول کا فن'' جیسی تنقیدی کتاب بھی منظر عام پر آئی تو ادبی دنیا حیران رہ گئی۔ لیکن یہ سلسلہ بہت دنوں تک قائم نہیں رہ سکا کیونکہ ناول اور افسانے بغیر کردار، بغیر قصہ کے رہ ہی نہیں سکتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۸۰/ کے بعد ایک نئی نسل فکشن کی دنیا میں سامنے آئی جس نے نہ جدیدیت کی پرواہ کی اور نہ ہی ترقی پسندی کی بلکہ اس نے آزادانہ طور پر لکھنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی تخلیق پر خود ہی تبصرہ کرنا شروع کر دیا کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی تخلیق پر کسی کا ٹھپہ لگے۔ عبدالصمد، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی، سید محمد اشرف، پیغام آفاقی، سلام بن رزاق، طارق چھتاری، شوکت حیات، ابن کنول، الیاس احمد گدی، غضنفر اور اس قبیل کے دوسرے افسانہ اور ناول نگاروں نے اپنی نئی شناخت قائم کی اور یہیں سے افسانوں اور ناولوں میں کردار اور قصہ کی واپسی ہوتی ہے۔ بیانیہ اپنے نئے اسلوب اور نئے انداز کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ استعارے اور علامتیں بھی نئے رنگ و روپ

میں سامنے آتی ہیں ۔مشرف عالم ذوقی کے یہاں بھی یہی صورت حال ہے ۔ جہاں موضوع ہے،مقصد ہے،قصہ ہے، پلاٹ ہے، بیانیہ ہے، کردار ہے ۔منظر اور پس منظر ہے ۔ علامت ہے اور استعارہ ہے۔

مشرف عالم ذوقی کے کردار ہمارے سماج کے ہیں ، ہمارے معاشرے کے ہیں ، ہماری زندگی سے ہم آہنگ ہیں ۔ناول ''مرگ انبوہ'' کے کردار مرزا پاشا، جہانگیر مرزا، گریسی اور ریمنڈ وہ کردار ہیں جو اپنے معلوم ہوتے ہیں ۔ یہ ایسے کردار ہیں جو مستقبل میں بھی ہمارے ساتھ رہنے والے ہیں یعنی تیزی سے سفر طے کرتی زندگی میں بھی یہ ہمارے ساتھ ہی رہنے والے ہیں ۔اسی طرح اب راقم کو ناول ''مردہ خانہ میں عورت'' میں کچھ اہم کردار ملے ہیں ۔مسیح سپرا،نور جہاں،گل بانو، نظیرے اور اس کے گرد طواف کرنے والے کردار جو ناول کا ناگزیر جز معلوم ہوتے ہیں ۔ مثال کے طور پر پولیس کمشنر راٹھور کا کردار یا پھر راٹھور جج کا کردار ۔ کچھ نامعلوم کردار بھی نمودار ہوتے ہیں اور اپنا کام تمام کر کے غائب ہو جاتے ہیں ۔

اب یہ اہم سوال ہے کہ زیر مطالعہ ناول کا مرکزی کردار کون ہے؟ اس کا جواب آسان ہے کہ وہ عورت جو مردہ خانہ میں ہے ۔ یہ عورت ''گل بانو'' ہے جو دہلی پولیس کمشنر کا قتل کر کے اپنی جان بچاتی ہوئی مردہ خانہ میں پہنچ جاتی ہے اور مسیح سپرا کے ہمراہ پناہ لیتی ہے ۔مسیح سپرا جو معاشرے کی موت کی علامت بن کر ابھرتا ہے اور گل بانو معاشرے کی زندگی بن کر ابھرتی ہے ۔ دونوں میں تصادم شروع ہوتا ہے اور یہی تصادم اور ٹکراؤ قاری کے اندر تجسس پیدا کرتا ہے ۔ اب گل بانو اور سپرا دونوں سمجھ میں آنے لگتے ہیں ۔ دونوں اپنی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں ۔ اس ناول میں اگر گل بانو جیسا مضبوط اور بھرپور نسوانی کردار سامنے نہ آئے تو یہ ناول قاری کو ایک ایسی تاریکی میں پہنچا دیتا

''مسیح سپرا کو کچھ ایسے جابر و ظالم حکمراں بھی یاد آئے جو خود کو زندہ رکھنے کے لیے اور عمر بڑھانے کے لیے عجیب عجیب طریقے اپنایا کرتے تھے۔ برما کا ایک سابق حکمراں ڈولفن مچھلی کا خون پیتا تھا ۔چنگیز خاں کو جانوروں اور انسانوں کے خون کی مہک پسند تھی ۔ کچھ ایسے بھی حکمراں تھے جو جوان اور کنواری لڑکی کو ہلاک کر کے ،اس کے لہو سے غسل کیا کرتے تھے۔

جہاں صرف و صرف موت ہے اور اس کے سوائے کچھ بھی نہیں ۔سب سے پہلے راقم مسیح سپرا پر روشنی ڈالنا چاہتا ہے کیونکہ اس کردار کو سمجھے بغیر گل بانو کو سمجھنا مشکل ہے ۔یعنی جب روشنی کی اہمیت کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا کہ جب تک تاریکی کا احساس نہ ہو ۔ اگر مسیح سپرا تاریکی ہے تو گل بانو روشنی ہے ۔ اگر مسیح سپرا موت ہے تو گل بانو زندگی ہے ۔

''مسیح سپرا کو موت کا خیال کسی سایے کی طرح نظر آتا تھا ، ایسا سایہ جو سفید لباس میں معلق ہو یا نیلے آسمان پر چلتے سفید بادلوں میں وہ موت کا عکس دیکھا کرتا تھا ۔اور جب اس نے سوچ لیا کہ وہ مر چکا ہے تو سب سے پہلے اسے سرد خانے میں کام کرنے والے ملازم مجومدار کا خیال آیا'' (ص:۲۲)

یہ پہلا موقع ہے جب مسیح سپرا کا کردار ابھرتا ہے ۔ اس کو یہ خیال آتا ہے کہ وہ مر چکا ہے ۔ ایک زندہ انسان ہے جو چل پھر رہا ہے، باتیں کر رہا ہے، کھا پی رہا ہے لیکن اچانک اس کو یہ احساس ہو جائے کہ مردہ ہے اور پھر وہ اپنی موت کا اعلان بھی کر دے تو خود بہ خود ایک بڑا سوال قائم ہو جاتا ہے کہ آخر وہ کون سے حالات ہیں ؟ وہ کون سے واقعات ہیں ؟ وہ کون سی مجبوری ہے کہ جس کے سبب ایک زندہ انسان خود کو مردہ تصور کرنے لگتا ہے ۔یہی نہیں وہ خود کے ساتھ ساتھ ایک بڑی آبادی کو اپنے جیسا تصور کرتا ہے اور اس تصور میں استدلال ہے ۔آخر سپرا کے نزدیک موت زندگی سے بہتر کیوں ہو جاتی ہے ؟ وہ کیوں جذبات و احساسات سے بے نیاز ہونا چاہتا ہے؟

''مسیح سپرا کو کچھ ایسے جابر و ظالم حکمراں بھی یاد آئے جو خود کو زندہ رکھنے کے لیے اور عمر بڑھانے کے لیے عجیب عجیب طریقے اپنایا کرتے تھے۔ برما کا ایک سابق حکمراں ڈولفن مچھلی کا خون پیتا تھا۔چنگیز خاں کو جانوروں اور انسانوں کے خون کی مہک پسند تھی ۔ کچھ ایسے بھی حکمراں تھے جو جوان اور کنواری لڑکی کو ہلاک کر کے ،اس کے لہو سے غسل کیا کرتے

۔مسیح سپرا کو حیرت تھی، ایک بے مقصد اور بدتر زندگی کے لیے خون پینا، غسل کرنا، عیاشی کرنا، سفر کرنا، آوارہ گردی کرنا، ان مشاغل کی کیا ضرورت ہے۔۔۔؟'' (ص:۲۵) اب تاریخ کے جبر کا مسیح سپرا کی زندگی پر اثر دیکھئے۔۔

''اور اسی لیے پہلے دن جب مردہ ہونے کا خیال آیا تو اس نے اپنی پرانی خادمہ کو، جو اہلیہ کے انتقال کے بعد اس کی ضرورتوں کا پورا خیال رکھتی تھی، بلایا اور ڈرائنگ روم میں رکھا ہوا بڑا سا ٹی وی اور کچھ روپے اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا، اب تم جاؤ اور آج سے تم سے جو بھی جسمانی رشتہ تھا، اس کو ختم کر رہا ہوں۔'' (ص:۲۵)

ناول نگار نے یہاں ٹیلی ویژن اور خادمہ کو زندگی کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے کہ جن کے جانے کے بعد مسیح سپرا مکمل طور پر مردہ ہو جاتا ہے۔ ناول کے شروع میں ہی مسیح سپرا کے ہمراہ ایک اور اہم کردار ڈاکٹر سدھا کر کے نام سے سامنے آتا ہے جو موجودہ سیاست سے نفرت کرتا ہے۔ وہ ان سیاستدانوں کو موت کا انجکشن دینا چاہتا ہے کہ جنھوں نے ہندوستان کو ایک گندے تالاب میں تبدیل کیا ہے۔ یہاں کردار کے ساتھ ساتھ ناول نگار کی مقصدیت بھی واضح ہوتی ہے کیونکہ ڈاکٹر سدھا کر کردار سپرا کے ہمراہ وقت گزاری کے لیے نہیں لایا گیا بلکہ ناول کی مقصدیت کی طرف ایک اشاریہ ہے اور کسی حد تک یہ سپرا یا سماج کی مردگی کی وجہ بھی بیان کر جاتا ہے۔ ڈاکٹر سدھا کر ان لوگوں سے انتقام لینا چاہتا ہے کہ جنھوں نے ہندوستان جیسے پر امن اور محبت والے ملک کو نفرت کی آگ میں جھونک دیا اور انتشار پیدا کر دیا۔ لیکن جب ڈاکٹر سدھا کر کی موت ہو جاتی ہے تو سپرا کے اندر موت کا احساس مزید پختہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سدھا کر ایڈز جیسی بیماری کے لیے گندی سیاست کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔

اس کے بعد ایک خاتون صحافی سمیتا کا کردار ابھرتا ہے۔ یہ کردار فلیش بیک کے

> ناول نگار نے یہاں ٹیلی ویژن اور خادمہ کو زندگی کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے کہ جن کے جانے کے بعد مسیح سپرا مکمل طور پر مردہ ہو جاتا ہے۔ ناول کے شروع میں ہی مسیح سپرا کے ہمراہ ایک اور اہم کردار ڈاکٹر سدھا کر کے نام سے سامنے آتا ہے جو موجودہ سیاست سے نفرت کرتا ہے۔ وہ ان سیاستدانوں کو موت کا انجکشن دینا چاہتا ہے کہ جنھوں نے ہندوستان کو ایک گندے تالاب میں تبدیل کیا ہے۔

ساتھ ابھرتا ہے۔ اس کی بھی موت ہو جاتی ہے۔ سمیتا کی موت سے سپرا کو بڑا دھچکا لگتا ہے کیونکہ سپرا اس کو پسند کرنے لگتا ہے۔ ہاں سپرا کی اہلیہ ریحانہ کا کردار بھی معنی خیز ہے اور اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ریحانہ کی موت بھی سپرا کو مردہ خانہ میں پہنچانے میں مدد کرتی ہے۔ یہ ریحانہ بالکل ''مرگ انبوہ'' والی مرزا جہانگیر کی اہلیہ جیسی ہے۔ مرزا جہانگیر کی طرح سپرا بھی آزاد خیال ہے اور سیکس کو ترجیح دیتا ہے اور اہلیہ اس کو آزاد رکھتی ہے۔

ہندوستان جو آج نظر آتا ہے اس کی بنیاد کب اور کیسے رکھی گئی؟ یہاں ناول نگار نے سیاست کی بدترین صورت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سپرا یہاں بھی مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ یہاں سیاست کی موت دیکھتا ہے۔ جس طرح ریحانہ، بیٹا دانش، ڈاکٹر سدھا کر، سمیتا کی موت ہوتی ہے، بابری مسجد کی شہادت ہوتی ہے، آئین اور جمہوریت کا قتل ہوتا ہے اور اب سیاست کی موت ہوتی ہے چنانچہ یہ وہ حالات ہیں جو سپرا کو مردہ خانہ کی طرف لے جاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ سپرا کا کردار سامنے آتا ہے۔ مسیح سپرا ماضی کی سیر کرتا ہے۔ وہ ۲۰۲۰ء سے اچانک ۱۹۹۱ء کے عہد میں پہنچ جاتا ہے تو اس کی وضاحت بھی ناول نگار کر دیتا ہے تاکہ قاری کو مشکل پیش نہ آئے۔

''سپرا کی آنکھوں میں ایک ٹائم مشین فٹ تھی، جس سے ہو کر وہ اکثر ماضی کی وادیوں میں نکل جاتا ہے۔'' (ص: ۱۰۴) یہاں مشرف عالم ذوقی کو جو کام کر رہے ہیں وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس سے پہلے کے ناول نگاروں نے بھی یہ کام کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی شکست و ریخت کے بعد جب ناول نگاری سامنے آئی تو اس میں اسی عہد کا تذکرہ تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کا ناول 'ابن الوقت' کا مطالعہ کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ کس طرح سر سید احمد خاں کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور ان پر ان کے ہم عصر نے ابن الوقتی کا الزام عائد کیا۔

عبدالحلیم شرر یا رتن ناتھ سرشار نے بھی اپنے عہد کے مسائل سے روگردانی نہیں کی ۔ مرزا ہادی رسوا نے بھی امراؤ جان ادا میں اپنے عہد کو ہی پیش کیا ہے ۔ ''مردہ خانہ میں عورت'' کا نسوانی کردار ''گل بانو'' کو ہم امراؤ جان ادا سے جوڑ کر دیکھ سکتے ہیں ۔ آپ دونوں عہد کے مسائل اور اس عہد کی پیچیدگیوں کو سامنے رکھ کر دیکھئے تو اندازہ ہوگا ۔ خاص بات یہ ہے کہ کوئی بھی بڑی کردار اپنے ماضی کو فراموش کر کے بڑا نہیں بنتا کیونکہ مستقبل کا راستہ ماضی سے ہو کر ہی گزرتا ہے ۔

سپرا جو ناول نگار ہے جب اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اب اس کے لکھے ہوئے ناول فروخت نہیں ہو رہے ہیں کیونکہ اب کتابیں فروخت نہیں ہو رہی ہیں تو بھی وہ مایوسی کا شکار ہوتا ہے ۔ اس کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ جو تے تو ہمیشہ فروخت ہوں گے لیکن کتابیں ہمیشہ فروخت نہیں ہوں گی ۔ گویا ایک کے بعد ایک موت کا سلسلہ ہے اور سپرا تیزی سے مردہ خانہ کی طرف بڑھتا ہے ۔ ۱۹۹۱ء سے ۲۰۰۰ء تک اور ۲۰۰۰ء سے ۲۰۱۰ء تک جس قسم کی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان کا سب کا ذکر ناول نگار انتہائی معروضیت کے ساتھ کرتا چلتا ہے ۔ صفحہ ۱۰۹ء سے صفحہ ۱۱۵ء تک کا مطالعہ اپنے اس کی عکاسی کرتے ہیں ۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے سپرا کو ملک کی آدھی آبادی مردہ معلوم ہونے لگتی ہے اور پھر ۲۰۱۳ء میں اس کو دوسری مرتبہ مردہ خانہ لفظ سنائی دیتا ہے ۔ اب سپرا اپنے گھر پر مردہ خانہ کا بورڈ لگا دیتا ہے اور گھر میں اندھیرا کر لیتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کو سکون نہیں ہے ۔

سپرا کے کردار میں صداقت نظر آتی ہے ۔ یہ کوئی لایعنی کردار نہیں بلکہ حقیقی کردار ہے جو آج کی حقیقت کو بے نقاب کر رہا ہے ۔ اس کی گفتگو میں استبدلال ہے ۔ معروضیت ہے ۔ حالات کا کرب اور درد ہے ۔ سپرا صرف اس لیے موت کا اعلان نہیں کرتا کہ اس کی بیوی مر گئی ، اس کا بیٹا مر گیا بلکہ خانہ بدوشوں

> سپرا جو ناول نگار ہے جب اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اب اس کے لکھے ہوئے ناول فروخت نہیں ہو رہے ہیں کیونکہ اب کتابیں فروخت نہیں ہو رہی ہیں تو بھی وہ مایوسی کا شکار ہوتا ہے ۔ اس کے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ جو تے تو ہمیشہ فروخت ہوں گے لیکن کتابیں ہمیشہ فروخت نہیں ہوں گی ۔ گویا ایک کے بعد ایک موت کا سلسلہ ہے اور سپرا تیزی سے مردہ خانہ کی طرف بڑھتا ہے ۔

کے ہاتھوں جس طرح ایک کے بعد ایک پوری انسانیت کا قتل ہو رہا ہے اور انسان کا ضمیر مردہ ہوتا جا رہا ہے ، یہ اس کی علامت بن کر ابھرتا ہے ۔ سپرا آج کے حالات و ماحول کا جیتا جاگتا استعارہ ہے ۔ سپرا آج کے بے حس معاشرے کا استعارہ بن کر ابھرتا ہے ۔

سپرا کا یہ کردار معاشرے کی گھٹن ، مایوسی ، بے چارگی ، افسوس ، درد ، بے چینی کی علامت بن جاتا ہے چنانچہ ناول نگار کے لیے ضروری تھا کہ اس سے نکلنے کا بھی کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کیا جائے ۔ زندگی صرف مایوسیوں ، بے چارگیوں ، بے چینیوں ، تاریکیوں ، اضطرابوں اور گھٹن میں تو نہیں رہ سکتی لہٰذا ایک نیا قصہ ، ایک نیا کردار ، ایک نیا ماحول ، ایک نیا انقلاب وجود میں آتا ہے ۔ نور جہاں ، گل بانو ، نظیرے ، شاہین باغ اور انقلاب زندہ باد کے نعروں سے ناول کو نیا رخ دیا جاتا ہے ۔

پرانی دہلی کا منظر ابھرتا ہے ۔ جی بی روڈ جس سے ہر کوئی واقف ہے ، اس کو ناول نگار نے کے بی روڈ کا نام دیا ہے ۔ یہاں وہ عورتیں آباد ہیں جنھیں آپ طوائف خانہ ، چکلہ خانہ ، قحبہ خانہ ، ڈیرہ دار کوئی بھی نام مخاطب کر سکتے ہیں ۔ ناول نگار نے کے بی روڈ کا اچھا نقشہ کھینچا ہے ۔

''بلی ماران ، چوڑی والان ، کالی مسجد روڈ ، وکیلوں والی گلی ، سوئی والان اور ان کے درمیان ہی کہیں کے بی روڈ کا چوراہا آتا ہے تو نگاہیں سیدھے اوپر کی جانب چلی جاتی ہیں ۔'' (ص:۱۵۶ء)

یہاں نور بانو ہیں ، ان کی بیٹی گل بانو ہے اور دلاّ نظیرا ہے جو نظیرے بھی بن جاتا ہے ۔ اس کردار کی خاص بات یہ ہے کہ جب معاشرہ مردہ خانہ بن رہا ہے تو ایک مردہ نظیرے کی شکل میں زندہ ہو رہا ہے ۔ کہیں کہیں یہ کردار سب پر بھاری پڑ جاتا ہے ۔ سپرا سے بھی بڑا کردار بن کر نظیرے ابھرتا ہے ۔ یہ کردار حالات کے آگے خود سپردگی نہیں کرتا بلکہ اس سے ٹکراتا ہے ۔

یہاں نور جہاں پرانی قدروں کی طوائف ہیں اور شاید حالات سے بے خبر لیکن نظیرے خبردار ہے اور اس کی مدد سے ہی نور جہاں کی بیٹی گل بانو ایک بڑا اور مضبوط کردار بن کر ابھرتی ہے ۔ایک پوری طوائف کی زندگی کو ناول نگار نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور جو ہمت شاید امراؤ جان ادا نہیں کر سکی وہ ہمت گل بانو کر دکھاتی ہے۔ کے بی روڈ سے نکل کر نور بانو، گل بانو ایک باعزت یا ایلیٹ کلاس علاقہ میں پہنچ جاتی ہیں ۔لیکن یہ سب اس وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب یہ لوگ خود یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں ۔نور جہاں عام طوائفوں سے خود کو مختلف تصور کرتی ہے۔ وہ تعفن زدہ بستی میں تو ہے لیکن وہ ابھی مردہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی بیٹی گل بانو کو فی الحال تعلیم پر توجہ دینے کے لیے کہتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ''اس پورے علاقہ میں چکلہ گھر سے نکلنے والی ایک عجیب سی بدبو کا احساس ہوتا تھا گل بانو کو۔گل بانو اس بدبو سے خوف کھاتی تھی۔''(ص:۱۶۵)

ایک طرف سپرا کا کردار ہے جہاں مردہ خانہ ہے ۔ دوسری طرف بھی مردہ خانہ ہے جہاں گل بانو ہے۔ سپرا کو مردہ خانہ سے پیار ہے اور گل بانو کو اس سے نفرت ہے۔ وہ ایسی جگہ پر گھٹن محسوس کرتی ہے۔مشرف عالم ذوقی نے بھی تقریباً طوائف کی وہی روایت پیش کی ہے جو ان کا خاصہ ہے۔نور جہاں کا درگاہوں پر جانا ، گیارہویں شریف اور محرم کی خاص تیاری ۔ نیاز ، فاتحہ ، رمضان شریف ، ربیع الاول کا خیال وغیرہ وغیرہ۔ یہاں بہت کچھ نیا نہیں ہے لیکن سی اے اے کی تحریک میں گل بانو کا جانا اور یونیورسٹی کی لڑکیوں کی آواز سے آواز ملانا اور حق کی آواز بلند کرنا ایک نیا تجربہ معلوم ہوتا ہے ۔ طوائف کوٹھے سے اتر کر دھرنے میں پہنچ جاتی ہے ۔گھٹ کر موت کا انتظار کرنے کی بجائے موت سے دو دو ہاتھ کرتی ہے یہ ایک نئی زندگی کا احساس ہے۔گل

ایک طرف سپرا کا کردار ہے جہاں مردہ خانہ ہے ۔ دوسری طرف بھی مردہ خانہ ہے جہاں گل بانو ہے۔ سپرا کو مردہ خانہ سے پیار ہے اور گل بانو کو اس سے نفرت ہے۔ وہ ایسی جگہ پر گھٹن محسوس کرتی ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے بھی تقریباً طوائف کی وہی روایت پیش کی ہے جو ان کا خاصہ ہے۔نور جہاں کا درگاہوں پر جانا ، گیارہویں شریف اور محرم کی خاص تیاری ۔ نیاز ، فاتحہ ، رمضان شریف ، ربیع الاول کا خیال وغیرہ وغیرہ۔

بانو کے یہاں جو انقلابی رنگ و آہنگ نظر آتا ہے وہ رنگ و آہنگ عصمت چغتائی کے سوگندھی میں بھی نظر آتا ہے۔

گل بانو کے ساتھ ایک چندا یادو کا کردار ابھرتا ہے جو شاہین باغ میں چلنے والی تحریک کا اہم جز ہے۔گل بانو اس سے بہت متاثر ہوتی ہے۔

''میں آج چندہ یادو سے دوبارہ ملنا چاہتی ہوں ۔۔۔میں نے سنا ہے انقلاب زندہ ہے اور اب بھی وہاں لڑکے اور لڑکیاں موجود ہیں ۔ممکن ہے اس بھیڑ میں چندہ یادو سے ملاقات ہو جائے۔''

اب جن لوگوں نے شاہین باغ کی تحریک میں شرکت کی ہے ۔ دھرنا دے رہی خواتین کے درمیان وقت گزارا ہے ۔ زندہ کرداروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ چندہ یادو کو سمجھ سکتے ہیں اور یہ بھی سمجھ سکتے ہیں گل بانو جیسے نہ جانے کتنے کردار اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔اور یہ تحریک بے مقصد نہیں تھی بلکہ موجودہ حکومت جس طرح سے ایک بڑے طبقہ کو اجنبی بنا رہی ہے ۔ان سے ان کی پہنچا چھین رہی ہے ۔ ان سے ان کی شہریت چھین لینا چاہتی ہے، یہ لڑائی اس کے خلاف ہے اور چندہ یادو جیسی نوجوان نسل کا عزم ہے کہ جب تک یہ حکومت انھیں اجنبی بنانا بند نہیں کر دیتی تب تک یہ لڑائی جاری رہے گی ۔نفرت کی سلاخوں کو توڑنے کا عزم بھی ظاہر ہوتا ہے۔ چندہ یادو اس کو ایک جنگ تصور کرتی ہے اور گل بانو اس کا حصہ بن جاتی ہے۔

''تم ۔۔۔چندا نے شکایتاً پوچھا۔
اس دن کے بعد آئی کیوں نہیں ۔؟
مجھے لگا آپ نہیں ملیں گی۔
جب تک یہ ملک ہمیں اجنبی بنانا نہیں چھوڑتا ہم آتے رہیں گے اور حق کے لیے لڑتے رہیں گے۔
صرف اجنبی ۔۔۔؟
نہیں ۔نفرت کی سلاخیں ۔ان سلاخوں کو

توڑنا ہے اور بھی بہت کم ہیں۔ہاں بہت کام ہیں۔۔گل بانو نے دہرایا۔۔۔آپ روز آتی ہیں۔

ہاں کیوں؟

کیا کوئی فائدہ ہوا؟

چندا نے چونک کر دیکھا گل بانو کو ۔۔۔مسکرائی ۔۔یہ جنگ فائدہ نقصان کے لیے نہیں ۔۔یہ جنگ ہماری ہے کہ ہم سب ایک ہیں ۔ہمیں خانوں میں تقسیم مت کرو ۔۔''(ص:۲۳۸؍تا۲۳۹؍)

اب آپ کو اندازہ ہو رہا ہوگا کہ ایک ساتھ ایک عہد میں دو طرح کی تصویریں ابھر رہی ہیں۔ایک طرف موت ہے،تاریکی ہے تو دوسری طرف زندگی ہے اور روشنی ہے۔سپرا کی دنیا دیکھئے اور گل بانو کی دنیا دیکھئے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ گل بانو کا کردار جو اس قدر بلند و بالا ابھر کر آیا ہے اس کی وجہ شاہین باغ اور سی اے اے کی تحریک ہے کہ جس کی قیادت خواتین کر رہی تھیں ۔آزاد ہندوستان یا غلام ہندوستان شاید یہ پہلا موقع تھا جب کسی تحریک کی قیادت خواتین کر رہی تھیں اور جس میں نوجوان لڑکیاں بھی شامل تھیں۔جس میں ۹۰؍سال کی دادی تو نوجوان چندا یاد دو۔آپ خود تصور کریں کہ اگر سی اے اے کی یہ تحریک نہ ہوتی تو گل بانو تاریکی سے کیسے نکلتی اور نکل کر کہاں جاتی؟

یہ وہی چندا یاد دو ہے کہ جس کا قتل پولیس کمشنر راٹھور کرتا ہے اور اس کا انتقام گل بانو لیتی ہے۔وہ بڑی حکمت سے راٹھور تک پہنچتی ہے اور پھر ہوٹل میں اس کا قتل کر دیتی ہے۔قتل کرنے کے بعد بھی گل بانو جینا چاہتی ہے۔وہ جیل نہیں جانا چاہتی بلکہ آزاد رہنا چاہتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ پولیس کی گرفت سے بچنے کے لیے جگہ تلاش کرتی ہے اور پھر وہ مردہ خانہ میں داخل ہو جاتی ہے جہاں اس کی ملاقات سپرا سے ہوتی ہے۔

گل بانو کو نہ چاہتے ہوئے بھی جس طرح سپرا اس کو پناہ دیتا ہے اس سے یہ بھی اندازہ

> راقم الحروف کا خیال ہے کہ گل بانو کا کردار جو اس قدر بلند و بالا ابھر کر آیا ہے اس کی وجہ شاہین باغ اور سی اے اے کی تحریک ہے کہ جس کی قیادت خواتین کر رہی تھیں ۔آزاد ہندوستان یا غلام ہندوستان شاید یہ پہلا موقع تھا جب کسی تحریک کی قیادت خواتین کر رہی تھیں اور جس میں نوجوان لڑکیاں بھی شامل تھیں۔جس میں ۹۰؍سال کی دادی تو نوجوان چندا یاد دو۔

ہوتا ہے کہ خود سپرا میں بھی ابھی زندگی کی رمق باقی ہے۔وہ یہ بھی کہتا ہے کہ مردوں کی زندگی نہیں بدلتی ۔مردوں کی زندگی میں یکسانیت رہتی ہے ۔وہ سوئے رہتے ہیں ۔گہری نیند ۔۔دراصل سپرا کے یہاں پایا جانے والا یہ احساس بھی اس بات کی علامت ہے کہ وہ ابھی زندہ ہے ۔گل بانو کی نظر میں سپرا کی زندگی ایک حقیقت بھی ہے اور لایعنی بھی۔سپرا کی ہر بات گل بانو مان لیتی ہے تاکہ وہ یہ دیکھ سکے یہ آخر مردوں کی زندگی کیسی ہوتی ہے۔وہ کہتی ہے کہ زندہ رہکر تو دنیا دیکھ لی اب ذرا مردہ ہوکر بھی دنیا دیکھی جائے۔

گل بانو کے اندر کا یہ اشتیاق، یہ خواہش عجیب نہیں لگتی کیونکہ وہ اس کے ذریعہ آج کے حالات و ماحول کو محسوس کرنا چاہتی ہے۔یہ بھی ایک طرح سے انقلابی قدم ہے جو وہ اٹھانے جا رہی ہے ۔اس دوران گل بانو کو اس وقت صدمہ پہنچتا ہے جب اس کی والدہ نور جہاں کا انتقال ہو جاتا ہے اور یہ انتقال اس کی وجہ سے ہوتا ہے ۔نظیرے بڑی خاموشی سے گل بانو سے ملاقات کرتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ ہم سب جیل بھیجے گئے ، وہاں ہمارے ساتھ انتہائی ظالمانہ سلوک کیا گیا۔نور جہاں صدمہ برداشت نہیں کر سکیں اور وہ اس جہان فانی سے رخصت ہوگئیں ۔یہ ایسی خبر تھی جو سپرا کی طرح گل بانو کو بھی مایوسی میں دھکیل سکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا،گل بانو اس خبر کے بعد مزید مضبوط ہوتی ہے ۔وہ قتل کے مقدمہ کا سامنا کرتی ہے۔گل بانو کا مقدمہ اس وقت دلچسپ ہو جاتا ہے جب یہ بحث عدالت میں شروع ہوتی ہے کہ ۷؍جنوری کو راٹھور کا قتل کیسے ہوسکتا ہے کہ جب ۷؍جنوری کو دیوتاؤں نے غائب کر دیا ہے ۔یہ سچ ہے کہ گل بانو راٹھور سے ملاقات کرنے کے لیے ۶؍جنوری کو ہوٹل گئی لیکن جب وہ پلٹی تو رات کے ایک بجکر سینتیس منٹ ہو چکے تھے،تاریخ بدل چکی تھی۔

''غلط ۔گل بانو کے وکیل نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔اس دن چھ جنوری تھا

حقیقت ہے۔مگر بارہ بجے کے بعد تاریخ بدل گئی۔یعنی ۷؍جنوری، رات ایک بج کر سینتیس منٹ۔

ہاں، سرکاری وکیل نے کہا

تو آپ غداری کر رہے ہیں۔گل بانو کے وکیل نے کہا۔بھگوان نے ۷؍جنوری کی تعریف غائب کر دی،گل بانو کے وکیل نے جج صاحب کی طرف دیکھا۔

جب ۷؍جنوری ہندوستانی کیلنڈر میں موجود ہی نہیں ہے تو قتل کیسے ہوا؟ کہاں ہوا؟ ممکن ہے راٹھور غائب ہو گیا ہو۔ان دنو ستارے، سیارے بھی غائب ہو رہے ہیں۔بڑی تعداد میں سانڈ اور گائیں غائب ہیں۔کبھی کبھی حکمراں بھی غائب ہو جاتے ہیں۔''

(ص:۴۴۸؍تا۴۴۵؍)

یہاں ناول نگار مستقبل کا راستہ دکھانے کی کوشش کر رہا ہے اور مایوسی اور تاریکی سے نکلنے کی بھرپور کوشش میں نظر آ رہا ہے۔یہاں یہ بھی گنجائش دکھائی گئی ہے کہ اب بھی اپوزیشن اور کمیونسٹ پارٹیاں مردہ نہیں ہوئی ہیں تاہم میڈیا کو مردوں کے زمرے میں رکھا گیا۔یہی وجہ ہے کہ اپوزیشن بھگوان کے فیصلے کی مخالفت کرتا ہے لیکن میڈیا مطمئن ہو جاتا ہے۔

اس ناول میں جج کا کردار بھی بہت اہم ہے۔عدالت عالیہ کے جج مہندر چندر چون سنگھ کی بات قابل توجہ ہے۔اس کی گفتگو سے ایک امید بندھتی ہے، ایک زندگی کا احساس ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے جیسے مردہ خانہ میں کوئی کھڑکی کھلی ہوئی ہے جس سے روشنی آ رہی ہے جو تاریکی میں مردگی کو ضرب لگا رہی ہے۔جج خود مردہ خانہ کا دورہ کرتا ہے اور وہاں کے حالات دیکھتا ہے اور حیران رہ جاتا ہے۔

اب یہاں مردہ خانہ اور بنگلوں کی ویران کو پیش کیا گیا ہے اور سپرا کی باتوں کی تائید جج کر رہا ہے۔اس کے بعد جب جج چندر چورن اپنا فیصلہ سناتے ہیں اور حالات پر جو تبصرہ پیش کرتے ہیں وہ بھی لاجواب ہے اور ناول کو ناول بنانے میں مدد کرتا ہے۔

کرداروں پر بات کرتے ہوئے نظیرایا نظیرے کا ذکر نہ کیا جائے تو شاید اس کردار اور ناول نگار دونوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔حالانکہ مذکورہ بالا حصہ میں کچھ ذکر تو آچکا تاہم ایک دو اقتباس اور آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس کی مقصدیت کا اندازہ ہو۔نظیرا دلال ہے لیکن وہ ان لوگوں سے خود کو بہتر تصور کرتا ہے کہ جو بے ضمیر اور بے غیرت ہو چکے ہیں

کرداروں پر بات کرتے ہوئے نظیرایا نظیرے کا ذکر نہ کیا جائے تو شاید اس کردار اور ناول نگار دونوں کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔حالانکہ مذکورہ بالا حصہ میں کچھ ذکر تو آچکا تاہم ایک دو اقتباس اور آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس کی مقصدیت کا اندازہ ہو۔نظیرا دلال ہے لیکن وہ ان لوگوں سے خود کو بہتر تصور کرتا ہے کہ جو بے ضمیر اور بے غیرت ہو چکے ہیں۔جو ظلم پر خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔جو شطرمرغ بنائے ہوئے ہیں۔

'' کیوں ؟ دلاّ ہوں ۔بے غیر نہیں ۔نظیرے اٹھ کر سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا ۔۔۔۔انقلاب کو سب کی ضرورت ہوتی ہے ۔۔۔(ص:۲۰۷)

مشرف عالم ذوقی نے نظیرے کو پریم چند کے ناول گئودان کی دھنیا کی طرح پیش کیا ہے اور ایک بدصورت انسان میں حسن پیدا کر دیا اور بدکردار میں بھی بڑا کردار پیدا کر دیا ۔نظیرے دلاّ ہے جس کو گل بانو پہلے پسند نہیں کرتی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ اس کو پسند کرنے لگتی ہے۔اس کی وجہ نظیرے کے اندر پایا جانا والا قومی جذبہ اور احساس زندگی ہے۔

''اس نے پھر نظیرے کی طرف دیکھا اور نظیرے کی آنکھیں گل بانو کو بہت معصوم نظر آئیں ۔نظیرے کے ہونٹ سیاہ اور خشک تھے ۔آنکھیں چھوٹی تھیں مگر یہ آنکھیں مختلف موقعوں پر گل بانو کو حیران کر جاتی تھیں ۔'' (ص:۲۰۹)

ایک وقت ایسا بھی ناول میں آتا ہے جب یہ کردار سپرا اور گل بانو دونوں پر غالب آ جاتا ہے۔یہ کردار موت اور زندگی کے درمیان کی کڑی بن جاتا ہے ۔ایسا لگتا ہے جیسے نظیرے ایک پوری ملت کو تاریکی سے روشنی کی طرف اس طرح لا رہا ہے جیسے ناخدا طوفان سے کشتی نکال کر لاتا ہے۔کبھی موقع ملا تو میں اس ناول کے صرف کرداروں پر بات کروں گا اور تب نظیرے پر کھل کر استدلال کے ساتھ گفتگو کی جائے گی۔

ناول مردہ خانہ میں عورت کا بیانیہ سپاٹ اور سادہ نہیں ہے بلکہ پیچیدہ ہے اور داستانی رنگ لیے ہوئے ہے۔ کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم طلسمی دنیا میں داخل ہو گئے ہیں۔ ناول انتہائی فلسفیانہ انداز میں آگے بڑھتا ہے۔ یہ ایک ایسا بیانیہ ہے جو قاری کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ اس پس منظر میں ناول کا آغاز دیکھئے کس انداز سے ہوتا ہے

''وہ ان پراسرار وادیوں میں کب سے ہے؟

اس نے سوچا، مگر اس کا کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

اس نے سوچا، کیا آفتاب سچ مچ طلوع ہوتا ہے؟ غروب ہوتا ہے؟ سمندروں سے موجیں اٹھتی ہیں؟ اس نے پہاڑ کے شگاف سے اٹھنے والے آتش فشاں کو دیکھا۔ اور اس وقت وہ دشت لایعنیت کے صحرا میں تھا ۔۔۔ اور ایک زندہ انگلی اس کے لیے قطب نما تھی جو اسے راستہ بتا رہی تھی۔ اس نے ایک قحبہ خانے کو دیکھا، دھول مٹی کی سڑک کو۔۔ اور ایک خاص بو کو محسوس کیا جو شمال سے ہوتی ہوئی چاروں سمت پھیل رہی تھی۔'' (ص:۱۰۸/)

ناول کا ایک اور اقتباس ملاحظہ کریں

''ہر کمرے میں دیوار پر گھڑیاں سجی تھیں۔ وقت رک گیا تھا، اس لیے گھڑیاں بھی رکی پڑی تھیں۔ مردوں کو وقت سے کیا کام۔ وقت سے کام تو زندوں کو ہوتا ہے۔'' (ص:۲۴/)

ایک اقتباس اور ملاحظہ کریں:

''مسیح سپرا کا لہجہ اس بار تلخ تھا۔ چیل اڑ رہی ہے۔ سامنے عقاب دیکھ رہا ہے۔ گدھ منڈرا رہے ہیں۔ اگر سچ مچ ایسا ہے تو آپ اسے کیا کہیں گے؟ میں دیکھ رہا ہوں اور اس لیے میں مطمئن ہوں۔ آسمان گدھوں سے بھر گیا ہے۔۔۔'' (ص:۹۴/)

اور اس قسم کے کئی اقتباس پیش کیے جا سکتے ہیں جو بیانیہ کا خوبصورت جز ہیں۔ اس میں جو تاریخی حقائق پیش کیے گئے ہیں اور جس

> اس نے سوچا، کیا آفتاب سچ مچ طلوع ہوتا ہے؟ غروب ہوتا ہے؟ سمندروں سے موجیں اٹھتی ہیں؟ اس نے پہاڑ کے شگاف سے اٹھنے والے آتش فشاں کو دیکھا۔ اور اس وقت وہ دشت لایعنیت کے صحرا میں تھا ۔۔۔ اور ایک زندہ انگلی اس کے لیے قطب نما تھی جو اسے راستہ بتا رہی تھی۔ اس نے ایک قحبہ خانے کو دیکھا، دھول مٹی کی سڑک کو ۔۔ اور ایک خاص بو کو محسوس کیا جو شمال سے ہوتی ہوئی چاروں سمت پھیل رہی تھی۔''

خوبصورتی کے ساتھ واقعہ کربلا اور اس قسم کے دوسرے واقعہ کو پیش کیا گیا ہے اس سے بھی ناول نگار اور ناول کو مضبوط کرتے ہیں۔

اب ناول میں پیش کیے گئے خوبصورت استعاراتی نظام پر بات کرتے ہیں۔ اس میں گدھ کا کئی مرتبہ ذکر آیا ہے۔ گدھ موت کا استعارہ ہے۔ گدھ عام طور پر وہیں پائے جاتے ہیں جہاں لاشیں ہوتی ہیں، مردے ہوتے ہیں۔ یا جہاں مردگی پائی جا رہی ہو۔

''مجھے یاد ہے کہ بچپن میں کئی مرتبہ ایسا دیکھنے میں آیا کہ اگر کوئی کمزور جانور ہے اور وہ مرنے کے قریب ہے تو گدھ اس کے چاروں جانب منڈلانے لگتا ہے یا پھر وہ کسی بلندی پر بیٹھ کر اس کے مرنے کا انتظار کرتا ہے اور جب وہ مر جاتا ہے تو اس کا لقمہ بنایا جاتا ہے۔

''کیا سرحد پار گدھ اڑ گئے۔۔۔

گدھ ہر جگہ ہیں۔۔۔'' (ص)

اس حوالہ سے ایک اقتباس اور ملاحظہ کریں

''سپرا کو حیرانی ہوئی کہ وہ اکیلا نہیں تھا، جس نے مینار پر گدھ دیکھا تھا۔

گدھ کہاں چلا گیا؟ گل بانو نے پوچھا

ایک پولیس نے والے نے بتایا کہ ایک بار ایک گدھ غلطی سے کھلے دروازے ہو کر اس کے گھر کے اندر آ گیا تھا۔

کیا گدھ مینارے سے اڑ کر عمارت کے اندر آ سکتے ہیں؟

کیوں نہیں۔ پولیس والے کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ گدھ کچھ بھی کر سکتے ہیں ۔۔ اور اب ہمیں چلنا چاہئے۔'' (ص:۵۱۰/تا ۵۱۱)

راقم نے پروفیسر محمد حسن کا لکھا ہوا ڈرامہ ضحاک ایم اے سال اول میں پڑھا تھا چنانچہ اس ناول میں اس کا ذکر دیکھ کر اچھا بھی لگا اور یہ بھی اندازہ ہوا کہ ضحاک اور اس کے دوسانپوں کا استعمال کس طرح اور کیسے ہر عہد میں کیا جا سکتا ہے۔ ناول نگار نے اپنے قاری کے لیے پہلے مختصر انداز میں اس کا قصہ کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

ایرانی بادشاہت کے اوائل میں ایک بادشاہ ضحاک تھا۔اس کے کندھے پر ہر وقت دو پالتو سانپ ہوا کرتے تھے ۔ یہ سانپ انسانی مغز کھاتے تھے ۔ان سانپوں کے لیے روزانہ کئی انسانوں کی قربانی دی جاتی تھی ۔ وہیں دارالخلافہ میں کاوہ نامی ایک آہن گر تھا۔اس کے دو بیٹے تھے ۔ایک بیٹا سانپ کی خوراک بن چکا تھا جب دوسرے بیٹے کی باری آئی تو کاوہ نے ضحاک پر حملہ کر دیا اور ضحاک مارا گیا ۔''(ص:۳۷۵)

اس مختصر سے قصہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ضحاک کیا ہے لیکن اپنے بیانیہ میں جس استعاراتی طور پر ناول نگار نے جس پس منظر میں اس کو شامل کیا ہے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے ۔سانپوں کا انسانوں کا مغز کھانا اور پھر اسی وجہ سے بادشاہ کا قتل ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو بھی اس قسم کی حرکت کرے گا اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔

اسی طرح ناول میں کئی طرح کی علامتیں بھی خوبصورت اور معنی خیز انداز میں پیش کی گئی ہیں ۔ناول نگار نے ایک جگہ جی بی روڈ کا ذکر کیا ہے جہاں نور جہاں اور اس کی انقلابی بیٹی گل بانو ہے ۔اس قحبہ خانہ یا چکلہ خانہ کو ناول نگار نے جس علامتی انداز میں پیش کیا ہے وہ ملاحظہ کریں

''اچانک اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو گل بانو کو محسوس ہوا وہ ایک طلسم خانے سے نکل کر ایک ایسی دنیا میں آ گئی ہے جہاں دور تک گوشت کی بدبو پھیلی ہے اور اس بدبو میں پھول والوں کے پھولوں کی خوشبو گھٹ کر رہ گئی ہے ۔اب وہ ایک کٹھ پتلی کی طرح اماں کے ساتھ ساتھ انگلیاں تھامے چل رہی تھی ۔''(۱۸۰)

گوشت ، بدبو اور پھول اور خوشبو یہ سب کس چیز کی علامت ہے اور ناول نگار کیا کہنا چاہتا ہے بہت واضح ہے ۔معروف ترقی پسند ادیب و ناقد پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنے ایک سفر نامہ ''سفر ہے شرط'' میں ممتاز

اس مختصر سے قصہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ضحاک کیا ہے لیکن اپنے بیانیہ میں جس استعاراتی طور پر ناول نگار نے جس پس منظر میں اس کو شامل کیا ہے اس کا جائزہ لینا ضروری ہے ۔سانپوں کا انسانوں کا مغز کھانا اور پھر اسی وجہ سے بادشاہ کا قتل ہونا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو بھی اس قسم کی حرکت کرے گا اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔

ترقی پسند ادیب و ناقد پروفیسر قمر رئیس کے لیے لکھا ہے کہ انھیں کچا گوشت بہت پسند ہے ۔پہلے راقم کا اس کا علم نہیں تھا کہ کس معنی میں یہ بات کہی جا رہی ہے لیکن معلوم کرنے پر پتہ چلا معاملہ کیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کے یہاں پیش کی جانے والی علامتیں قطعی طور پر ایسی نہیں ہیں کہ جہاں تک قاری کی رسائی نہ ہو یا اس کی گرفت سے کوئی بات باہر ہو۔ایک زمانہ دور جدیدیت میں ضرور گزرا ہے کہ جب شعوری طور پر کچھ اس انداز کی علامتیں پیش کی جاتی تھیں کہ عام قاری تو دور خاص قاری بھی حیران و پریشان ہو جاتا تھا۔دلچسپ یہ کہ اس کو ہی ادب تصور کیا جانے لگا تھا۔یعنی کوئی علامت اگر آسان ہے تو وہ ادب کمزور ہے ،ان کے نزدیک پیچیدگی بہت ضروری ہے ۔یہ بالکل ایسا ہی کچھ فیشن ہو گیا تھا کہ جیسے ہم انگریزی بولنے والے کو پڑھا لکھا تصور کرتے ہیں خواہ وہ برطانوی غلام ہی کیوں نہ ہو۔ایک اقتباس اور ملاحظہ کریں

''ایک بڑا سا کمرہ ہے ، جہاں دونوں صوفے پر بیٹھے ہیں ۔دیوار پر ایک پینٹنگ ہے جس میں درخت کی شاخ پر دو کبوتر خاموش بیٹھے ہیں ۔پینٹنگ کے قریب ہی ایک کھڑکی ہے ۔ریحانہ اس وقت کھڑکی کے باہر دیکھ رہی ہے ۔سپرا اس کی کشمکش کو پڑھ سکتا ہے ۔''(ص :۱۱۹)

ناول ''مردہ خانہ میں عورت'' میں ایک پورا بھرپور مقالہ صرف وصرف علامت نگار اور استعاراتی نظام پر قلم بند کیا جا سکتا ہے ۔راقم کو یقین ہے کہ مستقبل میں ضرور لوگ اس جانب توجہ دیں گے ۔

زیر مطالعہ ناول میں جو تاریخی حوالے پیش کیے ہیں ان کا بھی ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے ناول کا پلاٹ کمزور نہیں بلکہ مضبوط ہوتا ہے اور اس کا دائرہ بھی بہت وسیع ہو جاتا ہے۔

''مسیح سپرا کے اندر بے چینی تھی ۔ اسے محسوس ہوا قدم شل ہیں اور ایک تیز آندھی

اسے قوم عاد کی کے قریب لے گئی ہے ۔قوم عاد کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی تو اللہ نے قحط بھیجا۔۔وہ سارا غلہ کھا گئے ۔سانپ بلی کھا گئے اور جب کچھ کھانے کو نہ بچا تو فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے ۔۔۔اور پھر ان کا وفد حضرت ہودؑ سے ملا اور کہا اپنے رب سے کہو ہمارے لیے پانی برسائے ۔۔۔۔اور اللہ نے جواب میں ہود کو تین بادلوں میں سے ایک کے انتخاب کا کام سونپا ۔سفید بادل ، سرخ بادل ۔سیاہ بادل ۔قوم عاد نے سیاہ بادل کا انتخاب کیا ۔۔۔اور سیاہ بادلوں کے عذاب میں قوم عاد کو نافرمانی کی سزا مل گئی ۔۔‘‘(ص:۳۲۵ر)

ناول نگار اچانک تاریخ سے عصر حاضر میں آ جاتا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آخر اس نے تاریخی کا سہارا کیوں لیا اور دو چار قدم نہیں بلکہ ہزاروں سال پیچھے جا کر ناول نگار مستقبل کے لیے کتنی بڑی چھلانگ لگانا چاہتا ہے ۔اس طرح ناول میں واقعہ کربلا بھی در آتا ہے اور کربلا لانے کا مطلب کیا ہے یہ شاید بتانے کی ضرورت نہیں ہے جہاں لاشیں ہی لاشیں اور حق و باطل کی جنگ ہے۔

ناول مردہ خانہ میں عورت فلیش بیک کے ساتھ ساتھ فلیش فارورڈ میں بھی چلتا ہے کیونکہ اس میں سی اے اے کے نفاذ کا ذکر کھل کر کیا گیا ہے ۔سی اے اے قانون پاس ضرور ہو گیا ہے اور اس کے خلاف آواز بھی بلند کی جا رہی ہے لیکن ابھی اس کا نفاذ نہیں ہوا ہے جبکہ ناول مردہ خانہ میں عورت میں اس کے نفاذ کو لایعنیت کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ ڈیٹینشن کیمپ کی سختیاں، گیس چیمبر ، لوگوں کی موت وغیرہ کو اس میں پیش کیا گیا ہے ۔زمانی اعتبار سے یہ آج کا ناول ہے اور مکانی اعتبار سے یہ ہندوستان اور بالخصوص قومی راجدھانی دہلی کا ناول ہے کیونکہ میں انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، گریٹر نوئیڈا، دہلی ، شاہین باغ ، پرانی دہلی، جامع مسجد اور بہت کچھ آ جاتا ہے۔ آخر میں اس پر بات کرنا لازمی ہو جاتا ہے کہ ساڑھے پانچ سو صفحات پر پھیلا ناول کہاں منتج

ناول نگار اچانک تاریخ سے عصر حاضر میں آ جاتا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ آخر اس نے تاریخی کا سہارا کیوں لیا اور دو چار قدم نہیں بلکہ ہزاروں سال پیچھے جا کر ناول نگار مستقبل کے لیے کتنی بڑی چھلانگ لگانا چاہتا ہے ۔اس طرح ناول میں واقعہ کربلا بھی در آتا ہے اور کربلا لانے کا مطلب کیا ہے یہ شاید بتانے کی ضرورت نہیں ہے جہاں لاشیں ہی لاشیں اور حق و باطل کی جنگ ہے۔

ہوتا ہے؟ کیا یہ ناول واقعی ناول بنا ؟ اس پر یقیناً ممتاز فکشن نقاد بات کریں گے لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ ایک بھرپور ناول ہے جو قاری کو لایعنیت کے صحرا میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے ۔آخر میں جب مقدمہ دونوں کے حق میں آتا ہے اور دونوں آزاد ہو جاتے ہیں ۔اس کے سپرا اور گل بانو کے مکالمے قاری کو لایعنیت کے صحرا کی طرف لے جاتے ہیں اور پھر ایک بھٹکاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے اور یہی بھٹکاؤ اس تحریری سفر کو ناول بناتا ہے۔

’مردہ خانہ میں عورت‘ کی ایک بات جو کھٹکتی ہے ۔مشرف عالم ذوقی کے دوسرے ناولوں میں بھی یہ چیز ہے ۔بات یہ ہے کہ ناول کے جو عنوانات طے کیے جاتے ہیں ان کا کیا مقصد ہوتا ہے؟ بالکل کسی پی ایچ ڈی کی تھیسس کی طرح عنوان طے کر دیے جاتے ہیں ۔مردہ خانہ میں عورت میں بھی ۶ر عنوان قائم کیے گئے ہیں اور اس کے بعد مقدمہ، ہائی کورٹ ، فیصلہ وغیرہ بھی دیا گیا۔راقم کا خیال ہے کہ ان عنوانات کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔قاری کو اگر ناول پسند آ گیا اور ناول اگر قاری کو گرفت میں لے لیتا ہے تو پھر عنوان اس کے لیے بے معنی ہو جاتے ہیں ۔راقم کے ساتھ بھی یہی ہوا ۔ مجھے عنوان قطعی یاد نہیں ہیں لیکن کردار یاد ہیں ۔موضوع یاد ہے ۔ واقعات ذہن میں ہیں ۔ دوسری بات یہ ہے کہ کہیں کہیں اس میں لفظوں کی تکرار کا گمان ہوتا ہے ۔کئی مرتبہ ایسا لگتا ہے جیسے جو باتیں ہم پڑھ رہے ہیں وہ پہلے بھی پڑھ چکے ہیں ۔محسن خاں کا ناول ’’اللہ میاں کا کارخانہ‘‘ بہت اچھا اور سادہ ناول ہے لیکن نہ جانے کیوں اس میں بیس کیپشن درج کر دیے گئے اور ۲۰ر صفحات کا غیر ضروری طور پر اضافہ کر دیا گیا جس کی کوئی ضرورت نہیں تھی ۔میرے خیال سے ناول کو ناول رہنے دینا چاہئے اور اس کو مضامین یا افسانوی مجموعہ نہیں بنانا چاہئے۔

☆☆☆☆

سیفی سرونجی
سہ ماہی 'انتساب عالمی'، سرونج، مدھیہ پردیش
Mob:9425641777

انسانی عظمتوں کو چھوتا ہوا فنکار: انجم عثمانی

انجم عثمانی اردو افسانے کا وہ معتبر نام ہے، جو ایک ایسے اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوئے کہ جن کے آباء واجداد نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی، ان کے والد، دادا، چچا اور دیگر خاندان کے تمام حضرات علم وادب کے میدان کے شہسوار تھے۔ کئی کئی کتابوں کے مصنف کے ساتھ ساتھ دین اسلام کے شیدا رہے ہیں۔ ایسے خاندان اور علم وادب کے ماحول میں پرورش پانے والے انجم عثمانی نے جب ادب کی دنیا میں قدم رکھا تو وہ تمام خصوصیات ان کی تحریروں میں موجود تھیں جو کہ انھیں وراثت میں ملی تھیں یعنی اخلاق وکردار کی عظمت کا احترام۔ یوں تو انجم عثمانی اپنے پہلے افسانوی مجموعہ ''شب آشنا'' سے ہی ادبی دنیا میں مقبول ہو چکے تھے، اس کے بعد دوسرا افسانوی مجموعہ ''سفر در سفر'' اور ''ٹھہرے ہوئے لوگ'' تک آتے آتے ہندوستان کے بہترین معتبر افسانہ نگاروں میں شمار کئے جانے لگے، ان کے افسانے کے ذکر کے بغیر افسانے پر لکھنا گویا اپنی کم علمی کا ثبوت دینا ہوگا اور پھر یہی نہیں کہ صرف افسانے لکھے ہوں، انجم عثمانی نے ٹیلی ویژن نشریات سے متعلق کتاب لکھ کر تو اپنی دھاک ایسی بٹھائی کہ سارا زمانہ ان کی علمیت کا قائل ہوگیا۔ ''کہیں کچھ کھو گیا ہے'' ان کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے، جو آٹھ دس سال کے بعد شائع ہوا۔ اس میں کل بارہ افسانے شامل ہیں۔ اغوا، صدقہ، بک شلف، جنگل، ڈھلواں چٹان پر لیٹا ہوا آدمی، وغیرہ یہ تمام افسانے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ ایک ڈرامہ ''زنجیر کا نغمہ'' بھی شامل ہے کہیں کچھ کھو گیا ہے میں۔ سب سے اہم اور معلوماتی مضمون انجم عثمانی کے خاندانی حالات ہیں۔ جنھیں پڑھ کر قاری کی آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں کہ انجم عثمانی ایسے اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوئے کہ جن کی علم وادب کے میدان میں اتنی خدمات ہیں کہ وہ کچھ بھی نہ لکھتے تو ان کی عزت مرتبہ صرف اس اعلیٰ خاندان میں پرورش کی وجہ سے ہی قائم رہتا۔ انجم عثمانی کی کہانیوں میں یہی رکھ رکھاؤ ہر جگہ ملے گا، انہیں زبان پر بھی اسی وجہ سے عبور حاسل ہے۔ ''کہیں کچھ کھو گیا ہے'' میں پہلی کہانی اغوا ہی کو لے لیجئے جس میں مسز کاظمی جو ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، جب وہ دلہن بن کر مسٹر کاظمی کے خاندان، ان کے رہن سہن اور بناوٹی زندگی میں رچ بس گئیں، اس لئے کہ مسٹر کاظمی ایک مالدار شخصیت تھے۔ جہاں عیش وآرام کی ہر چیز انہیں میسر تھی، مسز کاظمی بھی ان کے ساتھ دن رات دعوتیں کرنا، آئے دن پارٹیوں میں شرکت کرنا ان کا مشغلہ تھا، کہانی کا یہ اقتباس دیکھئے:

> ''مسٹر کاظمی شروع سے ایسی نہ تھیں بلکہ وہ تو ایسے خاندان سے تھیں، جنہیں جہیز میں دیگر چیزوں کے ساتھ دعائیں اور بہشتی زیور بھی ضرور دیا جاتا تھا، جسے کہیں رکھ کر وہ کب کی بھول چکی تھیں اور اب تو شاید یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ گھر کے کس کونے میں رکھا ہے، حالانکہ وہ گھر کو سجانے میں کافی سلیقہ مند مشہور تھیں، سلیقہ مند نہ ہوتیں تو ہمہ وقت مسابقت کے اس ماحول میں ایسی نمایاں جگہ کیسے بنا پاتیں کہ ہر قسم کے دولت مند ان کے گرد منڈلاتے رہتے، یہی وجہ تھی کہ علاقہ کا شاید ہی کوئی ایسا بارسوخ شخص ہوگا جو مسز کاظمی کو دلاسا دینے اور ہمت بندھانے نہ آیا ہو۔''

اس اقتباس سے انجم عثمانی کی زبان دانی اور خاندانی وقار کے رکھ رکھاؤ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب مسٹر کاظمی کے جہاز کے اغوا ہونے کی

خبر پھیلی تو دلاسا دینے والے بڑے لوگوں کا تانتا بندھ گیا اور مسز کاظمی ان میں گھری اپنی ساری خاندانی روایتوں کو نظر انداز کر کے ہمارے دیش کے نیتاؤں کی طرح جھوٹی انا اور دکھاوے اور جھوٹی شان میں گم ہیں۔ دوسرے دن جب مسٹر کاظمی جہاز کے تمام مسافروں کے ساتھ خیریت سے آ گئے تو پوری تفصیل اخبارات میں مسٹر کاظمی کے بیان کے ساتھ شائع ہوئیلیکن کاشانہ مکینوں کے دلوں سے جو کچھ پہلے غائب ہو چکا تھا، اس کا کہیں تذکرہ نہ تھا۔

انجم عثمانی کی دوسری کہانی ''صدقہ'' ہے جس میں عبدالقدیر کی ماں ہے، جو کئی دنوں سے بستر مرگ پر جاں کنی کی حالت میں دراز ہے۔ بہت علاج کے بعد بھی کوئی افاقہ نہیں ہوتا، عبدالقدیر نے اپنی بیوی کو اپنی ماں کی خدمت پر مامور کر دیا۔ فالج زدہ ہونے کی وجہ سے ماں کی حالت بہت خراب ہے۔ گھر کی حالت بھی اچھی نہیں ہے۔ پھر بھی وہ اپنی ماں کے علاج میں کوئی غفلت نہیں برتتا اور دن رات خدمت کرتا ہے۔ ڈاکٹر حکیم سب جواب دے چکے ہیں۔ ماں کی تکلیف اس سے دیکھی نہیں جاتی۔ آخر میں ہر جگہ سے مایوس ہو کر امام صاحب کے پاس جاتا ہے کہ کچھ دعا کریں۔ امام صاحب بہت شفقت سے پیش آتے ہیں اور اسے مشورہ دیتے ہیں کہ وہ صدقہ کرے۔ صدقہ سے بڑی بڑی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ وہ چند سو روپئے کر کے صدقہ کیلئے ایک بکری خریدنے کے لئے جاتا ہے۔ پھر اسے خیال آتا ہے کہ شرفو گڈریا کے پاس بہت بکریاں تھیں جسے اس نے چراتے ہوئے دیکھا تھا۔ برسوں بعد جب وہ بکری لینے کی نیت سے شرفو گڈریے کے چھپر کے پاس پہنچا تو اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ اس نے اندر دیکھا تو ایک بوڑھا بہت بری حالت میں اکیلا بیمار بستر پر پڑا ہے۔ وہ گڈریے کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ چند سال پہلے وہ کتنا صحت مند تھا اور بکریوں کے پیچھے پیچھے بھاگتا پھرتا تھا۔ اب بستر مرگ پر پڑا موت کے انتظار میں سانس گن رہا ہے۔ کوئی حال پوچھنے والا نہیں ہے۔ اس کا دل بھر آیا، اس کی یہ درد بھری کیفیت اور اداس آنکھیں دیکھ کر خاموشی سے اپنے پرانے کوٹ سے صدقہ کی رقم نکالی اور اس کے سرہانے رکھ دی۔ گڈریے کی آنکھیں تشکر سے بھیگ گئیں۔

عبدالقدیر گھر پہنچا تو ماں آرام کی نیند سو چکی تھی، انجم عثمانی کی یہ کہانی پڑھ کر قاری کی آنکھیں بھی نم ہو جاتی ہیں۔ واقعی ایسی کہانی ایک دردمند دل ایک حساس فنکار ہی لکھ سکتا ہے۔ کہانی مختصر ہوتے ہوئے بھی دل پر اثر کرتی ہے۔

انجم عثمانی کی ایک اور بہت خوبصورت کہانی ''ڈھلواں چٹان پر لیٹا ہوا آدمی'' ہے۔ اس کہانی میں کار میں بیٹھی ایک فیملی ہے، جس میں پانچ چھ لوگ ہیں، ایک پچاس سال کا شخص اس کی بیوی اور اسی کے قریب اس کا بزرگ باپ۔ اس کی چار سال کی نواسی۔ اکثر بچوں میں سوال کرنے کی عادت ہوتی ہے اور ہر بات کی تہہ میں جانے کی جستجو، چار سال کی بچی بار بار اپنے نانا سے پوچھتی ہے کہ ''نانا! ہم نے وہ بھوت والی بیری تو دیکھی ہی نہیں، وہ بھوت والی بیری جو بڑے نانا نے آپ کو بتایا تھا۔'' یوں تو یہ کہانی کار میں ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن چار سال کی بچی نے بار بار اپنا سوال دہرا کر ایک اسّی پچاسی سال کے بوڑھے کو اپنی پوری زندگی کی کہانی یاد آ گئی۔ اور وہ سارے مناظر جب قصبے میں وہ بھوت والا بیری کا پیڑ مشہور ہوا، قصبے میں ایک کنواں تھا۔ جو ہینڈ پمپ لگنے کی وجہ سے ویران ہو گیا تھا۔ کئی بار حادثے ہوتے ہوئے لوگ بچ گئے تھے۔ بہت لوگ کہتے تو رہے کہ کنواں مٹی سے پاٹ دیں لیکن کوئی آگے بڑھ کر کام شروع نہیں کرتا تھا لیکن اسی قصبے میں ایک بی اماں رہتی ہیں۔ جو پورے محلے کے دکھ درد میں کام آتی تھیں۔ ہر وقت خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار، بھلا وہ کیسے دوسروں کو تکلیف میں دیکھتیں، اتفاق سے اسی درمیان ایک بچہ کنویں میں گر کر ہلاک ہو گیا۔ پھر تو بی اماں آئیں اور اکیلے ہی گینتی پھاوڑا لے کر کنویں کو پاٹنا شروع کر دیا۔ محلے والوں کو بھی غیرت آئی۔ سب نے مل کر ایک ہی دن میں کنویں کو بھر دیا لیکن اسی رات کو بی امّاں کا انتقال ہو گیا۔ پھر تو پورے قصبے میں یہ مشہور ہو گیا کہ بیری والے بھوت نے بی اماں کی جان لے لی اس طرح انجم عثمانی کی یہ کہانی توہم پرستی اور انسانیت کے تقاضوں کی کشمکش سے بھری ہے۔ انجم

عثمانی کی کہانیوں کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان کی ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی کردار ایسا ضرور ہوتا ہے جو انسانی عظمتوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ اس کہانی میں بھی بی اماں کا کردار انسانیت ہمدردی اور خدمت خلق کے جذبوں کو ابھارنے والا کردار ہے۔ اسی طرح ہر کہانی میں کوئی نہ کوئی کردار کسی نہ کسی پہلو سے ہمیں گہری سوچ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہاں بی اماں کے کردار کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں:

''اماں بی بڑی ہمت کی سلیقہ مند اور باذوق خاتون تھیں، پورے محلے کے بچوں کو مفت پڑھاتی تھیں، اپنے بڑے سے گھر میں غیر رسمی مدرسہ کھول رکھا تھا۔ پردہ نشیں خاتون تھیں مگر بہت باخبر تھیں۔ ان کی ذہانت اور شرافت سے ان کی سادگی کے باوجود لوگ بہت متاثر تھے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے وہ بہت سوشل تھیں۔ ہر اجتماعی بہبود کے کام میں پیش پیش رہتیں۔ کوئی بیمار ہو تو اماں بی اپنا لمبا سا سفید چوغہ سر پر ڈال تیمارداری کے لئے نکل کھڑی ہوتیں۔ کسی کا قرض ادا کر رہی ہیں، کسی جھگڑے کا فیصلہ کر رہی ہیں، کسی کے لئے خط لکھ رہی ہیں، تو کسی کو گھر چلانا سکھا رہی ہیں اور یہ سب کچھ ذاتی مفاد کے لئے نہیں بلکہ ثواب کی نیت سے اور اپنے وقت کے صحیح استعمال کے لئے کرتی تھیں۔''

بلاشبہ ایسی کہانیاں صرف وہی فنکار لکھ سکتا ہے جس کے دل میں انسانیت کی تڑپ ہو اور یہ تمام خصوصیات انجم عثمانی کی کہانیوں میں موجود ہیں۔ یہ تمام خصوصیات انجم عثمانی کو وراثت میں ملی ہیں۔ جو ان کی کہانیوں میں ان کے کردار میں بھی روشن ہیں۔

ہر فنکار کی شخصیت اس کے فن میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طریقے سے آ کر رہتی ہے۔ اس کے اخلاق کردار اور اس کے خاندان کی وضع داری وغیرہ، اگر وہ افسانہ نگار ہے واس کے کرداروں میں یہ سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ انشائیہ نگار ہے تو اس کی تحریر کے الگ الگ لفظ میں تازگی کے ساتھ ساتھ اس کے کردار کی کچھ نہ کچھ جھلکیاں ضرور دکھائی دیں گی۔ اگر شاعر ہے تو شاعری میں بھی انجم عثمانی چونکہ ایک اعلیٰ علمی خاندان کے چشم و چراغ ہیں، والد، چچا، بھائی اور خاندان کے دیگر افراد بھی نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں بلکہ کئی تو مشہور عالم، فاضل شخصیات ہیں۔ ظاہر ہے کہ انجم عثمانی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ ایسا ادبی ماحول تھا کہ جس پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انجم عثمانی کی کہانیوں میں انسانیت، ہمدردی، کرداروں میں وضع داری نمایاں ہے۔ فنکار تو کئی مشہور ہوئے ہیں لیکن ہر دل عزیزی سب کو حاصل نہیں ہوتی۔ شہرت کے ساتھ ہر دل عزیزی جن فنکاروں کو نصیب ہوئی ہے ان میں انجم عثمانی کا نام نمایاں ہے۔ جس شخص سے لوگ ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں، جسے دل سے چاہتے ہیں، اس کی چیزوں کو بھی سمیٹ سمیٹ کر رکھتے ہیں۔ انجم عثمانی سب کے چہیتے فنکار تھے۔ ان کی شخصیت کے پہلو ایسے ہیں کہ جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ میں نے جب ان کی بغیر اجازت کے 'انتساب عالمی' کا مختصر گوشہ ان پر شائع کیا تو پورے ادبی حلقے میں اس کی پذیرائی ہوئی اور ساتھ میں شکایتیں بھی۔۔۔۔ فون پر فون آنے لگے کہ خاموشی سے یہ گوشہ کیوں نکالا؟ ہم سے کیوں نہیں کہا؟ خاص طور پر پروفیسر غضنفر، ڈاکٹر خالد محمود، نگار عظیم، مشرف عالم ذوقی، پروفیسر شہزاد انجم، اقبال مسعود اور کئی معتبر شاعروں، ادیبوں نے خوشی کا اظہار بھی کیا اور انجم عثمانی پر لکھنے کی خواہش بھی کی۔ میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور اعلان کر دیا کہ آپ اپنے مضامین سے نوازیں، میں یہ سب کتابی شکل میں شائع کروں گا اور پھر اللہ کے کرم سے 'انجم عثمانی: شخصیت اور فن' کتاب منظر عام پر آ گئی جس نے بہت مقبولیت حاصل کی، لیکن افسوس انجم عثمانی اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ آج ہم سے شمس الرحمٰن فاروقی، مناظر عاشق ہرگانوی، مشرف عالم ذوقی، افتخار امام صدیقی اور انجم عثمانی جیسے ادیب بچھڑ گئے ہیں جن کی تلافی ممکن نہیں، واقعی انجم عثمانی ایک درخشاں ستارے کا نام تھا، جو اب ٹوٹ چکا ہے!

☆☆☆

نہال جالب
مئوناتھ بھنجن، یوپی
موبائل:9044355382

(نظم)

لاک ڈاؤن

اک وبا سے زندگی بے جان ہے
جیب میں پیسہ نہیں، کیا وہ کریں

کس قدر سہما ہوا انسان ہے
تنگ آ کر بھوک سے، آگے بڑھے

ملک کے حالات ہیں بالکل خراب
اور پیدل گھر کو وہ اپنے چلے

اب کہیں محفوظ کوئی بھی نہیں
راستے میں جانے کتنے خطرے ہیں

لاک ڈاؤن سے تھمی ہے زندگی
سب سے بڑھ کر تو وبا کا خطرہ ہے

بس ٹرینیں، گاڑیاں سب بند ہیں
اک ذرا سی دیر میں مر سکتے ہیں

ہر گلی، ہر کوچہ، ہر بازار میں
وہ اگر رک بھی گئے شہروں میں تو

ناکہ بندی ہے، پولس کا پہرہ ہے
بھوک سے اور پیاس سے مر جائیں گے

گھر میں ہی رہنا ہے سارے لوگوں کو
پھر وبا اور بھوک میں کیا فرق ہے

کوئی بھی گھر سے اگر باہر گیا
دونوں ہی کے دام میں اک موت ہے

آپ اپنی موت سمجھو مر گیا
موت کا آنا بھی تو برحق ہی ہے

اک وبا کا خوف ہے دل میں بسا
اور پھر مفلس کے مرنے پر بھلا

چین سے جینا بھی مشکل ہو گیا
کس کو کوئی فرق پڑتا ہے یہاں

کتنوں کے گھر میں نہیں کھانے کو کچھ
یہ جو مزدوروں کے ہیں کچھ قافلے

کتنے ہی بے گھر پڑے ہیں گلیوں میں
پا پیادہ اپنے ہیں گھر کو چلے

ٹھیلوں اور کھچوں کے نیچے سوتے ہیں
بیوی بچے بھی ہیں ان کے ساتھ میں

کتنے ہی مزدور ہیں ایسے بھی جو
ساتھ جن کے کھانے کا ساماں نہیں

شہر میں آئے تھے روزی کے لیے
طے انھیں کرنا ہے میلوں کا سفر

لاک ڈاؤن سے بہت بے حال ہیں
زندگی تو چار دن کی ہے مگر.....!

ڈاکٹر عبدالحق امام
مرزا پور گورکھپور Mob: 9450878330

رباعیات

بیاد پروفیسر عاشق ہرگانوی

1

افسوس نہیں آج مناظر عاشق
اردو کے تھے سرتاج مناظر عاشق
ہر چیز ادب میں وہ نئی لاتے تھے
پائے تھے وہ معراج مناظر عاشق

2

دنیا پر چھا گئے مناظر عاشق
اک سکہ جما گئے مناظر عاشق
ہر طرح ادب پر وہ رہے چھائے ہوئے
آئنہ دکھا گئے مناظر عاشق

3

تحقیق مناظر ہے بلاغت سے بھری
تخلیق مناظر ہے وضاحت سے بھری
ناول ہو کہ افسانہ نگاری، نظمیں
تصدیق ہے لوگوں کی فصاحت سے بھری

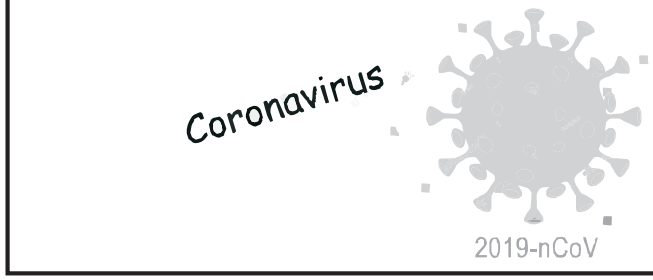
بیاد مولا بخش

صد حیف نہیں رہے یہاں مولا بخش
سب ان کی گناہوں کو خدا دینا بخش
تدریسی فرائض میں ابھی تھے وہ لگے
پر آج زمانے سے گیا پیارا بخش

مصداق اعظمی
پھول پور، مجواں، اعظم گڑھ
Mob: 9451431700

تسلی

ہم سے پہلے بھی کیا کچھ تھا پہلے اس کی فکر کریں
ایسے ایسے لوگوں کی تاریخ کا آؤ ذکر کریں
جن کا مرنا مرنا تھا اور جن کا جینا تھا جینا
اونچے اونچے پربت کا کر دیتے تھے چھلنی سینا
سات سمندر سے گہری بھی گہرائی گہرائی کو ساحل سے
آسانی سے قطرہ قطرہ جوڑ کے ناپا کرتے تھے
تھے اونچی اونچی دیواروں میناروں کے مالک لوگ
اپنے اپنے سر پر رکھی دستاروں کے مالک لوگ
وہ تو گھوڑے ہاتھی والے لشکر لے کر چلتے تھے
سونے کے سکے جن کے اپنی ٹکسال میں ڈھلتے تھے
جن کے راج کی دھرتی میں اگ کے سورج ڈھل جاتا تھا
غصے کی اک آگ سے گیلا موسم بھی جل جاتا تھا
روشن اک اک پل ہوتا تھا جن ایک اشارے پر
جنگل میں منگل ہوتا تھا جن کے ایک اشارے پر
دریاؤں نے رخ موڑا تھا جن کے ایک اشارے پر
صحرہ بھی گلشن ہوتا تھا جن کے ایک اشارے پر
کیا سے کیا کیا ہو جاتا تھا ان کے ایک اشارے پر
مردے بھی زندہ ہوتے تھے جن کے ایک اشارے پر
چلتی تھی جب ایسے ایسے شاہوں اور زرداروں کی
دنیا کے مالک کی مرضی ان پر قدرت رکھتی تھی
اپنی اک اک سانس کا ان کو قرضہ بھرنا پڑتا تھا
پیر پیمبر، رشیوں، منیوں کو بھی مرنا پڑتا تھا



ڈاکٹرسعید گورکھپوری
الٰہی باغ، گورکھپور

سوزِ یادِ رفتگاں

کیالکھیں ہم محسنِ اُردو زباں کے واسطے
حکم پر دو لفظ عظمت نشاں کے واسطے

ہم اثرلائیں کہاں سے ترجماں کے واسطے
لفظ بھی گونگے لگیں قطبِ زماں کے واسطے

وقف اُن کی زیست تھی اردو زباں کے واسطے
ہوگئے قرباں نقوشِ جاوداں کے واسطے

درد بن کر رہ گئی اہلِ جہاں کے واسطے
شکل جو تحریر میں ہے مہرباں کے واسطے

فکر دامن گیر ہے بادِ خزاں کے واسطے
نُطق کو چپ لگ گئی فخرِ زماں کے واسطے

کھودیئے اردو ادب کے مرجعِ دانشوراں
یہ خسارہ تھا بڑا ہندوستاں کے واسطے

موت کی آغوش میں وہ رفتہ رفتہ چل دیئے
کرسکے کچھ بھی نہ ہم اُن قدرداں کے واسطے

چند جملے شان میں ان کی لکھوں تو کچھ نہیں
کام وہ کرتے نہ تھے سود و زیاں کے واسطے

بھید بھاؤ سے نہیں وہ فکر سے زندہ رہیں
قدر سے غافل نہ ہوں اک بدگماں کے واسطے

عمر بھر دیتے رہے امن و اماں کو وہ فروغ
وقف تھے پیہم زمین وآسماں کے واسطے

صبح کی زرّیں کرن بن روشنی دیتے رہے
نقش چھوڑے اپنے مہرِ ضوفشاں کے واسطے

ہر نفَس زندہ رہے خوابِ حسین لے کر سعیدؔ
شعر ہیں کچھ سوزِ یادِ رفتگاں کے واسطے

رینو بہل
1505، سیکٹر 49۔بی۔ چنڈی گڑھ۔
Mob:9781557700

جہانِ نو کی نوید!

ساحل پر چہل قدمی کرتے ایوا کی بات سُن کر کارسن کے بڑھتے قدم وہیں تھم گئے۔ تیکھے لہجے میں نہ صرف اُس کی بات کی مخالفت کی بلکہ اُسے مزید اس پر گفتگو کرنے سے روک دیا۔ ایوا نے حیرت سے اُسے دیکھا۔ پچھلے تین سال سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ تھے اُن کا رشتہ کئی مراحل طے کر کے اب اُس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں وہ دو جسم اک جان ہو گئے تھے۔ وہ اُس کی رگ رگ سے واقف تھی مگر یہ لہجہ، یہ تیور اُس کے لیے نئے تھے۔ ایوا کو تذبذب کی حالت میں دیکھ کر کارسن کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو جھٹ سے اُس نے پیار سے ایوا کا ہاتھ دباتے ہوئے اپنے روٹھنے پر شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے معافی مانگ لی۔

''پہلے یہ بتاؤ تمہیں یہ بات اتنی ناگوار کیوں گزری؟ میں جو کہہ رہی ہوں کسی ثبوت کی بِنا پر ہی کہہ رہی ہوں۔''

''آئی ایم سوری ڈیئر۔ میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا۔''

چلتے چلتے دونوں ساحل کے قریب بنے اوپن کیفے میں جا کر دو کپ کافی کا آرڈر دے کر باہر بچھی نشست پر جا بیٹھے۔ حدِ نظر پھیلا گہرا سمندر، سمندر سے اُچھلتی اٹھکیلیاں کرتی لہروں کا کھیل خاموشی سے دیکھتے رہے۔ شام کے اس پہر جب دور اُفق پر سورج سمندر میں ڈوبنے کو بے تاب ہوتا تو اُسے سُبک خرامی سے پانی میں اپنا وجود چھپاتے دیکھنا اور اُس کے روپوش ہوتے ہی سُرمئی شام کے سائے کا وجود میں آ جانا دونوں کو بہت پسند تھا۔ قدرت کے اس خوبصورت، دلکش منظر کا لطف اک دوسرے کا ہاتھ تھامے خاموشی سے محسوس کرتے تو لہروں کا سنگیت دل و دماغ پر خمار کی کیفیت طاری کر دیتا۔

آج وہی منظر وہی ساتھ تھا مگر لہروں کا سنگیت کارسن کے دل میں طوفان پیدا کر رہا تھا۔ عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔ ایوا سے اس کے بدلے تیور دیکھ کر رہا نہیں گیا۔

''تمہارا تحقیقی کام آخری مرحلے پر ہے اور یہ بات تمہارے تحقیقی موضوع سے جُڑی ہوئی ہے اس لیے چاہتی ہوں کہ تم بھی اس نکتے پر غور فرماؤ۔''

''ٹھیک ہے۔ تم اپنی بات کو دلیل کے ساتھ پیش کرنا پھر دیکھتا ہوں'' اُس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

ایوا نے موسم کا ذکر چھیڑ کر موضوع بدل دیا۔ کافی کا سِپ لیتے مچلتی لہروں پر نظریں جمائے ایوا نے کہا:

''میری جان تم اُداس بالکل اچھے نہیں لگتے۔ تھوڑا سا مسکرا دو۔'' یہ کہتے ہوئے ایوا نے بڑھ کر کارسن کے لب چوم لیے۔ کارسن مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ جلد ہی دوبارہ اُسی جگہ پر ملنے کا وعدہ کر دونوں اپنے اپنے راستے نکل گئے۔

رات بستر پر آنکھیں موندے لیٹا تو ایوا کی کہی باتیں پھر دماغ میں گھومنے لگیں۔ وہ جانتا تھا ایوا کبھی غلط بیانی نہیں کر سکتی وہ ایک اچھی اور سچی

صحافی ہے۔ خوبصورتی سے زیادہ وہ اُس کی ذہانت کا قائل ہے۔ وہ اُس کے تحقیقی کام میں اُس کی مدد کرنا چاہتی ہے۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ اُسے ایوا کی کہی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا شاید اس لیے کہ اُس نے آٹھ دن اُن لوگوں کے بیچ گزارے تھے۔ انہیں بہت قریب سے دیکھا تھا اُن کی زندگی سے جُڑے ہر چھوٹے بڑے مسائل، اُن کا معمول، اُن کی عادات، اُن کی سوچ، اُن کا رہن سہن، کھان پان، اُن کی تہذیب کو سمجھا تھا۔ وہ اللہ کے بندے قدرت کے قریب اپنی الگ ہی دنیا میں مگن ہیں۔ اُن کے لیے زندگی محض جینے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ کھانا پینا ہی زندگی کا مقصد ہے۔ اُس کا تحقیقی کام جس کا موضوع ''امیزون کے قبیلے اور اُن کی ثقافت'' آخری مرحلے پر ہے اور ایوا کی دی ہوئی خبر اُس کی تحقیق کا رُخ بدل سکتی ہے۔

صبح سویرے ہی اپنی بات کی دلیل دیتے ہوئے ایوا نے موبائل پر اُسے چند تصویریں بھیجیں۔ اُس نے تصویروں کو بڑا کر کے ہر زاویے سے دیکھا۔ ٹرک مردہ جسموں سے بھرا تھا۔ ایک کے اوپر بے جان جسم ایسے لدے پڑے تھے جیسے لکڑی کی شہتیریں۔ تصویر سے مقصد تو ظاہر نہیں ہوتا تھا مگر انسانیت کے زوال کا کھُلم کھلا اعلان ضرور نظر آ رہا تھا۔ انسان کی موت جانوروں سے بھی بدتر ہوگی ہے کیا؟ اتنی بے ادبی، اتنی بے حرمتی؟ تصویر نے اُسے اندر تک جھنجھوڑ دیا۔ تصویروں کے ساتھ ایوا نے میسج میں لکھا تھا:

''تمہیں حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں۔ شام کو ساحل پر ملیں گے تو تفصیل سے بات ہوگی۔''

یہ تو اُس نے اپنی تحقیق میں ثابت کر دیا تھا کہ قبائلی آدم خور ہیں۔ آدم خور ہونے کا اعتراف تو خود کیڈی نے بھی کیا تھا اور اس کا ثبوت اس نے اپنے گھر میں سجا کر رکھی کھوپڑیوں سے دیا تھا مگر آدمی کو مار کر کھانے کی اُن کی وجوہات مختلف ہیں۔ وہ

یہ تو اُس نے اپنی تحقیق میں ثابت کر دیا تھا کہ قبائلی آدم خور ہیں۔ آدم خور ہونے کا اعتراف تو خود کیڈی نے بھی کیا تھا اور اس کا ثبوت اس نے اپنے گھر میں سجا کر رکھی کھوپڑیوں سے دیا تھا مگر آدمی کو مار کر کھانے کی اُن کی وجوہات مختلف ہیں۔ وہ آدمی میں چھپے جن کو مارتے ہیں آدمی کو نہیں۔

آدمی میں چھپے جن کو مارتے ہیں آدمی کو نہیں۔

70,00,000 کلومیٹر کے رقبے میں پھیلا امیزون کا جنگل دنیا کا سب سے بڑا، گھنا اور گرم جنگل ہے جہاں کثرت سے بارش ہوتی ہے۔ تقریباً چار سو مختلف قبیلے اس جنگل میں رہائش پذیر ہیں۔ ہزاروں ندیاں اس کے بیچ سے گزرتی ہیں۔ کتنے ہی ارب شجر اور ہزاروں کی تعداد میں نوع (Species) یہاں موجود ہیں۔ دنیا کے نو ملک اس سے اپنی سرحد سانجھی کرتے ہیں مگر سب سے زیادہ حصہ برازیل کا ہے۔

کارسن کا جگری دوست اولور جو کہ وائلڈ لائف فوٹو گرافر بھی ہے اُس کے ساتھ چلنے کو راضی ہو گیا۔ جنوری کے مہینے میں وہ برازیل کے راستے امیزون کے جنگلوں میں داخل ہوئے تھے۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ اس مہینے بارشیں جم کر ہوتی ہیں۔ ندیاں لبالب بھری رہتی ہیں اور ایک سے دوسری جگہ کشتی میں جانا آسان ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ موسم کی پوری تیاری کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔

برازیل پہنچ کے ہیلی کاپٹر سے جنگل کے لیے روانہ ہونے سے پہلے گائیڈ پارکر اُن کا منتظر تھا۔ اُس کے ساتھ ایک اٹھارہ انیس سال کا نوجوان بھی تھا۔ پارکر نے اُس کی طرف اشارہ کرتے کہا:

''یہ اسی جنگل کا باشندہ ہے کیڈی۔ باہر کی دنیا دیکھنے کے اشتیاق میں گھر سے بھاگ نکلا مگر اب یہ واپس اپنے قبیلے میں لوٹ جانا چاہتا ہے اور کوئی اسے ساتھ لے جانے کو تیار نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو اس کی مدد کر سکتے ہیں۔ اس کا ساتھ آپ کے لیے بھی مفید ثابت ہوگا۔''

دونوں نے غور سے اُسے دیکھا۔ دُبلا پتلا، درمیانہ قد، سانولی رنگت، گھنگریالے سیاہ بالوں والا لڑکا بڑی اُمید سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ چہرے کی مایوسی اُس کی بے بسی کا اعلان کر رہی تھی۔ اُن کی سرکی جنبش اور مسکراہٹ سے نوجوان کے چہرے پر ہنسی کِھل اٹھی۔

بڑے تپاک سے آگے بڑھا اور اُن کا سامان اٹھا کر ہیلی کاپٹر کی جانب بڑھ گیا۔

تیس منٹ کے سفر کے بعد ہیلی کاپٹر نے انہیں جنگل کے بیچ میدان میں اُتار دیا۔ انہیں اترتا دیکھ کر قریب کھیتوں میں کام کرتے قبائلی بچے اور نوجوان اُن کی جانب بھاگے چلے آئے۔ چہرے پر حیرت اور معصوم مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ سامان اُترتا دیکھ کر نوجوان اُن کی مدد کے لیے آئے۔ کارسن اور اولور نے سب سے ہاتھ ملایا اور نام پوچھے۔ کچھ نے بتا دئے کچھ شرما کر مسکرا دیئے اور کچھ گھبرا کر بھاگ گئے۔ دو قبائلی نوجوان پارکر سے بات کر رہے تھے۔ پارکر انہیں اُن کے پاس لے کر آیا اور بتایا:

''یہ لانسا اور ہنروی ہیں۔ پورے سفر میں یہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔ یہ نہ صرف راستہ دکھائیں گے بلکہ سب کی حفاظت بھی کریں گے اور سامان بھی اٹھائیں گے۔''

لمبا قد، کسا ہوفولادی جسم، تانبے جیسی رنگت دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے آگ میں سونا تپا ہو۔ آنکھوں اور بالوں کا رنگ گہرا کالا، گلے میں سؤر کے دانتوں سے بنے لمبے ہار لٹک رہے تھے اور کمر پر ڈوری سے بندھی کٹار کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ لانسا اور ہنروی سامان اٹھا کر آگے آگے چلتے راستہ بنا رہے تھے اور کیڈی بھی سامان اٹھائے اُن کے پیچھے تھا۔ سفر کے شروع میں ہی کیڈی کو اُن لوگوں سے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے بابا اُس سے ملنے کو تڑپ رہے ہیں۔ دو مرتبہ وہ غصّے اور بے بسی میں اپنا گھر جلا چکے ہیں۔ یہ سُن کر اُس کی بے چینی اور بڑھ گئی تھی۔

گھنے درختوں کے بیچ بنی کچی پگڈنڈی پر چلتے پیڑوں سے پانی ٹپ ٹپ ٹپک رہا تھا۔ پرندوں کی مختلف آوازیں (Reptiles) خزندوں کی سرسراہٹ، ہواؤں کا سنگیت، ہوا کی تازگی اور نمی انہیں احساس دلا رہی تھی کہ وہ مشینی دنیا کو بہت پیچھے

> جنگل کے بیچ سے نکلتی ندی کا راستہ سیدھا نہیں تھا۔ ندی کے دونوں طرف گھنا جنگل اور جنگل میں بسے کبھی کوئی قبائلی یا کوئی جانور نظر آ جاتا۔ ندی میں کچھ عورتیں اور بچے نہا رہے تھے۔ کشتی کو اس طرف آتے دیکھا تو سب ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔

چھوڑ کر ایک نئی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔ کچھ دیر ان راستوں پر چلنے کے بعد گھنے درختوں کے جھنڈ سے نکلے تو سامنے ندی نظر آئی۔ لانسا پیڑ سے بندھی کشتی کو کھینچ کر لے آیا۔ سب کے سوار ہوتے ہی کشتی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ پانی گہرا اور بہاؤ تیز تھا۔ آسمان پر گھنے بادل چھائے تھے۔ بارش شروع ہونے سے پہلے یہ سفر طے کرنے کی کوشش میں وہ ہاتھ تیز تیز چلا رہے تھے۔ رنگ برنگی، چھوٹی بڑی مچھلیوں کے علاوہ قریب ہی مگر مچھ بھی تیرتے نظر آئے۔ دونوں قبائلی محتاط تھے اور بڑی پھرتی اور ہوشیاری سے راستہ بدل کر مگر مچھ سے بچاتے ہوئے کشتی کو آگے نکال لے گئے۔ پار کر راستے میں اُس جگہ کے بارے تفصیل سے بتانے لگا:

''یہ جنگل کئی اسرار چھپائے ہوئے ہے۔ چیونٹی، سانپ، بچھو بھاری تعداد میں ملیں گے تو ستر فٹ کا اینا کونڈا اور پچھتر فٹ بڑا اجگر انسانی قد سے بڑی مکڑی اس کے اندرونی حصے میں موجود ہیں۔ اس گھنے حصّے میں کوئی بھی جانے کی ہمت نہیں جُٹا تا۔ وہاں کے درخت اتنے بڑے اور گھنے ہیں کہ اُن کو آدم خور درخت بھی کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں وہاں ایسی مخلوق پائی جاتی ہے جس کا آدھا جسم ریچھ اور آدھا انسان کا ہے۔ وہاں سے صحیح سلامت بچ کر نکلنا کسی معجزے سے کم نہیں۔''

جنگل کے بیچ سے نکلتی ندی کا راستہ سیدھا نہیں تھا۔ ندی کے دونوں طرف گھنا جنگل اور جنگل میں بسے کبھی کوئی قبائلی یا کوئی جانور نظر آ جاتا۔ ندی میں کچھ عورتیں اور بچے نہا رہے تھے۔ کشتی کو اس طرف آتے دیکھا تو سب ایک جگہ اکٹھے ہو گئے۔ بچوں نے مخصوص آواز نکالی اور اُسی وقت نہ جانے کدھر سے چار پانچ قبائلی بھالے اٹھائے وہاں پہنچ گئے۔

کیڈی نے بتایا کہ اجنبی لوگوں کو دیکھ کر انہیں خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ کیڈی نے اونچی آواز میں اپنی زبان میں آنے کا مقصد

بتایا اور انہیں بے خوف ہونے کو کہا۔ کشتی کو دوسری جانب سے آگے کی طرف لے گئے۔

پارکر نے بتایا کہ جنگل میں سو سے زیادہ ندیاں بہتی ہیں جو بڑی ندی میں جا کر ملتی ہیں۔ تیس ہزار سے زیادہ قسم کی مچھلیاں ان ندیوں میں موجود ہیں۔ ایک ندی کو اُبلتی ندی کے نام سے جانا جاتا ہے اُس کا پانی ہمیشہ اُبلتا کھولتا رہتا ہے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد آخر ندی کے ایک کنارے جا کر کشتی رُک گئی۔ تھوڑا چلنے کے بعد ڈھلان اُتر کر آٹھ دس جھونپڑیوں کا ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آیا۔ اُس کے کچھ فاصلے پر بڑا سا خیمہ بنا تھا جدھر اُن کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ دن ڈھلنے کی تیاری میں تھا۔ سفر کی تھکان سے جسم ٹوٹ رہا تھا۔ کچھ دیر ستانے کے بعد دونوں تروتازہ ہو گئے۔

رات کو خیمے کے باہر آگ جلا کر وہیں کھانا پکایا گیا۔ کھانے کا کافی سامان وہ ساتھ لے کر آئے تھے۔ تازہ مچھلی کو بھون کر اُس کا سالن بنا کر چاول کے ساتھ کیلے کے پتوں پر رکھ کر سب نے ایک ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد جڑی بوٹیوں سے تیار کیا قہوہ قبائلیوں نے انہیں پیش کیا جسے پیتے ہی دن بھر کی تھکان دُور ہو گئی۔ وہ رات اُن کی جنگل میں پہلی رات تھی۔

ہنروی اور لانسا خیمے کے باہر چوکسی کرتے رہے۔ رات بھر آگ جلتی رہی۔ جنگلی جانور آگ کے قریب آنے کی ہمت نہیں کرتے۔ نہ جانے تھکن کا اثر تھا یا قہوے کا دونوں صبح دیر تک گہری نیند سوتے رہے۔

سارا سامان باندھ کر اگلی صبح پھر سفر شروع ہو گیا۔ ہنروی اور لانسا آگے چلتے راستے کی رکاوٹ دُور کرتے جاتے۔ کوئی خطرناک کیڑے مکوڑے، سانپ، جھاڑیاں جو بھی راستے میں آتا ہٹاتے جاتے۔ اُن کے لیے راستہ بناتے جاتے۔ ایک جگہ گیلی مٹی کا گہرا گارا تھا جسے پار کرنے کے لیے دونوں نے جھٹ سے کٹار اور تلوار نکال کر پیڑ کی لکڑی

راستے میں پہلی بار انہوں نے ہزاروں کی تعداد میں رنگ برنگے خوبصورت چہچہاتے طوطے دیکھے تو چلتے چلتے اُن کے قدم بے ساختہ رُک گئے۔ اُن کی چہچہاہٹ ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے فضا میں نغمے گونج رہے ہوں اور پیڑوں کی شاخیں اُن نغموں کو سن کر رقص میں محو ہوں۔

کاٹ کر شہتیر راستے میں بچھا دی تاکہ اس پر چڑھ کر راستہ پار کیا جائے۔ کیڈی تو سامان اُٹھا کر بھاگتا ہوا راستہ پار کر گیا مگر شہری لوگوں کو اس کی عادت کہاں؟ اولور دو قدم چلا کہ پاؤں پھسل گیا اور وہ گارے میں جا گرا۔ پارکر نے پھرتی سے بڑھ کر اسے سہارا دے کر اُٹھایا اور ہاتھ پکڑ کر راستہ پار کرایا۔ کیچڑ میں لت پت اُسے دیکھ کر سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پہلی بار ہنروی اور لانسا کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنے کو ملی۔ اتنے گھنٹے ساتھ رہنے کے بعد اُن کے چہروں سے تناؤ کی لکیریں مٹ گئیں تھیں۔ کارسن کو بھی اس جوکھم سے بچانے کے لیے کیڈی نے ہاتھ پکڑ کر راستہ پار کرایا۔ آگے چل کر جیسے ہی ندی نظر آئی جو اُنہیں پانی میں چل کر پار کرنی تھی، اُس میں جاتے ہی کیچڑ سے لت پت اولور کے کپڑے دھل گئے۔ دونوں قبائلیوں نے دونوں کا ہاتھ پکڑ کر ندی پار کروائی۔

کیڈی کا گھر راستے میں تھا۔ صبح سے وہ اپنے گھر والوں سے ملنے کو بے چین ہو رہا تھا۔ دو سال پہلے جب اُس کی ماں اچانک چل بسی تھی وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر پایا تھا اور وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔ یہاں اکثر لوگ کم عمری میں ہی چل بستے ہیں۔ بیماروں کا کوئی علاج نہ ہونے کی وجہ سے یہاں کی شرح اموات بہت زیادہ ہے۔

کبھی گھنے درختوں سے گزرتے ہوئے، کبھی کمر تک پانی میں ڈوب کر نالہ پار کیا تو کبھی کشتی میں سوار ہو کر۔ جدھر تھکن محسوس ہوئی وہاں دم لینے کو رُک گئے۔ اس تمام سفر کے دوران پارکر اور کیڈی اُنہیں قبائلی زندگی کی معلومات دیتے رہے۔

راستے میں پہلی بار انہوں نے ہزاروں کی تعداد میں رنگ برنگے خوبصورت چہچہاتے طوطے دیکھے تو چلتے چلتے اُن کے قدم بے ساختہ رُک گئے۔ اُن کی چہچہاہٹ ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے فضا میں نغمے گونج رہے ہوں اور پیڑوں کی شاخیں اُن نغموں کو سن کر قید رقص میں محو ہوں۔ وہ خوبصورت منظر کیمرے

ہو گیا اور اُن لمحوں کا احساس ذہن و دل میں محفوظ ہو گیا۔

جیسے جیسے کیڈی کا گھر قریب آ رہا تھا اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ رہی تھی۔ دُور سے ہی اپنے گھر پر نظر پڑتے وہ خوشی سے چلا اُٹھا۔ جنگل کے بیچ زمین سے دس فٹ اوپر بانس گاڑ کر اُس کے اوپر گھاس پھوس سے بنا گھر (Tree House) اُسی کا تھا۔ اس نے گلے سے مخصوص آواز نکالی جسے سُنتے ہی قبائیلوں کا جھُنڈ اُن کی طرف بھاگتا ہوا نظر آیا۔ مرد، عورتیں، بچے سب اُس سے گلے لگ کر ایسے مل رہے تھے جیسے صدیوں کا انتظار اچانک ختم ہوا ہو۔ جس انداز سے اُس کے بابا اُسے ملے تھے بنا بتائے پتا چل گیا تھا کہ باپ بیٹا مل رہے ہیں۔ عمر اُس کی شاید چالیس کے قریب ہو گی مگر لگتا وہ پچاس سے اوپر کا تھا۔ کیڈی کے بتانے پر وہ اُن لوگوں سے ایسے جھک کر ملا جیسے پرستش کر رہا ہو۔ خوشی سے اُس کا وجود لرز رہا تھا اور آنکھیں بہہ رہی تھیں۔

بچے اُنہیں حیرت سے ہاتھ لگا لگا کر دیکھ رہے تھے۔ عورتوں کے چہرے تعجب سے کھُلے تھے۔ چہروں پر رنگ لگے تھے، گلے میں لمبے لمبے ہار ڈالے، بازوؤں اور جسم کے کئی حصوں پر ٹیٹو (Tatoo) بنے تھے۔ عورتوں کے جسم پر کمرے کے نیچے چھوٹا سا کپڑا بندھا تھا۔ جوان عورتوں کے جسم گندمی اور کسے ہوئے تھے جبکہ ادھیڑ عمر کی عورتوں کی جلد لٹکی ہوئی تھی۔ بچے اور مردوں کے جسموں پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ صرف گلے میں ہار اور کمر پر ڈوری سے کٹار بندھی تھی۔ کیڈی نے بتایا تھا کہ یہ ٹیٹو ہر قبیلے کی اپنی پہچان ہے۔

تھوڑی دیر میں بھیڑ چھٹ گئی اور وہ سب کیڈی کے بانس پر بنے گھر میں داخل ہو گئے۔ بڑا سا ہال کمرا جس کے ایک طرف گھر کے مرد اور دوسری طرف خواتین رہتی ہیں۔ اُس گھر میں مرد، عورتیں اور بچوں کو ملا کر سترہ افراد رہتے ہیں۔ دیواروں پر بھالے،

> جس انداز سے اُس کے بابا اُسے ملے تھے بنا بتائے پتا چل گیا تھا کہ باپ بیٹا مل رہے ہیں۔ عمر اُس کی شاید چالیس کے قریب ہو گی مگر لگتا وہ پچاس سے اوپر کا تھا۔ کیڈی کے بتانے پر وہ اُن لوگوں سے ایسے جھک کر ملا جیسے پرستش کر رہا ہو۔ خوشی سے اُس کا وجود لرز رہا تھا اور آنکھیں بہہ رہی تھیں۔

تیر، کمان، تلواریں، سؤر کے دانتوں کے بنے لمبے لمبے ہار، انسانوں کی کچھ ہڈیاں اور آٹھ کے قریب کھوپڑیاں وہاں پر نظر آئیں۔

کیڈی کے کپڑوں کو سب ہاتھ لگا لگا کر دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے قبائلی کپڑے پہنے شخص کو دیکھ کر سوچتے تھے کہ ان کے جسم کا لباس ہی اُن کی جلد ہے۔

لانسا سے کہہ کر انہوں نے اپنے سامان سے کھانے پینے کا سامان نکال کر اُن لوگوں کو تحفے میں دیا تو خوشی سے اُن کے چہرے چمک اُٹھے۔ کچھ گھنٹے ساتھ گزارنے کے بعد اجنبیت کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ جو بچے اور عورتیں پہلے جھجک رہی تھیں اب بڑی اپنائیت سے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔ ان سے اپنی زبان میں باتیں کرتی رہیں جس کا ترجمہ پارکر اور کیڈی کرتے رہے۔

کارسن نے جب کھوپڑیوں کے بارے پوچھا تو کیڈی نے اپنے بابا کا جواب ترجمہ کرتے ہوئے بتایا:

''یہ ہمارے خاندان کا اثاثہ ہیں''

''کس کی ہیں؟''

''جن کی''

''جِن یا انسان؟''

''ہم انسان کو نہیں مارتے جِن کو مارتے ہیں۔''

''مگر کھوپڑیاں تو یہ انسانوں کی ہیں یہ جِن کی کیسے ہو سکتی ہیں؟''

اس کے سوال پر دیر تک خاموشی چھائی رہی پھر انہوں نے بات کا موضوع بدل دیا جس سے یہ واضح ہو گیا کہ وہ مزید بات نہیں کرنا چاہتے۔

اُس رات کھانا گھر کے مردوں نے بنایا۔ بھونی ہوئی مچھلی اور سؤر کا میٹ انہیں پیش کیا گیا۔ میٹ کھانے سے پہلے انہوں نے پارکر سے پوچھ لیا تھا کہ یہ میٹ کس کا ہے ورنہ کھوپڑیاں دیکھ کر انہیں کھٹکا لگا تھا۔ کیلے کے پتوں پر سب نے مل کر کھانا کھایا۔ کیڈی کے بابا ہنس کر بولے:

''آپ تو ہمارے جیسے انسان نکلے ہم تو سوچتے تھے گوری اور بھوری چمڑی

والے جن ہوتے ہیں۔''

جنگل میں شام کو ہی رات ہو جاتی ہے اور لوگ رات کو گھروں سے باہر نہیں نکلتے۔ رات دیر تک کیڈی کے گھر کے لوگ انہیں گھیرے رہے۔ زندگی میں یہ اُن کا پہلا موقع تھا جب جن سمجھنے والے انسانوں کے ساتھ وہ ہنس کھیل رہے تھے۔ رات کی خاموشی میں باہر سے سائیں سائیں ہوا کے تیز چلنے کی آوازیں آتی رہیں۔ دور سے کبھی ہاتھی کی چنگھاڑ تو کبھی شیر کی دہاڑ، کبھی لومڑی کی آوازیں تو کبھی چمگادڑوں کا شور سنائی دیتا رہا۔ اس شور میں کب نیند آ گئی انہیں پتا ہی نہ چلا۔

گھر پر رُکنے کے بجائے کیڈی نے ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

''آپ جب تک یہاں ہیں میں ساتھ رہوں گا۔''

جانے سے پہلے اُس نے بابا کو یقین دلا دیا تھا کہ دو تین روز میں واپس لوٹ آئے گا۔

سب سے الوداع کہہ کر صبح سویرے ہی وہ اگلے سفر کے لیے روانہ ہو گئے۔ یگولفا گاؤں میں ایک بڑا قبیلہ رہتا ہے جو کوروری قبیلے کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس قبیلے کے سردار سے پارکر نے ملاقات پہلے ہی طے کر لی تھی۔ سردار نے انہیں یہاں آنے کی اجازت خاصی رقم وصول کرنے کے بعد دی تھی۔ حالانکہ یہ پیسے ان کے کسی کام کے نہیں مگر انہیں پیسے لے کر جمع کرنا طاقت کی نشانی لگتی تھی۔

ابھی ایک گھنٹے کا کشتی سے سفر طے کیا تھا کہ نہ جانے یکدم کہاں سے چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں قبائلیوں نے آ کر انہیں گھیر لیا۔ تیر کمان اور بھالے تان کر کھڑے ہو گئے۔ کیڈی اور پارکر نے کچھ دیر اُن سے بات کی اور وہاں بھی انہیں کھانے پینے کا سامان اور رقم دے کر معاملہ سلجھ گیا۔

''یہ رقم ان کے اُس وقت کام آتی ہے جب کسی قبائلی لڑکی کی شادی دوسرے قبائلی لڑکے سے طے پاتی ہے۔ ابھی تو سامان اور پیسے لے کر انہوں نے جانے دیا مگر یہ ضروری نہیں کہ واپسی پر صحیح سلامت یہاں سے گزرنے دیں۔'' پارکر نے اندیشہ جتایا۔

''یہ رقم ان کے اُس وقت کام آتی ہے جب کسی قبائلی لڑکی کی شادی دوسرے قبائلی لڑکے سے طے پاتی ہے۔ ابھی تو سامان اور پیسے لے کر انہوں نے جانے دیا مگر یہ ضروری نہیں کہ واپسی پر صحیح سلامت یہاں سے گزرنے دیں۔'' پارکر نے اندیشہ جتایا۔

''آپ فکر نہ کرو میں سب سنبھال لوں گا۔'' کیڈی نے گرم جوشی اور پُر اعتماد لہجے کے ساتھ حوصلہ دیا۔

کارسن کو اس سے پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ کس طرح بھیگی بلی کی طرح لگ رہا تھا اور اب دو ہی دن میں اپنے علاقے میں آتے ہی خود اعتمادی لوٹ آئی تھی۔ اپنی گلی میں تو کُتا بھی شیر ہوتا ہے۔

خیمے تک پہنچنے سے پہلے بارش شروع ہو گئی تھی۔ خیمے کے اندر اینٹوں کا چولھا بنا کر چائے اور رات کا کھانا تیار کیا گیا۔ بارش مسلسل ہوتی رہی۔ آگ کے ارد گرد دیر تک بیٹھے وہ باتیں کرتے رہے۔ کارسن نے کیڈی سے پوچھا۔

''تم نے کبھی جن کو مارا ہے؟''

''میں نے؟ نہیں البتہ بابا نے ضرور مارا ہے''

''جن کو مار کر کیا کرتے ہو؟''

''پکا کر کھاتے ہیں۔''

''تم نے جن کھایا ہے؟'' اس نے حیرت سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا۔

''صرف میں نے ہی نہیں بلکہ جنگل کے ہر قبائلی نے کبھی نہ کبھی جن ضرور کھایا ہے بالکل سؤر کے میٹ جیسا لذیذ ہوتا ہے۔''

اُس نے لانسا اور ہنروی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''انہوں نے بھی کھایا ہے؟''

کیڈی نے ان سے پوچھا تو دونوں نے مسکرا کر ہاں میں جواب دیا۔

کارسن اور اولور نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

اُس رات جم کر بارش ہوئی۔ خیمے کے اندر بھی پانی برسنے لگا۔ آگ بھی بجھ چکی تھی اور موسم سرد ہو گیا تھا۔ اولور اور پارکر

گہری نیند سو رہے تھے اور کارسن کی آنکھوں سے نیند غائب ہو چکی تھی۔ کیڈی نے جب بے چینی سے اُسے کبھی کروٹیں بدلتے اور اٹھ کر بیٹھتے دیکھا تو وہ اس کے سلیپنگ بیگ میں اُس کے ساتھ آ کر لیٹ گیا اور اسے اپنے جسم کی گرمی سے راحت دینے کی کوشش کی۔ جسم میں گرمی آتے ہی نیند نے بھی اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اُس وقت وہ بھول گیا کہ وہ ایک آدم خور سے لپٹ کر سو رہا ہے۔

صبح بادل چھٹ گئے تھے اور سورج پورے آب و تاب کے ساتھ اپنے جلوے بکھیر رہا تھا۔ ہر چیز تر و تازہ تھی۔ دوپہر تک وہ سب قبائلی سردار کے پاس پہنچ گئے تھے۔ وہاں بھی وہ ہی منظر درپیش آیا جو کیڈی کے گاؤں میں تھا۔ انہیں دیکھنے کو بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ وہی خوف، وہی حیرانی پھر دھیمے دھیمے یہ مسکراہٹ بھی کھلکھلاہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ سردار کے حکم سے بچے، عورتیں، نوجوان سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے اور چند قبائلی اُن کے پاس بیٹھ گئے۔ کھانے پینے کا دور چلتا رہا اور ساتھ میں باتیں ہوتی رہیں۔ انہیں بھی باہر کی دنیا کو جاننے کا اُتنا ہی تجسس تھا جتنا انہیں قبائلی زندگی جاننے کا۔ باتوں کے دوران سردار نے بتایا کہ:

''جن کو کھانے کی روایت بہت پرانی ہے۔ حالانکہ یہ اب بہت کم ہو گئی ہے۔ مگر آج بھی رائج ہے۔''

''آپ کو جن کا پتا کیسے چلتا ہے؟''

''جن کوئی ہمارا دشمن یا قریبی دوست بھی ہو سکتا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''جس شخص کو جن اندر ہی اندر سے کھوکھلا کرنے لگتا ہے یہ اُس شخص کو معلوم ہو جاتا ہے اور وہ گھر والوں کو اُس کا نام پتا بتا دیتا ہے۔ بدلا لینا ہر قبائلی کا فرض ہے۔ ہم کبھی معاف نہیں کرتے اور اس طرح اس کی موت یقینی ہو جاتی ہے۔''

''آپ اُسے کیسے مارتے ہیں؟''

''اس جن کو درخت سے باندھ

اگلی صبح روانگی سے پہلے قبیلے کے بچے، عورتیں اور نوجوان سب اُن سے ملنے آئے۔ عورتیں اُن کے لیے تازہ مچھلی، ہرے مینڈک، مکڑیاں، کیکڑے جنگل سے شکار کر کے بطور تحفہ دینے ساتھ لائی تھیں۔ اُن کے چہرے ایسے اُداس تھے جیسے بہت قریبی رشتے دار جُدا ہو رہا ہو۔

دیتے ہیں۔ کمان سے اُسے چھلنی کرتے ہیں بے شک وہ روئے، چلّائے، گڑگڑائے مگر ہم اپنا کام کرتے جاتے ہیں۔ کلہاڑی سے اُس کی کھوپڑی توڑ کر دماغ نکال لیتے ہیں۔ جسم کے ایک ایک حصے کے ٹکڑے کر کے اُسے کیلے کے پتے میں لپیٹ دیتے ہیں پھر اُسے لوگوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ کھوپڑی اُس شخص کے پاس رہتی ہے جس نے جن کو مارا ہوتا ہے۔ اُس کی بوٹیاں اُسی طرح پکاتے ہیں جس طرح سؤر کا ماس پکاتے ہیں۔ دماغ سب سے زیادہ خوشی سے کھایا جاتا ہے۔''

''جن کے علاوہ کیا قبائلی مردہ بھی کھاتے ہیں؟''

''میں نے کہا نا، ہم انسان کو نہیں کھاتے صرف جن کھاتے ہیں'' اُس کا لہجہ بڑا تند تھا اس لیے اولور نے اُسے مزید اس موضوع پر گفتگو نہ کرنے کا اشارہ کر دیا۔

اُس رات وہ سو نہیں پائے تھے اور دیر تک اُن لوگوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔

اگلی صبح روانگی سے پہلے قبیلے کے بچے، عورتیں اور نوجوان سب اُن سے ملنے آئے۔ عورتیں اُن کے لیے تازہ مچھلی، ہرے مینڈک، مکڑیاں، کیکڑے جنگل سے شکار کر کے بطور تحفہ دینے ساتھ لائی تھیں۔ اُن کے چہرے ایسے اُداس تھے جیسے بہت قریبی رشتے دار جُدا ہو رہا ہو۔ اُن کی معصومیت اور اپنائیت کا تحفہ دل میں سمیٹے انہیں الوداع کہہ کر وہاں سے چلے آئے۔

واپسی کا راستہ ہمیشہ آسان ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ اب وہ راستوں اور ماحول سے آشنا ہو چکے تھے۔ واپسی کے تین دن کے سفر کے بعد وہ ہیلی کاپٹر تک پہنچے۔ کیڈی انہیں لانسا اور ہنروی کے ساتھ ہیلی کاپٹر تک چھوڑنے آیا۔ جتنا سامان اُن کے پاس تھا وہ سب ان میں بانٹ دیا تھا۔ اُن کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا کیونکہ ان کے ساتھ اور راہ نمائی کے بنا یہ تجربہ ممکن ہی نہیں تھا۔ ایک وقت پر تو انہیں لگا تھا کہ شاید اب وہ اس جنگل سے کبھی

زندہ لوٹ کر واپس نہیں جا سکیں گے مگر اُن کے ساتھیوں نے اُن کے راستے کی ہر مشکل آسان کر دی تھی۔ بچھڑتے وقت کیڈی تو لپٹ کر بچوں کی طرح رو پڑا تھا۔ لانسا اور ہنروی رنجیدہ ضرور تھے مگر وہ اپنائیت سے مسکرا رہے تھے۔

ایوا کی بھیجی تصویر نے ان آٹھ دنوں کی یادیں تازہ کر دی تھیں۔ سارا دن کارسن کا بے چینی میں گزرا۔

شام کو ساحل پر کارسن مقررہ وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ ایوا نے اسے کیفیٹر یا میں منتظر پایا تو اُس کا وجود کِھل اٹھا۔ کافی کی چسکیاں لیتے کارسن مدعی پر آ گیا۔

''بہت سی الجھنیں ہیں جو سارا دن دل و دماغ کو پریشان کرتی رہیں''

''بات تو پریشانی کی ہے۔ مجھے لگتا ہے تمہیں اپنے تھیسس پر دوبارہ سے نظر ثانی کرنی پڑے گی کیونکہ جو ثبوت میرے پاس ہیں وہ کہیں نہ کہیں تمہارے تجربے سے مختلف ہیں۔''

''تم بتاؤ کیا جانتی ہو میں سُن رہا ہوں۔''

''تم جانتے ہو جب سے امیزون کے جنگلات میں تیل اور گیس کا ذخیرہ ہاتھ لگا ہے اُس پر حق جمانے کے لیے کیا کچھ نہیں ہو رہا۔ اُس کام میں سب سے بڑی رکاوٹ وہاں کے قبائلیوں کی ہے جو کام مکمل نہیں ہونے دیتے، موقع ملتے ہی وہاں موجود لوگوں کو ختم کر دیتے ہیں۔ یورپی کمپنی ہار ماننا نہیں چاہتی لہٰذا انہوں نے بڑے ہتھکنڈے اپنائے مگر کامیابی نہیں ملی۔

آخر میں وہ قبیلے کے لوگوں کو اپنی مٹھی میں کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

''وہ کیسے؟''

''آدم خور قبیلے کو ٹرک بھر بھر کر اُن کی خوراک بھیجی جا رہی ہے جس کے عوض میں وہ کام میں رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔''

''کیا مطلب؟ یہ سب مردے آئے کہاں سے؟'' اس نے پریشان ہو کر حیرت سے پوچھا۔

سورج سمندر میں ڈوبنے کو بے تاب نظر آ رہا تھا اور کارسن کو آسمان پر بکھری سورج کی لالی میں لوگوں کے لہو کا رنگ نظر آنے لگا۔ سمندر میں سورج چھپ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شام کے دھندلکے چاروں طرے پھیلنے لگے۔ آج اُسے یہ منظر سرشار نہ کر سکا۔

''پہلے گینگ وار۔۔۔ جب اس سے کام نہ بنا تو عالمی ادارہ صحت کے ساتھ ساز باز۔۔۔!''

''مگر قبائلی لوگ جِن کھاتے ہیں مردے نہیں؟''

''جِن زندہ تو نہیں کھاتے؟ مردہ ہی کھاتے ہیں نا؟''

''ہاں'' باؤلے کی طرح وہ اس کا منہ تک رہا تھا۔

''اس کے پیچھے بھی ایک سازش ہے۔''

''وہ کیا؟''

''قبائلیوں کا دھیرے دھیرے صفایا کر دیا جائے، انہیں بیمار خطرناک جراثیم والے مُردے کِھلا کر'' ایوا نے اس کے کان کے پاس آ کر سرگوشی کی۔

وہ حیرت سے اُسے دیکھتا رہا، ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکلا۔

''جانتے ہو نہ آئے دن وہاں آگ لگ جاتی ہے۔ چالیس ہزار بار امیزون کے جنگل آگ کی چپیٹ میں آ چکے ہیں۔ کتنے جانور کتنے انسان مرے کوئی اندازہ نہیں۔''

''یہ سب پیسے اور طاقت کی خاطر ہو رہا ہے؟ معصوم لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں۔'' افسردہ لہجے میں کارسن نے کہا۔

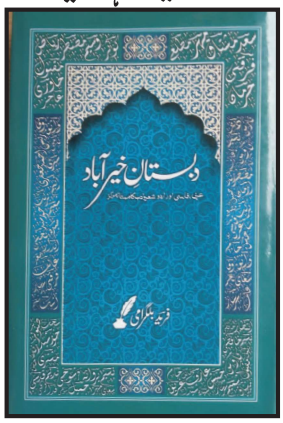
''نئی دنیا کی تخلیق ہونے والی ہے۔ تم دیکھتے جانا'' ایوا نے پھر سرگوشی کی۔

سورج سمندر میں ڈوبنے کو بے تاب نظر آ رہا تھا اور کارسن کو آسمان پر بکھری سورج کی لالی میں لوگوں کے لہو کا رنگ نظر آنے لگا۔ سمندر میں سورج چھپ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شام کے دھندلکے چاروں طرے پھیلنے لگے۔ آج اُسے یہ منظر سرشار نہ کر سکا۔ یہ بڑھتا اندھیرا اخلاقی قدروں اور انسانیت کو نگلتا محسوس ہوا اور منہ زور طاقتیں، مفاد پرست حکمران اور نئی دنیا کے تعمیر کردہ قبائلیوں سے بھی بڑے آدم خور نظر آنے لگے۔

☆☆☆

تبصرہ

عربی کے جید عالم اور عظیم مجاہد آزادی علامہ فضل حق کے وطن خیرآباد سے تو ایک زمانہ واقف ہے۔ لیکن وہاں کی علمی و ادبی تاریخ کو محفوظ کرنے کا سہرہ فرید بلگرامی کے سر جاتا ہے۔ آپ نے قصبے کے 600 سالہ علمی و ادبی ورثے کو دبستان خیرآباد کی شکل میں محفوظ کر کے اپنی صلاحیتوں کا سکہ جما دیا ہے۔ تصنیف میں عربی، فارسی اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں کی 270 سے زیادہ صاحب قلم شخصیتوں کا احاطہ کیا گیا جس میں خواتین بھی شامل ہیں۔ یہ تذکرہ 15 ویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر زمانے حال پر ختم ہوتا ہے۔ فرید بلگرامی نے دبستان خیرآباد میں جہاں قصبے کی نامور ہستیوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے وہیں دوسرے تمام شعراء اور ادباء کی موجودگی کو کتاب کا حصہ بنانے میں کوتاہی نہیں برتی ہے۔ واضح ہو کہ دبستان شمس العلماء عبدالحق، حرماں خیرآبادی بہاری لال خاوری، ریاض خیرآبادی خیرآبادی، جانثار اختر، جاوید اختر وغیرہ



نام کتاب	:	دبستان خیرآباد
مصنف و ناقد	:	فرید بلگرامی
صفحات	:	406
قیمت	:	250
مبصر	:	ڈاکٹر سلیم احمد

دبستان خیرآباد کی ایک اہم بات متوازن شاعر اور لکھنؤ سے شائع ہونے ادبی مشیر رفعت عزمی اور ان کے تقریبا جن میں مضطر خیرآبادی، برتر خیرآبادی، کا نام خاصی شہرت رکھتے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ اسے ایک مخزن کا درجہ خیرآباد میں علامہ فضل امام، علامہ فضل حق رئیس احمد جعفری، دوار کا پرساد افق، منشی مضطر خیرآبادی، وسیم خیرآبادی، کوثر کا ذکر ان کی شان کے مطابق کیا گیا ہے۔ یہ بھی ہے کہ اس میں جدید لب ولہجہ کے والے سہ ماہی جریدے 'ادبی نشیمن' کے 40 نہالی عزیزوں کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ نشتر خیرآبادی، جانثار اختر اور جاوید اختر

فرید بلگرامی کے اس دستاویزی سوغات کی پذیرائی کا فریضہ علم و ادب سے شغف رکھنے والے ہر فرد پر واجب ہے۔ کتاب صوری اور معنوی اعتبار سے عمدہ ہے ـــ قیمت بھی بہت مناسب ہے۔ دبستان خیرآباد کی اشاعت پر مصنف کو مبارک باد پیش کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ وہ اس کے مستحق بھی ہیں۔ یقیناً یہ کتاب دبستان خیرآباد پر ایک تاریخی دستاویز ثابت ہوگی۔

سائنٹفک سوسائٹی پبلک لائبریری

شانتی نگر، مہوابازی، دیوریا (یوپی)

قائم شدہ: 2004ء

مخیّر اور محبانِ اُردو سے ہر طرح کی امداد کی درخواست ہے۔

لائبریری میں تاریخ، جغرافیہ، ادب تنقید، شاعری اور افسانوی ادب پر ڈھائی ہزار کتابیں موجود ہیں۔

فرنیچر کتابیں اور نقد کسی بھی صورت میں امداد قابلِ قبول ہے۔

سائنٹفک سوسائٹی پبلک لائبریری

یونین بینک آف انڈیا مالویہ روڈ، دیوریا

a/c No- 371302010045750 IFSC Code-UBIN0537136

سکریٹری: نصرت ذاکر خزانچی: فخرالدین علی

گزارش

1۔ ادبی نشیمن کے قارئین جن کی خریداری کی مدت ختم ہوگئی ہے برائے کرم وہ اپنا زرسالانہ جمع کردیں؟ مدیر کو اطلاع کردیں۔

2۔ تخلیق کار حضرات اپنے مضمون، افسانے، غزلیں اور نظمیں اپنے میں ٹائپ کرا کر ہی بھیجیں، موبائل سے ٹائپ شدہ تخلیقات پر غور نہیں کیا جائے گا۔

3۔ یوٹیوب پر ادبی نشیمن اردو چینل کی شروعات کی گئی ہے جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ اپنی غزلیں نظمیں، افسانے اور مختصر مضامین یوٹیوب پر اپ لوڈ کرنے کے لئے 9415693119 پر رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ ادبی نشیمن اردو چینل NashemanAdbee پر سرچ کرسکتے ہیں۔

اتر پردیش اردو اکادمی کی اسکیمیں

اردو طلباء کو وظائف ☆ اشاعتِ کتب ☆ صوبے کے رجسٹرڈ عوامی کتب خانوں / دارالمطالعوں کو مالی امداد ☆ اردو اداروں کو مجموعی ادبی خدمات اور اردو کتب پر انعامات ☆ مسودات کی طباعت کے لئے مالی امداد ☆ مصنفین کو ماہانہ مالی امداد ☆ اردو کتابت اسکول ☆ اردو کوچنگ سینٹر ☆ اردو کمپیوٹر سینٹر ☆ اردو کی مطبوعات کی فروخت ☆ سہ ماہی ''اکادمی'' اور ماہنامہ ''خبرنامہ'' کی اشاعت ☆ سیمینار، سمپوزیم اور مشاعروں کا انعقاد ☆ اقلیتی طلباء کو ''سول سروسز'' کی تیاری کے لئے اردو آئی۔اے۔ایس اسٹڈی سینٹر'' اور ماس کمیونیکیشن اینڈ میڈیا سینٹر۔

شعری ادب

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
1۔	اردو کے منتخب گیت	قیصر جہاں	28/=
2۔	انوارِ نظر	نوبت رائے نظر	19/=
3۔	حرفِ مکرر	شمیم مسرور	زیرِ طبع
4۔	دیوانِ ثاقب	ثاقب لکھنوی	62/=
5۔	دیوانِ شیفتہ	محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ	28/=
6۔	دیوانِ غالب (جدید نسخہ حمیدیہ)	منشی محمد انوار الحق	135/=
7۔	روحِ نظر	مخمور اکبر آبادی	96/=
8۔	روشنی کے دریچے	سید احتشام حسین	43/=
9۔	زندگی اے زندگی	خلیل الرحمٰن اعظمی	26/=
10۔	عکسِ گل	شمیم کرمانی	119/=

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
11۔	سریلی بانسری	انور حسین آرزو	31/=
12۔	سفر نا تمام	واثق جونپوری	زیرِ طبع
13۔	مثنوی سحر البیان	میر حسن	108/=
14۔	مثنوی گلزارِ نسیم	دیا شنکر	70/=
15۔	نیا ساز نیا انداز	نازش پرتاپ گڈھی	74/=
16۔	نشاطِ روح	اصغر حسین اصغر گونڈوی	48/=
17۔	کلیاتِ شاد عارفی	منظر حنفی	470/=
18۔	کلیاتِ نعت محسن کاکوروی	نور الحسن	زیرِ طبع
19۔	کلیاتِ ولی	نور الحسن ہاشمی	108/=

مطبوعات۔ابوالکلام آزاد صدی تقریبات / تراجم

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
1۔	الہلال مکمل سیٹ	ابوالکلام آزاد	4200/=
2۔	انتخاب خطباتِ خلافت	محمود الٰہی	47/=
3۔	〃 رسالہ زمانہ	خورشید افسر بسوانی	22/ =

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
1۔	رامائن فراقی (جلد اول)	رائے سدھارتھ بلی فراقی	104/=
2۔	رامائن فراقی (جلد دوم)	رائے سدھارتھ بلی فراقی	48/=
3.	رتناولی (ڈرامہ)	پی۔پیام	8/=

علم و ادب

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
1۔	آبِ حیات	محمد حسین آزاد	زیرِ طبع
2۔	ابرار حسنی گنوری	ڈاکٹر یٰسین علی عثمانی	132/=
3۔	ادب اور سماج	ادب اور سماج	56/ =
4۔	ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ	رشید حسن خاں	زیرِ طبع

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	قیمت
5۔	اردو ادب کی تحریکوں میں گاؤں کا حصہ	منظر اعظمی	175/ =
6۔	اردو تنقید کی تاریخ	مسیح زماں	60/=
7۔	اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	پروفیسر سید محمود الحسن	147/=
8۔	اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر	سید مجاور حسین	59/=

اکادمی کی مطبوعات کی خریداری و دیگر تفصیلات کے لئے رابطہ کریں:

ایس۔رضوان سکریٹری۔اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ۔226010

سیلس ڈپو۔موبائل نمبر:7081007078

Website.wwwupurduakdemiorg E-mail:urduakademi@yahoo.in

Vol: 5Issue 04
Sep- Oct- Nov.2021

Urdu Quarterly
Adbi Nasheman
Lucknow - 226003

Rni No. UPURDU /2017/74845
Per Copy : 25/-
Annaul Subscription : 125/-



رفاہ عام کلب

رفاہ عام کلب کی تاریخی عمارت انجمن ترقی پسند مصنفین کی اولین کانفرنس کے انعقاد کی خاموش گواہ کے طور پر یاد کی جاتی ہے۔اردو کے عظیم افسانہ نگار منشی پریم چند کی زیر صدارت 10 اپریل 1936 کو ترقی پسند مصنفین نے یہاں جمع ہو کر ادب کو بائیں بازو کے نظریات سے واقف کرانے کے لئے ترقی پسند تحریک کو پروان چڑھانے کے ارادے سے اپنے لائحہ عمل کے نفاذ کا آغاز اسی عمارت کے احاطے سے کیا تھا۔

کانفرنس کے روح رواں سجاد ظہیر نے ہندوستانی ادب خصوصاً اردو ادب کو عوام کے مفاد کا ضامن بنانے اور ادب برائے زندگی کے فلسفے کی پرزور وکالت کی اس کانفرنس میں صاحب طرز ادیب چودھری محمد علی ردولوی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا تھا۔

اتر پردیش کی راجدھانی لکھنؤ کے سٹی ریلوے اسٹیشن کے نزدیک موجود یہ بدحال عمارت نوابی دور میں 1860 کے آس پاس تعمیر کرائی گئی تھی۔تاکہ ہندوستانی باشندے اپنے ذوق کی تسکین کے لئے بلا روک ٹوک یہاں آسکیں۔کیوں کہ اس وقت تک یورپی کلب میں ملکی باشندوں کا داخلہ ممنوع تھا۔

آزادی سے پہلے رفاہ عام کلب قومی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔اسی عمارت کے زیر سایہ 1916 میں تاریخی لکھنؤ پیکٹ پر دستخط کئے گئے تھے۔یہ معاہدہ انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے درمیان ہوا تھا۔15 اکتوبر 1920 کو مہاتما گاندھی نے یہاں ہندو مسلم اتحاد پر ایک پراثر تقریر کی تھی۔26 اپریل 1922 کو یہیں پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار بلبھ بھائی پٹیل نے شہریوں سے سودیشی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے عزم کو دوہراتے ہوئے زیادہ سے زیادہ تعداد میں شمولیت اختیار کرنے کی اپیل کی تھی۔

موجودہ صورتحال یہ ہے کہ ذمہ داران کی عدم توجہی کے سبب غیر قانونی قبضہ، بے شمار گندگی، پرائیوٹ بسوں کا جماؤڑا اور آوارہ مویشیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔جبکہ رفاہ عام کلب کے سامنے تیراہے پر بنے پارک میں نشان میر پر پولیس بوتھ کے قیام سے نشان میر کا وجود بھی مندمل پڑ گیا ہے۔

Printed,Published & Prop. By **AhmadRashiq at Nomani Press, Baroodkhana,Golaganj, Lucknow**
and Published at 544C/168,Almas bagh,Hardoi Road,Lucknow
Editor: Dr. Saleem Ahmad